ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

۲۰

۱ ـ ۲ ، دسمبر

مُرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء:۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ جدید اڈیشن جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ ۳؎ مجلد للعہ
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ع۸/ مجلد ہے
سوشلزم کی بنیادی حقیقت:۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ ۳؎ مجلد للعہ
ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۴ر
۱۹۴۰ء:۔ نبی عربی صلعم:۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرتِ سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید اڈیشن جس میں اخلاقِ نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ ۸عہ
فہمِ قرآن جدید اڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحثِ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے اس موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ عہ مجلد ہے
غلامانِ اسلام:۔ اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید ایڈیشن۔ قیمت ۸ہ مجلد ہے
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد ضروری اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین بنایا گیا ہے۔ قیمت ۸ہ مجلد ۸عہ
۱۹۴۱ء:۔ قصص القرآن حصہ اول:۔ جدید اڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک ۸ہ مجلد ۸عہ
وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ عا مجلد ہے
بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے جدید اڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اضافے کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور ۱۹۴۷ء تک کی تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپے۔
تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن دو روپے
۱۹۴۲ء قصص القرآن حصہ دوم: حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک۔ ۳؎ مجلد للعہ
اسلام کا اقتصادی نظام:۔ وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن للعہ مجلد ۸ہ
مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید اڈیشن للعہ مجلد

جلد ششم   شمارہ (۱-۲)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء مطابق ربیع الاول ربیع الآخر ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

*

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا آفتاب ہندستان کے افق پر آزادی کا مژدۂ جانفزا لے کر طلوع ہوا تو ملک کی رگوں میں جو ایک سو سال کی غلامی کے اثر سے مردہ اور بے حس و بے جان ہو گئی تھیں، جوشِ مسرت کا گرم خون دوڑنے لگا۔ ٹھٹھرے ہوئے جسم میں حرارت پیدا ہوئی۔ مردانِ دیوار کی مانند بے روح چشم آرزو میں ولولۂ عزم کی روشنی جھلکنے لگی اس تقریبِ سعید میں گھر گھر خوشی کے گیت گائے گئے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں جشنِ آزادی منانے کے لیے چراغاں ہوا لیکن صد حیف کہ ابھی ان چراغوں کی روشنی مدھم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پنجاب سے ہنگامۂ قتل و غارت گری کی تیز و تند آندھی اس زور شور سے چلی کہ جشنِ مسرت کے چراغ گل ہو کر خفتگانِ عدم کے سرہانے شمعہائے کشتہ کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تڑپتی ہوئی لاشوں اور خون میں لتھڑے انسانی ڈھانچوں کی آہ و بکا اور گریہ و فریاد سے پورا ملک ماتم کدۂ آرزو اور نوحہ زارِ ستم دیدہ بن گیا اور خوشی کے ترانوں نے غم و اندوہ کی درد بھری چیخ و پکار کا روپ دھار لیا نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ لاکھوں غریب و بے گناہ انسان جو اس مصیبتِ عظمیٰ کا شکار ہو کر آزادی کی فضا میں زندگی کا ایک سانس بھی نہیں لے سکے اور مرگِ ناگہانی کی آغوش میں جا سوئے اُن کے ماسوا وہ کروڑوں انسان جو براہِ راست ان حوادث سے محفوظ رہے وہ بھی بصد حسرت و یاس یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ اُنسِ قفس
ہے یم برقِ بلا روز آشیاں کے لیے

فرقہ وارانہ منافرت و عداوت کے باعث ملک میں فسادات بہت پہلے سے ہو رہے تھے لیکن اعلانِ آزادی کے بعد پہلے مغربی پنجاب میں اور پھر مشرقی پنجاب میں ان کی رفتار اس درجہ شدید اور تیز ہو گئی کہ انہوں نے مذہب، اخلاق اور انسانیت کو یکسر تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور پنجاب کے دونوں حصے بجائے انسانوں کے بھیڑیوں درندوں اور خونخوار جانوروں کی بستی نظر آنے لگے۔ دہلی میں بھی فساد کا بڑا اندیشہ تھا لیکن ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ آزاد ہندستان کا دارالسلطنت ہے مرکزی حکومت کے دفاتر یہیں ہیں انڈیا کی فوج کا کمانڈنگ آفیسر کا ہیڈ کوارٹر اسی جگہ ہے اس بنا پر یہاں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی بھی تو حکومت

اس پر فوراً قابو پالے گی اور تباہی و بربادی عام نہ ہو سکے گی، مگر یہ خیال غلط نکلا تباہی یہاں بھی آئی اور اپنی ایسی ہولناکیوں کے ساتھ آئی جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

یوں تو دہلی اور نئی دہلی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس فساد کی زد میں نہ آگیا ہو لیکن یکم ستمبر ۴۷ء سے ۱۰ ستمبر تک وحشت و بربریت نے اپنی تمام ہولناکیوں اور ستم سامانیوں کے ساتھ جن علاقوں میں مظاہرہ کیا وہ دہلی کے مشہور اور وسیع علاقے سبزی منڈی، پہاڑ گنج اور قرول باغ ہیں۔ قرول باغ کا وہ حصہ جس میں ندوۃ المصنفین اور برہان کا دفتر تھا اس کی باری ۸ ستمبر کو آئی۔

اڈیٹر برہان کا مکان جو دفتر برہان سے تھوڑے فاصلہ پر شیدی پورہ میں واقع تھا ۶ ستمبر کو ہی اس طرح لٹ چکا تھا کہ گھر کے سامان کی کوئی چیز بھی نہیں بچ سکی، گھر کے سامان کے علاوہ ذاتی لائبریری جو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی بیش قیمت مطبوعہ کتابوں بعض نادر مخطوطوں اور پرانی اور نئی یادداشتوں پر مشتمل تھی وہ بھی اس ہنگامہ میں اس طرح برباد ہوئی کہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی نہیں بچایا جا سکا اور راقم الحروف اسی ہنگامہ میں بچوں کا ہاتھ پکڑ کر دفتر برہان میں آگیا، یہاں ۷ ستمبر کا دن کشمکش امید و بیم میں گذرا، ۸ ستمبر کی صبح کو اس علاقہ پر بھی حملہ ہوا۔ ہم نے دفتر برہان سے یہاں کے مقامی اور مرکزی حکام و وزرا کو ٹیلیفون پر ٹیلیفون کئے لیکن کوئی امداد نہیں پہنچ سکی آخر جب گلیوں میں مرد عورت اور بچے مرنے اور زخمی ہو کر گرنے لگے تو لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور تین چار گھنٹہ میں محلہ مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا اب ہم لوگ بھی دفتر پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر یہاں سے خالی ہاتھ روانہ ہوئے برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دفتر کے اوپر کی منزل میں رہتے تھے وہ بھی اس وقت اس شان سے ہمارے ساتھ تھے کہ ایک چمڑہ کے تھیلے کے علاوہ جس میں کچھ دفتری کاغذات اور بعض لوگوں کی امانتیں تھیں ہرے بھرے گھر کی کوئی چیز بھی ان کے ساتھ نہ تھی یہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ مع متعلقین کے قریب کے ایک محلہ قصاب پورہ میں آگئے اور تین دن پناہ گزینی کی زندگی گذارنے کے بعد وہاں سے جامع مسجد کے علاقہ میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے رفیق مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی دفتر جمعیۃ علمائے ہند گلی قاسم جان میں مقیم تھے اس لیے وہ براہ راست اس حادثہ اندوہناک تجربہ سے محفوظ رہے لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مصروف شب و روز ایک بیدار مستعد سپاہی کی حیثیت سے اصلاح حال کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مکتبہ جامعہ و بعض طبی ذخیروں کو جو قرول باغ میں محفوظ تھے ۷ ستمبر کو ہی جلا یا جا چکا تھا ہمارے چلے آنے کے بعد اسی دن شب میں مکتبہ برہان کے عظیم الشان گودام کو بھی آگ لگا دی گئی اور اس طرح کم و بیش پونے دو لاکھ کا تجارتی سرمایہ کل کا کل ضائع ہو گیا علاوہ بریں دفتر ندوۃ المصنفین کو لوٹا گیا اس کا تمام قیمتی فرنیچر خورد و برد ہو گیا حسن اتفاق سے لائبریری اور مکتبہ برہان کا ایک بڑا حصہ لوٹ سے بچ گیا تھا جسے اس وقت سرکاری طور پر سر بمہر کرا دیا گیا تھا نومبر کے وسط میں اسی موجودہ مکان میں منتقل کر لیا گیا تجارتی سرمایہ کے برباد ہونے کے بعد ندوۃ المصنفین کی آج تک کی زندگی کو ختم سمجھنا چاہیے، مالی اعتبار سے آج وہ پھر اسی مقام پر ہے جس پر کہ وہ اب سے دس سال پیشتر ۳۸ء میں اپنے آغاز بنا کے وقت تھا۔ یہ صورت حال کوئی شبہ نہیں بڑی حوصلہ فرسا اور ہمت شکن ہے پھر مستقبل کا مطلع بھی ابھی تک غبار آلود ہے تاہم محض خدا کے فضل و کرم کے بھروسہ پر ٹوٹے ہوئے کاموں کے سررشتہ کو پھر سے جوڑنے کی اور ایک منہدم عمارت کو ازسر نو کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے چنانچہ پانچ مہینہ کی غیر حاضری کے بعد آج برہان پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے اور امید ہے کہ حسب سابق پھر پابندی سے حاضر ہوتا رہے گا۔ وعلی اللہ التکلان وھو المستعان

گذشتہ چند مہینوں میں پاکستان اور ہندستان میں جو انسانیت کش مظالم ہوئے ان کی پوری تاریخ جب کوئی غیر جانبدار مؤرخ قلم بند کرے گا تو بتائے گا کہ ان کے اسباب و علل کیا تھے اور نیز یہ کہ ان مظالم نے دونوں مملکتوں میں کیا قیامت برپا کی اور انسانیت کو کس بے دردی سے پامال کیا۔ البتہ جہاں تک مشرقی پنجاب اور دہلی کا تعلق ہے ہم اس سلسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم منسٹر سردار پٹیل سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔

سردار پٹیل مسلمانوں سے بار بار کہتے ہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دیں۔ گذارش یہ ہے کہ کسی فرقہ یا جماعت کی حکومت کے ساتھ وفاداری کا عملی ثبوت یہی ہے کہ اس فرقہ نے بآواز بلند وفاداری کا اعلان کیا ہو اور کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی ہو جو آئین حکومت کے خلاف ہو۔ ہندستان کے مسلمان بلاشبہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ۱۵ اگست کے بعد ہندستان کے کسی گوشہ میں بھی مسلمانوں نے یونین کے ساتھ نا وفاداری کا کوئی عملی ثبوت دیا ہو اب سوال یہ ہے کہ سردار پٹیل جو مسلمانوں سے بار بار وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں انہوں نے اور ان کی حکومت نے ان جماعتوں کے ساتھ کیا کیا جنہوں نے فتنہ و فساد برپا کر کے آئین حکومت کی خلاف ورزی کی پولس اور فوج کے ان ہزاروں ملازموں اور ان ہزاروں سول افسروں کو کیا سزا دی گئی جنہوں نے فتنہ و فساد کی آگ کو اپنی دامن امداد سے ہوا دے کر دوزخ بنا دیا اور اس طرح انہوں نے حکومت کی صاف و صریح اور کھلی ہوئی پالیسی کے خلاف عمل کر کے گویا خود حکومت سے بغاوت کی اور اس کو ہی ختم کرنے کی بلا واسطہ کوشش کی۔ پھر ان ریاستوں کو کیا سرزنش کی گئی جنہوں نے بے گناہ انسانوں کا قتل عام کر کے خود یونین سے غداری کی ہے کیا محض فرقہ وارانہ منافرت کا عذر پیش کر کے کوئی ذمہ دار اور عوام کی نمائندہ حکومت (خواہ وہ پاکستان ہو یا انڈیا) سرکاری نوکروں اور مفسد جماعتوں کی باغیانہ اور غدارانہ حرکات کی باز پرس سے بچ سکتی اور کسی درجہ میں بھی معذور سمجھی جا سکتی ہے؟

تدوینِ حدیث

(۱)

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد

برہان کے "دورِ اول" میں مولانا کا ایک طویل مقالہ "تدوینِ حدیث" کے عنوان سے نکلا تھا۔ زیرِ نظر مقالہ اوس کا ہی تتمہ و تکملہ ہے۔ یہ مقالہ سابق کی طرح جامعۂ عثمانیہ کے ریسرچ جرنل میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس پرچہ کی اشاعت صرف یونیورسٹی کے حلقہ تک محدود ہے۔ اس لیے ہم افادۂ عام کی نیت سے اس کو برہان میں بھی شائع کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جن حضرات کے پاس برہان کے سابق پرچے محفوظ ہیں اس مقالہ کے بعد ان کے پاس "تدوینِ حدیث" ایسے اہم موضوع پر ایک دلچسپ اور نہایت پُر از معلومات کتاب پہونچ جاتی ہے۔ ایڈیٹر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار، ورفتار، سیرت و کردار، عادات و اطوار وغیرہ امور کے متعلق صحابۂ کرام نے اپنے مشاہدات و معلومات کے جس ذخیرے کو امت تک پہونچایا ہے مشہور محدث الحاکم نے اس کی تعبیر جن الفاظ میں کی ہے ہم ذیل میں اُس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں صحابہ کی اس جماعت نے تقریباً بیس سال اور کچھ زیادہ دن مکہ میں پھر مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد گذارے (اس طویل عرصہ میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و گفتار، افعال ورفتار، آپ کی نیند، آپ کی بیداری، آپ کی حرکات آپ کے سکون، نشست و برخاست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مجاہدات اور کوششیں جنگی مہمیں جن میں آپ نے شرکت فرمائی یا صرف صحابہ جن میں شریک تھے، اسی طرح آپ کی خوش طبعیاں، جنہیں اصطلاحاً مزاح کہتے ہیں، لوگوں کی تنبیہ، کھانے پینے

چلنے پھرنے، خاموش رہنے، اپنے ازواج کے ساتھ آپ کے تعلقات، اور معاشرت، اپنے گھوڑے کی تربیت نیز مسلمانوں اور مشرکوں کے نام آپ کے خطوط، ان سے معاہدے، الغرض آپ کی ایک ایک جنبش نگاہ آپ کی ایک ایک سانس آپ کی خصوصی صفات ان ساری خبروں کو ان صحابیوں نے اپنے دماغوں میں محفوظ کیا، اور ان کو یاد رکھنے کی کوشش کی۔ اور یہ سلسلہ اس کے سواہے جو صحابہ کرام تک شریعت کے احکام و قوانین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہنچے، یا عبادات یا حلال و حرام کے سوالات ان ہی صحابیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیے یا اپنے جھگڑوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے فیصلے دربار نبوت سے حاصل کیے (واقعہ یہ ہے) کہ ہم مسلمانوں تک ان ہی صحابیوں کے ذریعہ) پہونچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایسی باتیں مثلاً یہ کہ عام حالات میں آپ رہوار چال کے ساتھ اونٹنی کو چلاتے، لیکن جب کوئی کشادہ وسیع میدان آجاتا تو اس وقت اس کی رفتار کو تیز کر دیتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھی شتر سوار کو اونٹ پر چھوڑ کر خود پیادہ پا چلتے اور یہ کہ ایک بچہ سے خوش طبعی فرماتے ہوئے کہا کہ اے عمیر! تیری چڑیا نغیرا کیا ہوئی، اور اس بڈھی سے یہ فرماتے ہوئے بطور دل لگی آپ نے فرمایا کہ جنت میں بڈھی نہ جائے گی اور حسن بن علی علیہما السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے اور یہ فرماتے ہوئے ران کو آہستہ آہستہ سینہ تک چڑھاتے یعنی) حزق ترق عین بقہ (یہ بچوں کو کھلاتے ہوئے معلوم ہوتا ہے عرب کا قاعدہ تھا جو اس وقت کہتے تھے لفظی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اے کمزور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے والے بچے چڑھ جا چڑھ جا چھوٹے بچے چڑھ جا) اور یہ کہ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند آجاتی تو ناک سے آواز خراٹے بھرنے کی نکلتی تھی (یا اس قسم کی معمولی باتیں) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ایک دفعہ پانی نوش فرمایا (اسی طرح ایک دفعہ دیکھا یہ گیا کہ) کھڑے ہو کر پیشاب سے فارغ ہو رہے ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی ران کے نچلے حصہ میں کوئی زخم ہو گیا تھا، (الغرض) یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں جس کی تفصیل

میں طوالت ہوگی حدیث کی کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عہد نبوت اور عہد صحابہ میں ان گرانمایہ معلومات کی حفاظت جن اعتمادی ذرائع کے سپرد رہی، ان کا تفصیلی ذکر آپ سن چکے اب سوال صرف وقفہ کی [illegible] مدت کی [illegible] رہ جاتا ہے جو صحاح ستہ وغیرہ حدیث کی عام کتابوں کے مصنفین سے پہلے اور عہد صحابہ کے بعد بیچ میں گذری ہے کیونکہ صحاح کی ان کتابوں کے بعد ظاہر ہے کہ ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں متواتر روایتوں کی ہوگئی ہے، مثلاً صحیح بخاری کے متعلق یہ بات کہ محمد بن اسمٰعیل ہی کی تصنیف کی ہوئی ہے یہ ایک ایسا متواتر واقعہ ہے جس میں شک کی گنجائش قطعاً اسی طرح نہیں ہے، جیسے گلستاں بوستاں نامی کتابوں کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شیخ سعدی کی کتابیں نہیں ہیں، صحاح بلکہ حدیث کی عام متداول کتابوں کا یہی حال ہے گویا سمجھنا چاہیے کہ پچھلے ہزار سال بلکہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے حدیث کی کتابوں کی روایتیں ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند تر ہو چکی ہیں، لے دے کر جیسا کہ میں نے عرض کیا گفتگو کی گنجائش جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ وقفہ کی اسی محدود درت میں پیدا ہو سکتی ہے جو عہد صحابہ کے بعد اور حدیث کی کتابوں کے ان مصنفین کے عہد سے پہلے درمیان میں گذری ہے۔ اور اب اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا سوال اس سلسلے میں یہی ہو سکتا ہے کہ خود اس وقفہ کی مدت کتنی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یوں تو ایک سے زائد صحابیوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ سو سال بلکہ سو سال کے بعد بھی دنیا میں موجود تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور آپ کے خلوت و جلوت کے مشاہدات و تجربات کے بیان کرنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سو سال تک پیغمبر کے بعد زندہ رہے بلکہ بعض تو ایک سو پر بھی ایک سال کا بعض دو سال کا، بعض تین سال تک کا اضافہ کرتے ہیں بہر حال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پیغمبر کے

بعد پیغمبر کی زندگی کے نمونوں کی قولاً وفعلاً کامل ایک صدی تک حضرت انسؓ امت میں اشاعت کرتے رہے ہیں اسی طرح یہ بھی مانا گیا ہے کہ ہرماس بن زیاد باہلی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو بارہ سال تک اور محمود بن ربیع صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو نو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہے ہیں چوتھے صحابی اس سلسلے کے حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ ہیں جن کا نام عامر بن واثلہ ہے، سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ آخری صحابی ہیں جن پر صحابہ کا دور ختم ہو گیا حافظ ابن حجر نے جریر بن حازم جو ایک معتبر اور ثقہ راوی ہیں ان کی یہ چشم دید شہادت نقل کی ہے۔

كنت بمكة سنة عشر ومائة فرأيت جنازة فسألت عنها فقيل ابوالطفيل

میں سنہ ۱۱۰ ہجری میں مکہ معظمہ میں تھا، اسی زمانہ میں میں نے ایک جنازہ دیکھا دریافت کیا یہ کن کا جنازہ ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ ابوالطفیل (صحابی) کا جنازہ ہے

صفحہ ۱۱۰ ج ۷

گویا [illegible] ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک سو بیس سال تک حضرت ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ [illegible]

پھر جیسے سیاسی مرکزیت کی وجہ سے کسی بادشاہ کی حکمرانی کا سارا زمانہ اسی بادشاہ کا دور اور زمانہ سمجھا جاتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی بھی جس زمانہ تک پائے گئے ہیں اس زمانہ کو ہم عہد صحابہ نہ قرار دیں آخر مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیاسی نہ سہی دینی مرکزیت کا جو مقام صحابہ کو حاصل تھا، وہ سلاطین کی سیاسی مرکزیت سے کیا کم تھا۔ سو یہاں حال کی صورت یہ ہے کہ ان ہی معدودے چند اصحاب کی حد تک یہ مسئلہ محدود نہیں ہے بلکہ آپ کے سامنے میں ایک تختہ پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کتنے صحابی کتنے سالوں تک مسلمانوں کو اپنے ان معلومات اور مشاہدات سے مستفید کرتے رہے ہیں جن کا براہ راست علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ان بزرگوں کو میسر آیا تھا۔

تختۂ ان صحابیوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسی سے سو سال تک زندہ رہے ہیں

نمبر شمار	نام صحابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہنے کی مدت،	جائے قیام و وفات
۱	سائب بن یزید رض	ایک سو سال تک	مدینہ منورہ
۲	مرثد بن عبد اللہ	۹۹ سال تک	؍؍
۳	عبداللہ بن بسر المازنی	۹۸ ؍؍	حمص (شام)
۴	سہل بن سعد الساعدی	۹۸ ؍؍	مدینہ منورہ
۵	عبداللہ بن ابی اوفی	۹۷ ؍؍	کوفہ
۶	عتبہ بن عبد السلمی	۹۷ ؍؍	؍؍
۷	مقدام بن معدی کرب	۹۷ ؍؍	شام
۸	عبد بن الحارث بن جزء	۹۷ ؍؍	مصر
۹	ابوامامۃ الباہلی	۹۶ ؍؍	شام (حمص)
۱۰	عبداللہ بن جعفر	۹۶ ؍؍	مدینہ منورہ
۱۱	عمرو بن حریث	۹۵ ؍؍	کوفہ
۱۲	ابو واقد اللیثی	۹۵ ؍؍	؍؍
۱۳	عمرو بن سلمہ الجرمی	۹۵ ؍؍	بصرہ (شام)
۱۴	واثلہ ابن الاسقع	۹۵ ؍؍	مصر
۱۵	عتبہ بن الندر	۹۴ ؍؍	بصرہ میں رہتے تھے
۱۶	عبداللہ بن حارث	۹۴ ؍؍	بادیۃ العرب
۱۷	زید بن الخالد الجہنی	۸۸ ؍؍	حمص

۱۸	عرباض بن ساریہ	۸۵ سال تک	شام
۱۹	ابو ثعلبہ الخشنی	۸۵ 〃	مدینہ منورہ
۲۰	ابو سعید الخدری	۸۴ 〃	بادیہ
۲۱	سلمۃ بن الاکوع	۸۴ 〃	مدینہ منورہ
۲۲	رافع بن خدیج	۸۴ 〃	〃
۲۳	محمد بن حاطب	۸۴ 〃	〃
۲۴	ابو جحیفہ	۸۴ 〃	〃
۲۵	سعید بن الخالد الجہنی	۸۳ 〃	〃
۲۶	اسمار بنت ابی بکر	۸۳ 〃	〃
۲۷	عبداللہ بن عمر بن خطاب	۸۳ 〃	〃
۲۸	عوف بن مالک الاشجعی	۸۳ 〃	〃
۲۹	برار بن عازب	۸۲ 〃	〃
۳۰	جابر بن عبداللہ انصاری	۸۰ 〃	〃

اس فہرست میں چاہا جائے تو ابھی اور اضافہ کیا جا سکتا ہے تاہم ان (۳۰) ناموں کے ساتھ ان چار بزرگوں کو بھی ملا لیجیے جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ سو سال سے بھی برس دو برس زیادہ عہد نبوت کے بعد زندہ رہے اور اس کے بعد سوچیے کہ اتنی بڑی تعداد صحابیوں کی کیا استثنائی مثال کہلانے کی کسی طرح بھی مستحق ہو سکتی ہے؟ کیا اتنی بڑی تعداد کے متعلق یہ دعوی کہ بچے کچھے اِکّے دُکّے آخر میں رہ گئے تھے کسی حیثیت سے بھی درست ہو سکتا ہے؟

بہر حال تدوین حدیث کی تاریخ میں یہ واقعہ کافی اہمیت رکھتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد ایک سو سال تک کوئی زمانہ ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے خالی رہا ہو بلکہ اس طویل عرصہ میں ہر اس مقام پر جسے گونہ مرکزیت حاصل تھی اس طبقہ کے کافی افراد وہاں پائے گئے ہیں، نبوت کے متعلق جن کے تجربات و مشاہدات براہ راست معلومات و ذاتی مسموعات کا نام حدیث ہی یہی نہیں بلکہ حدیث کا بڑا ذخیرہ جن صحابیوں سے منقول ہے اصطلاحاً جنہیں مکثرین کہتے ہیں یعنی ہزار یا ہزار سے اوپر جن کی روایتیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں گذشتہ " محاضرہ" میں ان کی فہرست پیش کر چکا ہوں آپ اس فہرست کا بھی جائزہ لیجیے اور جو تختہ اب میں نے پیش کیا ہے اس سے مقابلہ کیجیے آپ پائیں گے کہ مکثرین صحابہ میں سے بجز تین صحابیوں کے سب کے سب اس پیش کردہ تختے میں بھی موجود ہیں۔

باقی مکثرین میں سے تین حضرات یعنی ابوہریرہ، عائشہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم اس میں شک نہیں کہ نسبتاً ان بزرگوں کی عمر یں دوسرے مکثرین کے مقابلہ میں تھوڑی ہیں لیکن یہ کمی بھی کتنی ہے؟

جب ہمیں معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابن عباس اٹھتر سال تک، حضرت ابوہریرہؓ ایک سال کم ستر سال تک، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دو سال کم ستر سال تک حدیث کے نشر و اشاعت کے کام انجام دیتی رہی ہیں تو عام صحابہ کے لحاظ سے نہ سہی، مگر حدیثوں کی روایت کا جن صحابیوں سے تعلق ہے ان کے متعلق تو بہرحال یہی ماننا پڑے گا کہ پیغمبر کے بعد کامل سو سال پر ان کا عہد مشتمل ہو۔

بہرکیف اگر یہ مان بھی لیا جائے جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں کہ ان صحابیوں کے مشاہدات اور روایات کو سب سے پہلے صحاح ستہ کے مصنفین ہی نے قلم بند کیا ہے اور یہ کہ وقفہ کی اس درمیانی مدت میں ان روایتوں کا دار و مدار صرف یاد کرنے والوں کے حافظہ اور قوت یادداشت ہی پر رہا جب بھی زیادہ سے زیادہ مدت اس درمیانی وقفہ کی بمشکل سوا اور ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی رہتی ہے کیونکہ صحاح ستہ کے مصنفین کے عہد میں اور مذکورہ بالا صحابیوں کے عہد میں آپ کو اس سے زیادہ

فاصلہ نظر نہ آئے گا حاشیہ میں ان مصنفین کے سن ولادت[1] اور سن وفات کو درج کر دیتا ہوں ان سنین کو اور صحابہ کے متعلق جو تختہ میں نے پیش کیا ہے دونوں کو سامنے رکھ کر فاصلہ کی مدت کا اوسط نکالیے جس نتیجہ تک میں پہونچا ہوں انشاء اللہ آپ بھی اسی نتیجہ تک پہونچیں گے۔

"محاضرہ" کی پہلی قسط میں اگرچہ بہ تفصیل یہ دکھایا جا چکا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقہ معلومات جنہیں آج حدیث کی کتابوں میں ہم پاتے ہیں ان کے متعلق یہ خیال سرے سے بے بنیاد ہے کہ صحاح کی موجودہ کتابوں سے پہلے بجائے سفینوں کے صرف سینوں سے سینوں ہی تک منتقل ہوتے رہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اسی عامیانہ خیال کو تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی میں نہیں سمجھتا کہ ان معلومات کو قطعی طور پر مسترد کر دینے کے لیے اتنی وجہ کیسے کافی ہو سکتی ہے کہ سو ڈیڑھ سو سال تک بجائے کاغذ کے بے جان اوراق کے زندہ انسانوں کے زندہ حافظوں نے ان کی حفاظت کی، آخر آدمی کا حافظہ آدمی کا حافظہ ہے شمع کے ان پروانوں کا حافظہ تو نہیں ہے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ جلنے کے بعد فوراً ان پروانوں کے حافظہ سے جلنے کا خیال نکل جاتا ہے اسی لیے جلنے کے بعد بار بار پھر اسی شمع پر گرتے ہیں شاعروں نے شمع و پروانے کے اسی تعلق کا نام عشق رکھ چھوڑا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہم اسی انسان کی بینائی، شنوائی اور دوسری قوتوں کے معلومات پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان ہی معلومات پر آدمی کی زندگی اور زندگی کے پورے کاروبار کا دارومدار ہے۔ دیکھنے میں آنکھوں پر، سننے میں کانوں پر، سونگھنے میں ناکوں پر، چکھنے میں زبانوں پر ہم بھروسہ کرتے ہیں پھر ایک حافظہ اور یادداشت ہی کی قوت بدگمانیوں کا شکار کیوں بنی ہوئی ہے کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ کچھ دن کے لیے کسی چیز کا حافظہ کی قوت کے سپرد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ان ساری ضمانتوں سے وہ محروم ہو گئی جن کی ضرورت اعتماد اور

[1] صحیح بخاری کے مولف امام محمد بن اسمعیل بخاری کی ولادت سنہ ۱۹۴ھ وفات سنہ ۲۵۶ھ امام مسلم کی ولادت سنہ ۲۰۴ھ وفات سنہ ۲۶۱ھ ابوداؤد ولادت سنہ ۲۰۲ھ وفات سنہ ۲۷۵ھ ابن ماجہ کی ولادت سنہ ۲۰۹ھ وفات سنہ ۲۷۳ھ ترمذی کی وفات سنہ ۲۷۹ھ میں ہوئی ہے۔ ان میں سب سے پیچھے نسائی ہیں ان کی ولادت سنہ ۲۱۵ھ اور وفات سنہ ۳۰۳ھ میں ہوئی ہے ۱۲۔

بھروسہ کے لیے قدرتاً انسانی فطرت محسوس کرتی ہے۔

میں خود اپنی ذمہ داری پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن ہندیات کے مشہور محقق ابوریحان بیرونی کے حوالہ سے یہ بات جو نقل کی گئی ہے[۱] کہ جس زمانہ میں بیرونی ہندستان آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس کے کچھ دن پیشتر ایک کشمیری پنڈت نے پہلے پہل ویدوں کو کتابی قالب عطا کیا تھا ورنہ اس سے پہلے ویدوں کا سارا دارومدار ان پنڈتوں کے حافظہ پر تھا جو نسلاً بعد نسل اس کے اشلوکوں کو زبانی یاد کرتے چلے آرہے تھے۔

اس کشمیری پنڈت سے پہلے زبانی یادداشت کی شکل میں وید کتنے زمانہ تک رہی اس سوال کے جواب میں خود وید کے ماننے والے ہندوؤں کی جس طویل قطار کو پیش کرتے ہیں ہم لاہوتی ریاضیات کا انہیں ہندسی رمز قرار دیتے ہوئے اور ان کے سمجھنے سے معذوری کا اقرار کرتے ہوئے اسی کو اگر صحیح مان لیں جو آج کل کے مغربی مستشرقین کہتے ہیں یعنی ویدوں کے ظہور کے ابتدائی زمانے کو متعین کرتے ہوئے یورپ کے ارباب تحقیق کا جو یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے گیارہ بارہ سو سال آگے وید کی تاریخ نہیں بڑھتی، جب بھی البیرونی کی مذکورہ بالا شہادت کا مطلب کیا ہوا؟ ہم جانتے ہیں کہ البیرونی گیارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں یعنی ۱۰۳۰ء میں ہندستان پہونچا تھا اس لحاظ سے مستشرقین کی تحقیق کی بنیاد پر گویا یہ ماننا پڑے گا کہ کم از کم دو ہزار سال تک ہندو دھرم کی یہ بنیادی کتاب کاغذ اور سیاہی قلم و دوات کی منت کشی سے آزاد رہی ہے۔

وید اور اس کی تعلیمات کے متعلق دوسرے جہات اور پہلوؤں سے چاہے کچھ بھی کہا جائے لیکن اس کے ماننے والوں میں محض اس بنیاد پر میں تو نہیں سمجھتا کہ شک اندازی کی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے کہ

[۱] مشہور فاضل عبداللہ بن یوسف علی صاحب نے ہندستانی اکاڈیمی میں جو لیکچر ہندستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی معاشرت اور اقتصادی حالت پر دیا تھا اور اس لیکچر کے سننے والوں میں ہندو مذہب کے بھی مستند علما اور مورخین موجود تھے اسی میں انہوں نے البیرونی کے حوالہ سے مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے۔ دیکھو لیکچر مذکورہ ص ۱۷

ایسی کتاب کا کیا اعتبار جس کے مضامین اور اشلوکوں کو دو ہزار برس تک برہمنوں اور پنڈتوں نے صرف یاد کر کے محفوظ رکھا ہو اور ایک نسل سے دوسری نسل تک اس کو یوں ہی منتقل کرتے ہوئے چلے آئے ہوں اوروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن مسلمانوں کی طرف سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس اعتراض کی جرأت وہ کیسے کر سکتے ہیں ان کے پاس قرآن کے حفظ کا رواج اب تک زندہ ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مکتوبہ قرآن کے الفاظ پر حالانکہ زیر وزبر، پیش، جزم اور تشدید الغرض ہر قسم کے حرکات لگا دیے گئے ہیں لیکن باوجود اس کے یہ بالکل ممکن ہے کہ مکتوبہ اور لکھے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا بعض الفاظ کے پڑھنے اور سمجھنے میں غلطی کر جائے لیکن قرآن کے حفاظ کا اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہونا ناممکن ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی آسمانی کتاب کو زبانی یاد کرنے کا دستور جس مذہبی ذوق کی وجہ سے مسلمانوں میں اب تک باقی ہے دوسری قوموں میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ کرسٹن نے اپنی تاریخ "ایران در عہد ساسانیان" میں لکھا ہے کہ ہرمز چہارم ایرانی بادشاہ کے سامنے ایک عیسائی پیش ہوا جسے عہد قدیم وجدید کے سارے نوشتے زبانی یاد تھے۔ بادشاہ نے بائیبل کے اس حافظ کو انعام سے بھی سرفراز کیا تھا دیکھو کتاب مذکور صفحہ (۵۴۵) ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ میں اپنی کتابوں کی زبانی یاد کرنے کا یہ رواج اب بھی باقی رہا نہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض برہمنوں کے نام کے آخر میں دوبے چوبے چترویدی یا ترویدی وغیرہ کے جو لاحقات پائے جاتے ہیں یہ اس کے علامات ہیں کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد نے کسی زمانے میں ویدکو زبانی یاد کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ چاروں ویدکو جو زبانی یاد کرتے تھے وہ چترویدی یا چوبے اور تین کے یاد کرنے والے ترویدی دو کے یاد کرنے والے دوبے کہلاتے تھے گویا یہ اسی قسم کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اپنے نام کے اول یا آخر میں قاضی یا مفتی کا لفظ اب بھی اسی وجہ سے بڑھاتے ہیں کہ وہ خود تو قاضی یا مفتی نہیں ہوتے لیکن ان کے خاندان میں قاضی یا مفتی کسی زمانہ میں گذرے تھے

حکومت کی طرف سے حضرت ابوہریرہ کے حافظہ کا امتحان

حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کے تیس پاروں کے حفظ کا رواج خود حدیث کی تاریخ کی ان شہادتوں کی زندہ توثیق ہے جو ہماری کتابوں میں حدیث کے راویوں کی قوت یادداشت اور حافظہ کے متعلق پائی جاتی ہیں آخر آپ ہی بتلائیے کہ تیس تیس پاروں کے بے شمار زندہ حفاظ کو دیکھ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حافظے کے اس امتحانی نتیجہ کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے جسے امام بخاری نے کتاب الکنی میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مروان بن الحکم جو دمشق کی حکومت کا سب سے پہلا حکمران ہے اسی کے سکرٹری ابوالزعزعہ کا بیان ہے کہ ایک دن مروان نے حضرت ابوہریرہ کو طلب کیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کثرت سے جو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اسی سلسلے میں مروان کچھ تشکیک وشبہات میں مبتلا تھا بہرحال بلانے پر حضرت ابوہریرہ تشریف لائے مروان نے ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے سکرٹری ابوالزعزعہ کو ہدایت کردی تھی کہ پردہ کے پیچھے دوات قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جائے میں ابوہریرہ سے حدیثیں پوچھونگا جو حدیثیں وہ بیان کریں ان کو تم لکھتے چلے جانا یہی کیا گیا۔ مروان چھیڑ چھیڑ کر حضرت ابوہریرہ سے حدیثیں پوچھنے لگا۔ ابوہریرہ بیان کرتے جاتے تھے اور پس پردہ ابوالزعزعہ لکھتا چلا جاتا تھا ان حدیثوں کی تعداد کیا تھی خود ابوالزعزعہ کا بیان ہے

فجعل یسال وانا اکتب حدیثا کثیرًا — پس مروان ابوہریرہ سے پوچھنے لگا اور میں نے بہت سی حدیثیں لکھ لیں۔

بہرحال "حدیثا کثیرًا" (بہت سی حدیثوں) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کی کافی معقول تعداد تھی جو اس وقت قلم بند ہوئیں حضرت ابوہریرہ بیچارے کو قطعاً مروان کی اس پوشیدہ کارروائی کی خبر نہ تھی مجلس برخاست ہوگئی حضرت چلے گئے اور مروان نے حدیثوں کے اس مجموعہ کو بحفاظت تمام رکھوادیا۔ پورے سال بھر کے بعد ابوالزعزعہ کہتے ہیں کہ مروان نے ابوہریرہ کو دوبارہ طلب کیا اور مجھے حکم دیا کہ مکتوبہ حدیثوں کے اس مجموعہ کو لے کر پردہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں ان سے ان ہی حدیثوں کو پھر پوچھونگا

دیکھو اب کی دفعہ وہ کیا بیان کرتے ہیں تم ان مکتوبہ حدیثوں سے ان کو ملاتے جانا حکومت کی طرف سے ابوہریرہ کا گویا یہ امتحان تھا۔

امتحان لیا گیا نتیجہ کیا نکلا؟ ابوالزعزعہ ہی کی زبانی سنیے میں ابوالزعزعہ کے بیان کے پورے الفاظ ہی کو نقل کر دیتا ہوں جو یہ ہیں۔

فترکہ سنۃ ثم ارسل الیہ اجلسنی	پس مروان نے نوشتہ حدیثوں کے اس مجموعہ کو سال بھر تک رکھ چھوڑا
وراء الستر فجعل یسألہ وانا انظر	سال کے بعد مجھے پھر پس پردہ بٹھا کر حضرت ابوہریرہ سے پوچھنے لگا
فی الکتاب، فما زاد ولا نقص	اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا تھا، پس ابوہریرہ نے نہ کسی لفظ کا
(کتاب الکنی۔ بخاری ص۳۳)	اضافہ کیا اور نہ کم کیا

اور حضرت ابوہریرہ کی ان حدیثوں کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ واقعی ان کی صحیح تعداد کیا تھی بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ چند قلیل روایتیں نہیں تھیں کثیر روایتوں کا یہ مجموعہ تھا لیکن قریب قریب اسی کے ابن شہاب زہری کے جس امتحانی واقعہ کا تذکرہ اسماء الرجال کی کتابوں میں کیا گیا ہے یعنی مروانی حکومت کے دوسرے فرماں روا ہشام بن عبدالملک نے زہری کا جو امتحان لیا تھا اس میں تو تصریح کی گئی ہے کہ چار سو حدیثوں کا یہ مکتوبہ مجموعہ تھا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جیسے مروان نے حضرت ابوہریرہ کی روایتوں اور ان کی قوت یادداشت کو جانچنا چاہا تھا اسی طرح اپنے عہد حکومت میں ہشام نے بھی ابن شہاب زہری کا امتحان کرنا چاہا اس نے امتحان لینے کی یہ ترکیب اختیار کی کہ ایک دن دربار میں زہری کسی ضرورت سے آئے ہوئے تھے اس نے خواہش ظاہر کی کہ شاہزادہ یعنی اس کے لڑکے کے لیے کچھ حدیثیں لکھوا دیجیے زہری راضی ہو گئے کاتب بلایا گیا اور زہری نے جیسا کہ الذہبی نے لکھا ہے

فاملی علیہ اربع مائۃ حدیث (تذکرہ ص۱۰۳ ج۱) زہری نے چار سو حدیثیں شاہزادے کے لیے لکھوا دیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مہینے کے بعد ہشام کے دربار میں پھر جب زہری پہونچے تو بڑے افسوس کے لہجہ میں

ہشام نے کہا ان ذلک الکتاب ضاع (یعنی وہ کتاب جسے آپ نے لکھوا کر شاہزادے کو دی تھی وہ گم ہو گئی)

زہری نے کہا کہ تو یہ پریشانی کی کیا بات ہے کاتب کو بلوائیے پھر لکھوا دیتا ہوں یہی ہشام کی غرض تھی کاتب بلایا گیا وہیں بیٹھے بیٹھے زہری نے پھر ان ہی چار سو حدیثوں کو لکھوا دیا پہلا مسودہ درحقیقت غائب نہیں ہوا تھا یہ ہشام کی ایک ترکیب تھی جب زہری دربار سے اٹھکر باہر گئے تو

فقابل بالکتاب الاول فما ہشام نے پہلی کتاب کا دوسری دفعہ لکھائے ہوئے

غادر حرفا واحدا نوشتے سے مقابلہ کیا، معلوم ہوا کہ ایک حرف

(ص ۱۰۱) بھی زہری نے نہ چھوڑا تھا۔

بلاشبہ زہری کے حافظے کا یہ کمال تھا اور جیسا کہ میں نے کہا حفاظ قرآن کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو اس امتحانی نتیجہ کے ان الفاظ فما غادر حرفا واحدا (یعنی جو کچھ پہلی کتاب میں زہری نے لکھوایا تھا اس کے ایک حرف کو بھی دوسری کتاب میں نہیں چھوڑا تھا) پر ممکن ہے لوگ تعجب کرتے مگر آج جس کا جی چاہے چار سو حدیثوں کے مجموعے سے بڑا مجموعہ یعنی پورے قرآن کو آپ کسی حافظ سے سن کر لکھتے جائیے اور اسی عمل کو دوبارہ کیجیے یعنی پھر سن کر لکھیے، اس کے بعد قرآن کے ان دونوں نسخوں کا پھر مقابلہ کیجیے یقیناً آپ بھی فما غادر حرفا (نہ چھوڑا اس نے ایک لفظ بھی) کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے۔[1]

[1] ان لوگوں کیلئے جو کہتے ہیں کہ صحاح کے مصنفین سے پہلے حدیثیں قلم بند نہیں ہوئی ہیں جن شواہد اور دلائل میں ان کے اس بے بنیاد دعوے کی تردید کی گئی ہے ان کا ذکر تو گذر ہی چکا لیکن ضمناً ان ہی دو واقعوں پر غور کیجیے حضرت ابوہریرہ کے حدیثوں کے تین نسخوں کا پہلے ذکر کر چکا ہوں جو ان کی زندگی میں تیار ہو چکے تھے مروان والے واقعہ میں مانا کہ ان کی کل حدیثوں کے لکھنے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن (حدیث کثیر) مروان کے سکریٹری ابوالزعزعہ کو اس وقت بھی خود انہوں نے لکھوایا گویا صحابی کی لکھائی ہوئی حدیث کی ایک کتاب یہ بھی تھی جو مروان کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ تھی اسی طرح گو زہری صحابی نہیں ہیں لیکن صحابیوں سے براہ راست استفادہ کرنے والوں میں تو ہیں۔ ابن عمر، انس بن مالک، سہل بن سعد وغیرہ صحابیوں کے شاگرد ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نہیں بلکہ زہری کے چار سو حدیثوں کے یہ دو نسخے ہشام بن عبدالملک کے کتب خانہ میں تھے اور دونوں خود زہری کے لکھوائے ہوئے تھے اور اس قسم کے واقعات کیا ایک دو ہیں لوگ پڑھتے نہیں یا غور نہیں کرتے ورنہ پہلی صدی ہجری میں اس قسم کی چھوٹی بڑی حدیث کی خدا جانے کتنی کتابوں کا پتہ چل سکتا ہے جن کا ذکر دوسرے واقعات کے ضمن میں اتفاقاً کر دیا گیا ہے۔

قرآن کے ایسے حافظ آج بھی بآسانی آپ کو مل سکتے ہیں جو ٹھیک ابن راہویہ کی طرح آپ کو پارہ سورہ رکوع کے حوالہ سے ہر اس آیت کا پتہ دے سکتے ہیں جو ان سے پوچھی جائے اور سچ تو یہ ہے کہ خود حفظ حدیث کے متعلق بھی ابن راہویہ کی مثال واحد مثال نہیں ہے۔ حافظ ابوزرعۃ الرازی جو حدیث و رجال کے مشہور ائمہ میں ہیں ابن ابی حاتم نے ان کا یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ابن وارہ جن کا اصلی نام محمد بن مسلم ہے اور فضل بن العباس جو فضلک الصائغ کے نام سے مشہور تھے۔ دونوں حافظ ابوزرعہ کے پاس حاضر ہوئے دونوں میں کسی مسئلہ پر بحث ہونے لگی ابن وارہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک حدیث پیش کی فضلک نے کہا کہ حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں ابن وارہ نے پوچھا کہ پھر صحیح الفاظ اس حدیث کے کیا ہیں۔ فضلک کے نزدیک حدیث کے جو الفاظ تھے اس نے دہرادیا دونوں کی گفتگو ابوزرعہ خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے، آخر ابن وارہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے کہ آپ فرمائیے واقعی حدیث کے صحیح الفاظ کیا ہیں۔ انہوں نے پھر بھی اعراض سے کام لینا چاہا لیکن جب اصرار ابن وارہ کا حد سے زیادہ بڑھ گیا تب ابوزرعہ نے کہا کہ ذرا میرے بھتیجے ابو القاسم کو بلائیے ابو القاسم بلائے گئے، حافظ ابوزرعہ نے ان سے کہا کہ

ادخل بیت الکتب ودع القمطر الاول الثانی کتب خانہ جاؤ، پھر پہلے دوسرے تیسرے بستے کو چھوڑ کر، والثالث وعد ستۃ عشر جزءاً وائتنی بالجزء اس کے بعد جو بستہ ہو اس سے کتاب نکالو گن کر سولہ جز السابع عشر تہذیب التہذیب۔ (ص ۳۳ ج ۷) کے بعد سترہواں حصہ جو کتاب کا ہے میرے پاس لاؤ۔

ابو القاسم گئے اور حسب ہدایت مطلوبہ جز کو نکال لائے۔ لکھا ہے کہ حافظ ابوزرعہ نے اوراق الٹے اور حدیث جس صفحہ پر تھی اس کو نکال کر ابن وارہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ابن وارہ نے پڑھا اور اقرار کیا کہ (واقعی میں ہی بر سر غلطی تھا) اس واقعہ کے ساتھ حافظ ابوزرعہ کے اس دعوے کو پیش نظر رکھ لیجیے جسے ابن حجر ہی نے ابوجعفر التستری کے حوالہ سے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ وہ ان سے کہتے تھے۔

ان فی بیتی ماکتبتہ منذ خمسین سنۃ	پچاس سال ہوئے جب میں نے حدیثیں لکھی تھیں اور وہ میرے
ولم اطالعہ منذ کتبتہ وانی لا	گھر میں رکھی ہوئی ہیں. لکھنے کے بعد اس پورے پچاس سال
علم فی ای کتاب ہو فی ای	کے اندر ان حدیثوں کا میں نے پھر دوبارہ مطالعہ نہیں کیا
ورقۃ ہو فی ای صفحۃ ہو فی ای سطر	ہے لیکن جانتا ہوں کہ حدیث کس کتاب میں ہے اس
ہو۔ صفحہ ۲۳ تہذیب ج ۷	کتاب کے کس ورق میں ہے کس صفحہ میں ہے کس سطر میں ہے۔

یہ بات کہ پچاس سال کے عرصہ میں دوبارہ یاد کی ہوئی اور لکھی ہوئی حدیثوں کے دہرانے اور دیکھنے کا موقعہ حافظ ابوزرعہ کو نہ ملا اس پر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ ان حدیثوں کا یاد رہ جانا یقیناً قوت یادداشت اور حافظہ کی پختگی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے اور مثال کے بغیر واقعات کے ماننے میں ہچکچانے والی عقل شاید آسانی کے ساتھ حافظ ابوزرعہ کے اس دعوے کو مشکل ہی سے تسلیم کر سکتی تھی اگر قرآن کے حفاظ میں ایسے افراد نہ پائے جاتے جنہوں نے یاد کرنے کے بعد پھر کبھی قرآن کو کھول کر نہیں دیکھا لیکن جس آیت کو جس وقت جی چاہے آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ اور اسی تفصیل کے ساتھ یعنی کس پارے کس سورہ کس رکوع کی یہ آیت ہے آپ کو وہ جواب دے سکتے ہیں۔ بلکہ ان میں بعض تو ایسے حفاظ بھی دیکھے گئے کہ برسوں کے بعد تراویح سنانے کا موقعہ ان کو ملا ہے لیکن دن کو دور کیے بغیر انہوں نے پورا قرآن تراویح میں سنا دیا، اگرچہ عام طور پر اس قسم کے حفظ کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ورنہ عام قاعدہ حافظوں کا یہی ہے کہ کم از کم ایک دفعہ دن کو دور کر لیتے ہیں یعنی جو کچھ رات کو سنانے والے ہیں اس کو ایک دفعہ دہرا لینا عام حالات میں ضروری ہے. پورے قابو یافتہ ہو کر قرآن سنانے کا عام قاعدہ یہی ہے۔

بہرحال کم ہی سہی لیکن قرآن کے حفاظ میں اس قسم کے افراد جب پائے جاتے ہیں تو جس زمانے میں حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا عام دستور مسلمانوں میں مروج تھا اگر حدیث کے حافظوں میں ایسی مثالیں

پائی جاتی تھیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کسی چیز کو یاد کر لینے کے بعد اس قسم کے تجربات میں اتنی ندرت نہیں باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ ان کے متعلق شبہ کیا جائے اور شک و شبہ کی بیماری کسی میں ہو تو خدا کا شکر ہے کہ قرآن کے حفظ کی زندہ مثالوں سے ان کے شکوک کا بآسانی ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

حدیثوں کو زبانی یاد کرنے کا دستور
واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک جیسے اس وقت تک قرآن کو زبانی یاد کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے زمانے تک قرآن کے ساتھ حدیثوں کو بھی زبانی یاد کرنے کا دستور جاری رہا ہے اور پیغمبر کی حدیثوں کے حفظ کا یہ ذوق خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پیدا کرایا ہوا تھا صحاح کی مشہور حدیث کہ خدا تر و تازہ رکھے اس شخص کو جو لوگوں سے ہماری حدیثوں کو سنتا ہے" اس کے بعد ارشاد ہے "فحفظها" (پھر ان حدیثوں کو یاد کر لیتا ہے) یا جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو جو حاضر نہیں ہیں میری حدیث اور میری باتیں پہونچاتے چلے جائیں اس میں بھی ہے کہ

فانہ لعلہ ان یبلغ من ھو	کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہونچانے والا ایسے آدمی کو
اوعیٰ لہ او من ھو احفظ لہ	پہونچا دے جو اس سے زیادہ اس کا یاد رکھنے والا ہو
	یا زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو۔

صحابہ کرام بھی اپنے شاگردوں کو اور ان لوگوں کو جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے۔

ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم	تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں
کان یحدثنا فنحفظ فاحفظوا	بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے
کما کنا نحفظ۔	پس تم لوگ بھی اسی طرح حدیثوں کو زبانی یاد کیا
ص ۶۴۔ جامع بیان العلم	کرو جیسے ہم یاد کیا کرتے تھے۔

باقی آئندہ

دنیا کے تین بڑے جاہلی تمدن

مغربی تمدن اور اس کی اساس

(۲)

از جناب مولوی ابو صالح اعظمی صاحب پٹھان کوٹ

مغربی تہذیب جن تہذیبوں کی جائز وارث ہے ان پر ایک طویل بحث ہم گذشتہ نمبر میں کر چکے ہیں۔ چونکہ جدید مغربی تہذیب ان دونوں قدیم تمدنوں سے زیادہ سائنٹفک اور مدلل ہے اس لئے اس پر ایک طویل بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اپنی ساخت اور اپنے اصول کے لحاظ سے ان دونوں تہذیبوں میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ فرق صرف شکل و صورت کا ہے۔

مغرب کا نظریۂ کائنات اور انسانیت کا مقصد

مغرب کا نظریہ کائنات یہ ہے کہ یہ سارا نظام کائنات ایک اتفاقی (Accidental) ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے، یونہی بن گیا ہے، بغیر کسی مقصد کے چل رہا ہے، اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا۔ وہ کچھ حیوانوں جیسی خواہشات رکھتا ہے اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ طبع حیوانی کے مطالبات کو پورا کرے۔ انسان سے مافوق کوئی علم و حکمت کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو

لہٰذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنے تاریخی تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہئے۔ بظاہر کوئی ایسی مافوق ذات نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو، اس لئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے اور اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو اپنے ہی سامنے، یا اس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی اس دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا معیار خیر و شر، صحیح و غلط، مفید و مضر، قابلِ اخذ ہیں اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ہر زمانہ میں کائنات اور خدا کے متعلق دنیا پرستوں کا یہی نظریہ رہا ہے اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدنوں کی جڑ میں یہ غیر خدا پرستانہ نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کی بنیاد بھی اس نظریہ پر اٹھائی گئی ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طریقہ سے یہ تصورات آج بڑی شدت سے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جو لوگ خدا کے قائل ہیں اور آخرت کے بھی منکر نہیں ہیں اور نہ نظری حیثیت سے مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں ان کی زندگیوں اور ان کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ جو روح ان کے اندر کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے اور کچھ اس طرح ان کی زندگیوں میں پیوست ہو گئی ہے کہ واقعی وہ اپنی زندگی میں دہریہ اور مادہ پرست ہیں کیونکہ ان کے علمی نظریہ کو ان کی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط نہیں ہے اور اسی نظریۂ زندگی پر مغرب کے تمدن کی مشین چل رہی ہے، ان کی سیاست، ان کی معاشرت، ان کی معیشت، غرضکہ انسانی زندگی کے تمام شعبے اسی ایک محور کے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ ان کے تمدن کی اٹھان، ان کی معاشرت کا ابھار، ان کی معیشت کی تنظیم اور ان کے تمام بین الانسانی معاملات انھیں اصولوں کے مطابق طے پاتے

اور انجام دئے جاتے ہیں جنھیں ہم اپنی اصطلاح میں لادینی نظریہ زندگی یا مادی اصولِ زندگی کہتے ہیں۔

جب کائنات اور انسان کے متعلق یورپ نے خالص مادی نقطۂ نظر اختیار کرلیا اور یورپ کے فلسفیوں نے مغرب کو مادیت اور الحاد کے بیابان میں ڈالدیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا، خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں پر مادیت غالب آگئی، اگرچہ یہ تغیر تدریجی اور آہستہ آہستہ ہوا اور ابتدا میں اس کے ارتقا کی رفتار سست تھی لیکن جب عزم و قوت کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت شروع کی، علماءِ فلسفہ اور ماہرین علوم طبیعیات نے کائنات میں اس طرز پر غور و فکر اور بحث و نظر کرنی شروع کی کہ گویا نہ کوئی اس کائنات کا خالق ہے نہ منتظم و حاکم اور طبعیات اور مادہ کے ماورا کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور نظم و نسق کرتی ہے وہ اس عالم طبیعی اور اس کے ظواہر کی تفسیر خالص میکانکی طریقہ پر کرنے لگے اور اس کا نام انھوں نے علمی اور تحقیقی طرزِ مطالعہ قرار دیا اور ہر ایسی بحث و نظر جو خدا کے وجود اور اس کے یقین پر ہو اُسے تقلیدی اور غیر علمی طرز مطالعہ قرار دیا۔

اس طرزِ فکر اور اس نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے چلتے چلتے حرکت اور مادہ کے سوا ہر چیز کا انکار کر دیا اور ہر اس چیز کے تسلیم کرنے سے عذر کیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہیں آتی تھیں اور جو نہ ناپی جاسکتی تھیں اور نہ انھیں تولا ہی جاسکتا تھا۔ خدا کا وجود اور تمام حقایق مابعد الطبیعات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا عقل و فلسفہ سے کوئی تائید ہی نہیں ہوتی اور جو نعوذ باللہ سراسر واہیات (میتھالوجی) تھے۔ لیکن بہر حال ان میں ابھی یہ جرأت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ صاف صاف خدا کا انکار کر دیں اور مذہب سے واضح لفظوں میں بیزاری ظاہر کر دیں، اور فی الواقع سب کے

سب اس مادی نقطہ نظر کے قائل بھی نہ تھے لیکن جو طریق فکر اور بحث و نظر میں جو راہ عمل انھوں نے اختیار کی تھی وہ ایسے دین کے ساتھ لگا نہیں کھا سکتی تھی جس کی پوری عمارت ایمان بالغیب اور وحی و نبوت کی بنیاد پر ہو اور جو حیاتِ اخروی پر اس قدر زور دیتا ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی میزان حواس و تجربہ کے تحت نہیں آتی تھی اور نہ وزن اور پیمائش سے ان کی تصدیق کی جا سکتی تھی۔ اس لئے روز بروز ان کے دینی عقائد متزلزل ہوتے گئے اور مادہ پرست فلسفیوں نے انھیں فطری راستہ سے پھسلا دیا۔ اور لوگ الحاد کی وادی میں اپنی خواہشات کی تسکین کرنے لگے۔

یہی زمانہ ہے جب سرزمین یورپ سے ایسے مصنف، فلسفی، ادیب، سائنٹسٹ پیدا ہوئے جنھوں نے الحاد و مادیت کا صور پھونکا اور عقلی و نقلی دلائل سے مادیت کی آب یاری کی، علمائے اخلاق نے اخلاق کی مادی اور افادی تفسیر بیان کرنی شروع کی، ان میں چند نمایاں حیثیت کے مالک ہیں جنھوں نے الحاد کو عین دین حق ثابت کر دکھایا اور ان میں نمایاں ترین حیثیت مکیاویلی (۱۴۶۹ — ۱۵۱۶) کی ہے۔

مکیاویلی اس نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت دی، اس نے اخلاق کو حکومت اور سوسائٹی کے ایوانوں سے جلا وطن کر دینے کا مشورہ دیا۔ اس کے نزدیک اخلاق و مذہب کا کوئی مصرف نہیں ہے اس کا خیال تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت کبھی پڑتی ہے تو وہ انسان کا محض ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو اجتماع اور امور سیاست میں داخل کرنا بے انصافی ہے۔ حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے۔

مکیاویلی کے ان خیالات کا پس منظر مکیاویلی کے ان خیالات کا پس منظر سولہویں صدی کی مسیحیت تھی، جس میں یقیناً افراد و جماعات کے لئے کوئی مکمل ضابطہ اخلاق و آئین مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔

پھر اس کے سامنے شہنشاہیت اور پاپائیت کی دائمی جنگ اور خود کلیسائی اداروں کی اندرونی زبوں حالی اور خود غرضی کے مناظر بھی تھے جن کے باعث اس نے مذہب اور اخلاق کو اجتماعی حیثیت دینے سے انکار کردیا اور حرم سیاست سے ان کا دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میکیاویلی نے صاف صاف کہا کہ افراد چاہیں تو نجی طور پر اخلاق و مذہب کی پابندی کرسکتے ہیں لیکن حکومت اور ریاست کو ان سے بالاتر رکھنا چاہیئے۔ مملکت اور ریاست کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بقا و استحکام کے لئے حصول قوت و اقتدار کے لئے کوشاں رہے۔ چاہے وہ ذرائع جائز ہوں یا ناجائز ہاں اگر مذہب و اخلاق سے سیاسی فوائد کے حصول میں مدد ملتی ہے تو عارضی طور سے انھیں اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ میکیاویلی نے اس ابن الوقتی کی حکمت عملی کو عین اقتضا ریاست بتایا ہے جس پر ایک کامیاب مدبر اور سیاست کار کے لئے عمل کرنا ضروری ہے۔ پچھلی چار صدیوں میں ——— اس تعلیم کو یورپ میں بڑی مقبولیت نصیب ہوئی، اس باطل پرست فلاسفی کی تعلیم نے حیلہ اندازی اور سیہ کاری کو فن لطیف بنا دیا، سچ اور جھوٹ کو باہم گلے ملا دیا۔ اور آج اس کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی سیاست اسی غلط کار کے اصول مخترعہ پر گھوم رہی ہے۔ یورپ نے اجتماعی زندگی سے خدا، آخرت، اخلاق، مذہب کو بالکل خارج کردیا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اثرات نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں اہل علم و اختراع کی ذہانت ایسے رازوں کے انکشاف میں منہمک ہوگئی۔ جو مملکت کی توسیع اور تقویت میں ممد و معاون ثابت ہوں چاہے ان کے برتنے میں اخلاقِ انسانی کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ میکیاویلی نے زمانہ پرستی کو اصول و عقیدہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور حکومت کو یہ حق دیدیا کہ وہ اپنے استحکام و بقا کے لئے جو بھی ذرائع اختیار کرے گی اس کے لئے سب مباح اور احسن ہوں گے۔ اس لئے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ ذریعہ، اگر کوئی مدبر اپنے اخلاقی اصولوں کی وجہ سے مملکت کو تھوڑا سا بھی نقصان

پہنچاتا ہے تو وہ قوم اور ملک کے دربار میں مجرم ہے۔ میکیاویلی نے اپنے خیالی بادشاہ کے لئے جو آزادیاں روا رکھی ہیں وہ چاہتا ہے کہ تمام دنیا کے سلاطین اور مدبرین ان اصولوں کو اختیار کرلیں، اور یہی ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد یورپ میں مطلق العنان حکمرانوں اور جمہوری حکومتوں نے اس کے اصولوں کو من وعن تسلیم کرلیا۔

ایک انگریز مصنف جان ہائی لینڈ (John Highy Land) لکھتا ہے کہ ۱۵۳۲ء میں جب اطالوی مصنف اور سیاست دان میکیاویلی نے اپنی مشہور کتاب "رئیس" (Prince) شائع کی تو اس میں اس نے مطلق العنانی کا ایک انتہائی تصور پیش کیا۔ اس کے نزدیک ریاست کے مفاد کو ایک مطلق العنان فرمانروا کی ذات میں مرتکز کردینا چاہیے جو مذہب اور اخلاق کے قوانین سے بالاتر ہو۔ میکیاویلی کے یہ تصورات اس عہد کی روح کا خلاصہ ہیں۔ یہ روح وہ تھی جو متعدد حیثیتوں سے سولہویں صدی، سترہویں اور اٹھارہویں صدی سے گذر کر آج تک باقی ہے۔[1]

میکیاویلی کے خیالات نے ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا کردیا تھا جو اس کے خیالات کا حامل تھا اور جنھوں نے بڑے شد ومد کے ساتھ اس کے خیالات کی اشاعت کی اور ہر طرح سے اس کو مقبولِ عام بنایا۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں کلیسا اپنی دنیا پرستی اور مظالم سے یورپ کے عوام میں اپنا اثر واقتدار کھوچکا تھا، عوام نے اچھی طرح سے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ مقدس مسیحیت ان کے دکھوں کا علاج نہیں ہوسکتی۔ مسیح کے علمبرداروں کی مسیحائی اور صداقت کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ خدا اور مذہب کے خلاف شدید تنفر پیدا ہوگیا تھا۔ لوگ اپنے مصائب اور آلام کا بڑی حد تک ذمہدار مذہب کو قرار دے رہے تھے۔ اس مسیحائی ماحول میں روسو وغیرہ نے بڑے زور وشور سے سرمایہ داری اور کلیسا کے خلاف عوام کو بھڑکایا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ تمہارے امراض کا واحد علاج سرمایہ داری کا خاتمہ

---

[1] Briefe History of Civilizatrah. P. 162.

ال

شخصی مطلق العنانی اور پاپائیت کے جوے کو اتار پھینکنے میں ہے۔ اسی کے نتیجہ میں مشہور انقلاب فرانس رونما ہوا جو شخصی مطلق العنانی اور پاپائیت کے لئے پیام موت تھا۔ اور الحاد اور بے دینی کا آغاز تھا۔ اسی زمانہ میں خدائی حقوق کی دہائیاں فضائے آسمانی میں بلند کی گئیں اور دنیائے جدید کی بنیاد ڈالی گئی۔

انقلاب فرانس | انقلاب فرانس جن وجوہ کی بنا پر رونما ہوا تھا وہی اسباب تھے جو ہر انقلاب سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے پس منظر پر تھوڑی سی بحث کریں۔ تاکہ تمام الحاد کی کڑیاں ملتی جائیں۔ یورپ میں کلیسائی نظام اور مطلق العنانی شہنشاہی سے جو ملک زیادہ گرانبار تھے ان میں ایک مظلوم جیل فرانس بھی تھا۔ پادریوں اور شہنشاہوں کے ناجائز اتحاد میں جن ممالک کی مٹی زیادہ پلید ہوئی تھی اس کی سرفہرست میں فرانس تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جب تعلیم کی اشاعت عام ہوگئی، تجارت کو فروغ نصیب ہوا، مال و دولت میں بیش بہا اضافے ہوئے اور سائنس نے نیچر کی قوتوں پر قابو پالیا اور اس سے قوت حاصل کرنے کے تازے خزانے دریافت کئے، ویسے ہی ویسے جہالت اپنے پردے سمیٹنے لگی اور آزادی کی خواہش بھی قوی سے قوی تر ہوتی گئی۔ اور اس آزادی کے ساتھ فرد اور اجتماع کی آزادی کا تخیل بھی شدت کے ساتھ زور پکڑنے لگا مطلق العنان حکمرانی کو جمہور تشویش اور بے چینی کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور رفتہ رفتہ مطلق العنانی کی مقبولیت کے ختم ہونے کا موسم خزاں آگیا۔

مفکروں اور ادیبوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ روسو کی قیادت میں دنیا کو آزادی کے تصور سے روشناس کرانے میں مشغول تھا۔ روسو نے اپنی مشہور و معروف کتاب (Social Contract) لکھ کر مطلق العنانی کی دیوار کو شگاف لگا دیا اور خدائی حقوق کے نظریے کے پرخچے اڑا دیئے۔ مطلق العنان حکمرانوں کو اپنی موت مسکراتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ عوام آگ و

خون کی ہولی کھیلنے کے لئے انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے، انقلاب کا مادہ آتشگیر پک رہا تھا۔ انقلاب کے فطری اسباب مہیا کئے جا رہے تھے۔ روسو اور مانٹیگو اس کارواں کے سالار تھے جو بڑی ہوشیاری سے انقلاب کا رخ متعین کرنے میں مشغول تھے۔ مانٹیگو نے موجودہ سیاسی اداروں پر سخت تنقید کی اور اس نے صاف صاف عوام کو بتایا کہ موجودہ حالات اکثر و بیشتر غیر منصفانہ ہیں۔ عوام کو چاہیئے کہ انھیں بدل ڈالیں اور اس کے بدلے میں ایک ایسا سماج پیدا کریں جو فرد اور جمہور کی سیاسی آزادی پر قائم ہو۔ ان خیالات کا عوام پر بڑا اثر ہوا، ان کی شاداب تحریروں نے عوام کے مردہ احساس میں جان ڈالدی۔ بالآخر ایک دن آیا کہ عوام نے اس ناپاک ظالمانہ نظام کی گوناگوں خرابیوں سے نالاں ہو کر بغاوت کردی اور فرانس کی مشہور بوربن عوام کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔

انقلابِ فرانس کے اثرات دنیا پر۔ انقلاب فرانس اپنے جلو میں جمہوری آزادی اور مساوات کا تخیل لیکر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام دنیا میں جمہوریت کی بادبہاری چلنے لگی۔ مطلق العنان حکمرانی کی تار پود بکھرنے لگی۔ غلام اور پس ماندہ ممالک کو اپنی غلامی کا احساس ستانے لگا۔ عوام الناس یہ محسوس کرنے لگے کہ حاکمیت (Sovereignty) میں وہ بھی شریک اور سہیم ہیں۔ اسی احساس کی بدولت تمام دنیا میں انقلابی تحریکیں چلنے لگیں۔ حکومت کی بوسیدہ شکلیں بدلنے لگیں اور ان کی جگہ عوام کی حکومت کا تخیل پروان چڑھنے لگا۔ اس کے بعد دنیا میں ایک نیا سماج پیدا ہوا جو فرد اور اجتماع کی آزادی پر قائم تھا۔ لیکن عوام کی حکومت کے بعد بھی عوام کے مصائب کا علاج نہ ہوسکا۔ سائنس کی ترقی نے بہت جلد عوام کو پھر غلام اور دستِ نگر بنا کر رکھ دیا اور یہ غلامی پہلی غلامی سے زیادہ بھیانک اور خطرناک تھی اور اپنے نتائج میں شخصی حکومت کے مصائب سے کسی طرح کم نہ تھی۔

صنعتی انقلاب | عین اسی زمانہ میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) رونما ہوا، اس سے معاشی زندگی اور تمدنی زندگی میں ایک زبردست تغیر واقع ہوا، غلام سازی کے کارخانے سیاست کی طرف سے رخ پھیر کر معیشت میں لوگوں کو اپنا غلام بنانے لگے۔ شخصی آزادی کے تصور پر نظام سرمایہ داری کی تعمیر ہونے لگی، مشینوں کی ایجاد اور کثیر پیداواری (Mass Production) کے امکانات نے غیر معمولی قوت بہم پہنچا دی۔ سرمایہ دار طبقوں نے شخصی آزادی اور اصول آزادی صنعت وحرفت کی آڑ میں انھوں نے بڑے بڑے صنعتی ادارے قائم کئے۔ صنعت وحرفت کے نئے مرکز رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر بن گئے۔ دیہات اور مفصلات سے لاکھوں کروڑوں انسان کھنچ کھنچ کر ان شہروں میں جمع ہوتے چلے گئے۔ زندگی حد سے زیادہ گراں ہوگئی۔ مکان، لباس، غذا، اور تمام ضروریات زندگی پر آگ برسنے لگی۔ اور ایک ایسا سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آگیا جس کے پنجے عوام پر شخصی مطلق العنان حکمرانوں سے زیادہ سخت تھے اور معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ آزادی صنعت وحرفت اور حریت شخصی کے اس تصور پر جس نظام سرمایہ داری کی بنا اٹھائی گئی تھی اس نے فرد کو ہر ممکن طریق سے دولت کمانے کا غیر مشروط اور غیر محدود اجازت نامہ دیدیا تھا اور نئے فلسفۂ اخلاق نے ہر اس طریقہ کو حلال اور طیب ٹھیرایا جس سے دولت کمائی جا سکتی ہو خواہ ایک شخص کی دولت مندی کتنے ہی اشخاص کی تباہی کا نتیجہ ہو۔

انھیں حالات میں مارکس نے جنم لیا جس نے نظام سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور آزادی صنعت وحرفت کے اس اصول کی بڑی شدت سے مخالفت شروع کی جس کی آڑ میں سرمایہ دار دنیا کو لوٹ رہے تھے۔ اور علی الاعلان اس نے نظام سرمایہ داری کے اس ستائے ہوئے اور تباہ حال طبقے کی نمایندگی شروع کردی جس کو "مزدور" کہا جاتا ہے۔ ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث باب معیشت میں کریں گے۔ لیکن چونکہ مارکس کا ذکر خیر کرنا تھا اس لئے ہم نے بطور پس منظر کے ان حالات کا

بھی ذکر کردیا جن میں مارکس نے جنم لیا۔

مارکس اوپر کی سطور میں ہم نے مغرب کے امام سیاست مکیاویلی کا ذکر کیا ہے اور اس کے فلسفہ پر بھی ایک مختصر سا تبصرہ کردیا ہے۔ جس طرح ہم مکیاویلی کو ایک گمراہ اور باطل پرست انسان سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات کو انسانیت اور اخلاق کا ھادم گردانتے ہیں اسی طرح مارکس کو بھی انسانیت اور اخلاق کا دشمن اور بدترین مخالف سمجھتے ہیں اور اس کو ائمہ ضلال کی اس صف میں شامل کرتے ہیں جنھوں نے دنیا اور دنیا کے بسنے والوں کو گمراہ کیا اور جن کے وجود نے اخلاق اور انسانیت کو بہت ہی نقصان پہنچایا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مارکس مذہب و اخلاق کا دشمن کیوں تھا؟ اس کے مختلف اسباب تھے۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ مارکس کا نظریۂ کائنات اور نظریۂ انسانیت سراسر مادی اور لادینی ہے وہ انسان کو ایک معاشی حیوان سمجھتا ہے جو اپنی روٹی کے حصول کے لئے اخلاق، مذہب کا پابند نہیں ہے اس کے نزدیک انسان کا اعلیٰ تخیل یہی ہے کہ وہ کھائے اور عیش کرے اور فلسفہ میں وہ فیورباخ (Feverbch) اور ہیگل کا شاگرد ہے یہ دونوں کے دونوں دہریہ اور سخت قسم کے مادہ پرست تھے۔ مارکس کے نزدیک کسی خدا، کسی اخلاق، کسی مذہب کا وجود نہیں ہے یہ سب سرمایہ داروں کے ڈھکوسلے ہیں۔ مارکس اول و آخر مادی تھا اور مادی نقطۂ نظر اس کے یہاں ہر چیز میں نمایاں ہے اس کے نزدیک انسانی تاریخ اس دور کے سوا جب زندگی عہد طفولیت (State of Nature) میں تھی۔ معاشرتی طبقوں کی باہمی جنگ کی داستان ہے۔ وہ اقتصادی پہلو کے سوا انسانی زندگی کے اور دوسرے پہلوؤں کے اثر اور اہمیت کا منکر ہے، وہ دین و مذہب، اخلاق و کردار کو کسی حیثیت سے کوئی موثر عنصر نہیں مانتا اور نہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے کہ ان کو انسانی تاریخ کے بناؤ اور بگاڑ میں کچھ دخل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تاریخ کے مشہور واقعات، جنگیں، بغاوتیں، انقلابات یہ سب

طبقہ داری جنگ (Class war) تھیں جو پیٹ اور معدہ کے لئے لڑی گئیں تھیں۔ اُس کا خیال ہے کہ اخلاق ومذہب اور خدا کا خوف یہ سب سرمایہ داروں کا ہتھیار رہے جو فاقہ مست عوام کو ان کے جائز حقوق کے غصب کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مارکس نے جگہ جگہ ان خیالات کا اعادہ کیا ہے اور اس اشتراکی فلسفۂ اخلاق کی شرح ایک موقع پر لینن نے بہت خوب کی ہے۔ سوویٹ یونین کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگریس (منعقدہ ۲ اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں اس نے جو خطبہ دیا تھا اس کا ایک ضروری ٹکڑا ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"سب سے پہلے میں اشتمالی اخلاق پر گفتگو کروں گا، تمہیں اپنے آپ کو اشتمالی بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ . . . . . . کیا دنیا میں کوئی چیز اشتمالی اخلاق نامی بھی اپنا وجود رکھتی ہے؟ کیا کوئی اشتمالی ضابطۂ اخلاق بھی وجود میں آیا ہے؟ یقیناً ایک اشتمالی ضابطہ اخلاق ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی فلسفۂ اخلاق نہیں رکھتے اور بسا اوقات بورژوا کہا کرتے ہیں کہ ہم تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں، یہ ان کے ہتھکنڈے ہیں، اسی طرح یہ مسائل کو الجھا کر کسانوں اور مزدوروں کی آنکھ میں خاک جھونکا کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہم کن معنوں میں اخلاق اور اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں؟ ہم ان تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں جن کی تبلیغ بورژوا طبقے کی طرف سے کی جاتی ہے اور جو خدا اور وحی کے احکام سے مستنبط ہوتے ہیں، یقیناً ہم کہتے ہیں کہ ہم خدا اور مابعد الطبیعات حقایق پر یقین نہیں رکھتے کہ ارباب کلیسا، زمیندار اور بورژوا سب اللہ کے نام پر بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں تاکہ اپنے غاصبانہ حقوق کی حفاظت کر سکیں۔

ہم ان تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں جو ما فوق البشر تصورات سے ماخوذ ہوں، یا طبقاتی تصادم پر مبنی نہ ہوں، ہمارا ضابطۂ اخلاق تمام وکمال طبقاتی تصادم اور پرولتاریہ کے مفاد کا تابع ہے، پرولتاریہ کے طبقاتی تصادم اور ان کی ضرورتوں پر ہم اپنے ضابطۂ اخلاق کی

بنیاد رکھتے ہیں۔"

"پرانا سماج غریبوں اور مزدوروں کے نوچ کھسوٹ پر اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کی سرپرستی پر قائم ہے ہمیں اس سماج کو تباہ کرنا ہے ہمیں ان زمینداروں اور سرمایہ داروں کا تختہ الٹنا ہے، لیکن اس کیلئے تنظیم کی ضرورت ہے، خدا ایسی تنظیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ ضابطۂ اخلاق جو انسانی سماج کے باہر سے لیا گیا ہو۔ ہمارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہ ایک ڈھونگ ہے، ہمارا ضابطہ اخلاق پرولتاریہ کے مفاد کا تابع ہے۔[1]"

مارکس مذہب و اخلاق کا شدید مخالف تھا وہ اول تا آخر ملحد تھا، وہ خدا اور آخرت، اخلاق و مذہب کو انسانی زندگی کے آلام اور مصائب کہتا ہے۔ وہ نہ صرف اخلاق و مذہب کو ریاست اور حکومت سے دور رکھنا چاہتا تھا بلکہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی مذہب کو کسی حیثیت میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس کے خیالات پر جس سوسائٹی اور تمدن کی بنیاد پڑی، اس میں طرح طرح کے انسانی مصائب اور مثالب پیدا ہوئے۔ ظلم، ناانصافی، بے حیائی نے عام زور پکڑا اور مارکس کے پیروؤں نے انسانیت پر جو مظالم ڈھائے ہیں اس کی نظیر انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ اور مارکس کی تمام حکمت اور طریقۂ علاج اشتراکی سوسائٹی کے ناسوروں کا علاج کرنے سے قاصر ہے بد اخلاقی، بدچلنی عام ہوگئی، عورت کی عصمت، انسانیت کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔ اور ایک اشتراکی نوجوان کی تعریف ہی یہی ہونے لگی کہ جو اپنے نقطۂ نظر میں انتہا پسند اور انارکسٹ ہو۔ اور اس انتہاپسندی نے نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست اور نظامِ معیشت تینوں کو تباہ اور برباد کر دیا۔[2]

---

[1] Religion. از لینن ص ۷۵، ۸۰۔ [2] اس موقع پر ہم روس میں شہوانیت، فحاشی اور مظالم کی مثالیں محض اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ اب تقریباً ہر شخص کے علم میں یہ باتیں آچکی ہیں۔

اشتراکیت کے نظامِ معیشت پر تبصرہ بعد میں کیا جائیگا۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے انشاء اللہ
بابِ معیشت میں ہم جب جاہلی معیشت پر تنقید کریں گے تو اس پر بھی بحث ہوگی۔

جس سماج میں خدا اور معاد کا عقیدہ نہ ہو، جو معاشرت جزا اور سزا کے تصور سے بے نیاز ہو
جو سوسائٹی اخلاق اور مذہب کو جلاوطن کر چکی ہو اس کو اخلاقی انحطاط سے کون بچا سکتا ہے؟ جب
مذہبی اخلاق نہیں تو پھر پابندیاں کہاں؟ آزاد جوڑے برملا، بلا روک ٹوک گل چھرے اڑانے لگے
روسی انقلاب کے بعد اشتمالی نوجوانوں میں یہ روگ اتنا بڑھا کہ خود اشتمالی لیڈر اس انجام سے
گھبرانے لگے اور انھوں نے اپنے پیروؤں کو اس اخلاقی انحطاط سے روکنے کی کوشش کی، لیکن
اوپری تدبیریں کچھ کام نہیں دیتیں جب تک کہ جڑ کا استیصال نہ کیا جائے۔ ان اشتمالی لیڈروں کو
روس کے نوجوانوں نے یہ طعنہ دیا کہ نیا روس پھر پرانے اخلاقی ضابطوں کا قائل ہوا ہے۔

مشہور اشتراکی ایم۔ ار۔ مسانی اپنی کتاب (Soviet Side Light) میں لکھتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ مسٹر ایم جوشی ([illegible] C.[illegible]) اور ان جیسے بعض اصحاب یہ خیال کرنے
لگے ہیں کہ روس کے اشتمالی لیڈر اپنے [illegible] نظریوں سے پھر رہے ہیں، اور ایک ایسی سوسائٹی کا
تخیل (جس میں شادی، کنبہ اور خانہ داری کے جھنجھٹ نہ ہوں) ان کے دماغوں سے نکل رہا ہے، یہ لوگ
سمجھتے ہیں کہ روس پھر انہی پرانے اخلاقی ضابطوں کی طرف لوٹ رہا ہے جو انقلاب کے سیلاب میں
خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی سماجی اور صنفی آزادی کے بے جا
اور انتہا پسندانہ استعمال کے روک و تھام کا خیال پیدا ہو گیا ہے لیکن اس رجحان سے یہ خیال کر لینا
کہ روس پھر پرانے اخلاقی ضابطوں کی طرف لوٹ رہا ہے ایسا ہی غلط ہو گا جیسے یہ سمجھنا کہ سویٹ
یونین پھر سرمایہ دارانہ نظام کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔

یہی مصنف دوسری جگہ اس "صنفی آزادی" کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مردوں کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی اب آزادی سے متمتع ہو رہے ہیں، عورت اب محض جائداد منقولہ (Chattel) نہیں رہ گئی ہے، اس نے آزاد انسانیت کے تمام حقوق حاصل کر لئے ہیں، شادی اور طلاق کے قوانین اس پرگواہ ہیں عصمت فروشی کا کامیاب خاتمہ اس انقلاب کا ایک نمایاں مظہر ہے[1]۔"

عجیب بات ہے کہ یہ اشتراکی مصنف اس بات کو بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ روس میں اب چکلے اور بالاخانے موجود نہیں ہیں۔ بالاخانوں اور چکلوں کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں پوری سوسائٹی زانی اور زانیہ نہیں ہے بلکہ ایک طبقہ ایسا ضرور ہے جو اپنی خواہشات کی تسکین جاکر زنان بازاری کے یہاں کرتا ہے جیسے ہندوستان اور دوسرے ممالک۔ لیکن جہاں کا ہر شخص زانی اور زانیہ ہو، جہاں آزادانہ فحاشی ہوتی ہو، پھر وہاں اس کی کیا ضرورت ہے؟ امریکہ، فرانس اور روس میں اب کیا ضرورت ہے کہ سوسائٹی کا ایک طبقۂ خاص یہی خدمت انجام دے۔

الحاد کے اسٹیج پر اب ایک نئی شخصیت نمودار ہوتی ہے جو عقل سے، فطرت سے، علم الاقوام سے، الحاد و بے دینی کو انسانی زندگی کا غایت اور مقصد قرار دیتی ہے اور جس کے پرزور دلائل عیسائی علم الکلام اور کلیسائی جبر و استبداد کے پرخچے اڑا دیتے ہیں۔ یہ شخصیت مکیاویلی سے متاخر اور مارکس سے پیشرو ہے۔

ڈاروِن (۱۸۰۹-۱۸۸۲)

ڈاروِن سے پہلے یورپ نے الحاد اور مادیت کی راہ تو اختیار کر لی تھی لیکن ان کے الحاد کے لئے باقاعدہ کوئی علمی اور عقلی دلیل نہ تھی۔ لیکن جب ڈاروِن نے اپنا مشہور اور معروف نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) دنیا کے سامنے پیش کیا تو یہی موقعہ تھا کہ یورپ کے فلسفۂ الحاد کو دلائل اور منطق کا سہارا مل گیا اور یورپ کا الحاد جو بے سہارا

---

[1] اباحت مطلقہ کے بعد پھر طوائفوں کی کیا ضرورت ہے؟

چل رہا تھا ایک لکڑی کا پاؤں دیا اور یورپ نے اسے لپک کر لے لیا اور نہ صرف سائنس میں بلکہ اپنے تمام شعبوں میں فلسفہ اخلاق اور علوم عمران تک میں اس کے اس نظریہ کو قبول کیا گیا۔ مادیت اور الحاد کے دیرینہ خواہش مندوں کو نظری اور علمی دلائل کا ایک گوہر مقصود ہاتھ آگیا۔

۱۸۵۹ء میں جب ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) شائع ہوئی تو الحاد کے تمام اسکولوں نے اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ جانور ہے جو کسی خاص مقصد اور غایت کے ساتھ نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اپنے ہزاروں سال کے نوعی سفر میں منزل بمنزل درجہ بدرجہ بتدریج بڑھتے بڑھتے انسانی شکل کو پہنچا ہے۔ اس کتاب نے سارے یورپ کی توجہ کو اپنی طرف پھیرا اور ڈارون کا یہ نظریہ وقت کا سب سے اہم اور بڑا موضوع بن گیا۔

اس نظریۂ ارتقا نے انسانی زندگی کے مسائل پر غور کرنے کا زاویہ ہی بدل دیا اور حیوانات کی تاریخ نشو و ارتقا اور ان کے عادات و اطوار اور خصائص سے کافی دلچسپی پیدا کر دی۔ اس نظریہ نے آسمانی اور الہامی صحیفوں کے اس نظریہ کو کہ اس دنیا میں انسان ایک جوڑے کی اولاد ہے اور ایک خاص مقصد اور اسکیم کے مطابق پیدا کیا گیا ہے کی تغلیط کر دی اور لوگوں کو یہ اعتقاد دلایا کہ یہ کائنات بغیر کسی غیر طبعی طاقت کی مداخلت کے چل رہی ہے اور طبیعی قوانین کے علاوہ اس کی کوئی علت نہیں۔ موجودات عالم زندگی کے ابتدائی مراتب سے انتہائی مراتب تک ایک ایسے تدریجی ارتقا کے ساتھ چل رہے ہیں جس میں عقل و حکمت کا کچھ دخل نہیں ہے۔ کسی صاحب عقل خلق و امر ہستی کا وجود نہیں جو کچھ ہو رہا ہے فطری قوانین و ضوابط کے ماتحت ہو رہا ہے۔ یہ نظریہ اپنے اصولوں، نتائج ذہنی اور عملی اثرات میں دین اور مذہب کے نہ صرف خلاف ہو بلکہ اس کا سب سے بڑا دشمن ہے اور دنیا میں اتنا مدون فلسفہ الحاد کبھی بھی اختراع نہیں کیا گیا۔

شروع شروع میں جب اس نظریہ کی اشاعت کی گئی تو اہلِ مذاہب نے اس کی بڑی شدید مخالفت کی تکفیر اور تفسیق کے تمام اسلحے استعمال کئے گئے لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ اگر علمی اور عقلی حیثیت سے آپ ڈارون کے منہ کو نہیں بند کر سکے تو تکفیر و تفسیق کی توپیں کیا کام دے سکتی تھیں؟ پھر جبکہ دنیا کا مزاج اس کو قبول کرنے کیلئے آمادہ بھی ہو۔ ڈارون کے اس نظریہ کا تمام تر ماخذ و استدلال علم الاقوام اور علم الآثار ہیں۔ ضرورت تھی کہ علم الاقوام اور علم الآثار ہی سے اس کے نظریہ کی تغلیط کی جاتی اور اسے بتایا جاتا... کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ عقل اور ہوش سے اگر مذہبی حضرات کام لیتے تو ناممکن تھا کہ ڈارون بغیر رسوا ہوئے دنیا سے جاتا۔ لیکن گالیوں سے کوئی چیز غلط نہیں کی جا سکتی جب تک دلائل کا توپ خانہ آگے نہ ہو[1]۔

نظریۂ ارتقاء کا اثر انسانی زندگی پر

نظریہ ارتقاء نے خیالات، تہذیب و سیاست غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں پر بڑا گہرا اور وسیع اثر ڈالا، عہدِ فطرت کی طرف بازگشت کا خیال، عریانی اور زناقیت کی اشاعت، اس شجرِ غیر صالح کے نتائج تھے۔ لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ جب انسان جانور ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے اندر تمام جانوروں کی خصوصیات پیدا کرے۔ جب اس کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ کھائے پیئے اور خوش رہے اور اپنی صنفی خواہش کو بے قید رکھے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ نکاح کا بارِ گراں اپنے سر پر اٹھائے پھرے۔ جب جانور اپنے لئے نکاح نہیں پسند کرتے اور ہر صنف سے بوقتِ ضرورت تمتع کر لیتے ہیں تو پھر انسان ہی کیوں مجبور ہے کہ وہ زندگی بھر کے لئے ایک پابندی کا جوا اٹھائے پھرے؟ تفصیلی بحث تو نظامِ معاشرت میں کی جائے گی۔ یہاں ہم نے اشارۃً ارتقاء کے اثرات

---

[1] علمی حیثیت سے ڈارون کے نظریہ کی تغلیط ڈاکٹر عمر الف بہرن نے کی ہے۔ اس موضوع پر میرے مطالعہ میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے کوئی اچھی کتاب نہیں آئی۔ اس نومسلم جرمن ڈاکٹر نے علم الاقوام سے ڈارون کے مفروضات اور مغالطات کی تردید کی ہے۔ کتاب کا نام ہے "علم الاقوام"

کو بیان کردیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ نظریۂ ارتقار نے انسان ایسی اشرف مخلوق کو جس کے کندھوں پر خدا نے امامت اور قیادت کا بار گراں رکھا ہے جس کو خدا نے اپنی مقدس تعلیمات کا حامل بنایا ہے، اس زمانہ جدید میں آگروہ حیوان بننے میں فخر اور عزت محسوس کرتا ہے۔ نظریہ ارتقار کے اثرات اور مقبولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے جارج برناڈشا نے کیا مزے کی بات لکھی ہے:۔

"ڈارون کے پیش کردہ نظریہ سے ہر وہ جماعت خوش ہوئی جو اپنے جداگانہ اغراض رکھتی تھی، جنگ کے حامیوں سے لیکر اشتراکیت پسندوں اور سرمایہ داروں تک نے اس نظریہ کا خیر مقدم کیا۔ اشتراکیوں کو یہ نظریہ اس لئے بھی پسند آیا کہ اس میں ماحول کے اثرات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اگر لامارک کے خیال کے مطابق لمبی گردن کی خواہش اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے مخلصانہ سعی وعمل سے واقعتاً اونٹ کی گردن لمبی ہوسکتی ہے تو پھر انسان بھی اپنی سیرت وکردار کو جن سانچوں میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ ڈارون نے ان سب خیالات کا صفایا کردیا اور انواع کے ارادوں اور خواہشات کو ماحول کی قوتوں کے سامنے عاجز اور بے بس قرار دیا۔ سرمایہ دار طبقہ اس نظریہ کا اس لئے دلدادہ تھا کہ اس میں تنازع للبقار (Struggl for existonee) اور بقار اصلح کے تصور کو پیش کیا گیا تھا اور بنی آدم" اعضار یکدیگر اند" کے اصول کو باطل ٹھہرایا گیا تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کمزور کی شکست وبربادی اور طاقت ور کی فتحمندی فطرت کا ایک ازلی قانون ہے۔"

مسٹر شا نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ نظریہ ارتقار یورپ کے تمام الحادی نظریوں کی تقویت کا باعث ہوا، اشتراکیت نے اس نظریہ سے اپنے دلائل کو مضبوط کیا، سرمایہ داروں نے اپنے وجود کو برحق ثابت کرنے کیلئے اسے فطرت کا ایک ازلی اصول گردانا۔ صنفی انارکی کے حامیوں نے اپنے نظریہ کے جواز میں اس سے استدلال کیا۔ غرضیکہ انسانی زندگی کے تمام گوشے اس سے متاثر ہوئے اس لئے ہم ڈارون کو انسانیت کیلئے ایک لعنت سمجھتے ہیں اور اسے شیاطین کا ابوالآبار کہنے میں ہم حق بجانب ہیں۔ (باقی)

اشاعتِ اسلام

کے

اسباب ڈاکٹر لیبان کی نظر میں

از جناب سید محبوب رضوی صاحب دارالعلوم دیوبند

ڈاکٹر گستاؤ لیبان (G. Liban.) فرانس کا نہایت نامور مشہور فاضل مستشرق گزرا ہے اس نے فرانسیسی زبان میں عربوں کے تمدن و معاشرت پر (Civilizationdes Arabes) کے نام سے انیسویں صدی کے آواخر میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ہندوستان کے مشہور علم دوست فاضل سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے عنوان سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۹۶ء میں آگرہ میں چھپا تھا اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر لیبان کی یہ کتاب اسلامی لٹریچر میں نہایت مہتم بالشان گراں قدر اور معرکۃ الآراء تصنیف ہے فاضل مصنف نے مسلمانوں کے حالات، تہذیب تمدن، معاشرت اور عمارات و آثار قدیمہ کو بچشم خود دیکھا ہے اور عربوں کے طبعی خصائص ظہور اسلام کی کیفیت، اشاعت اسلام کے اسباب و علل اسلامی سلطنت کی وسعت اور اس کے عروج و انحطاط غرضیکہ ایک ایک تاریخی، معاشرتی اور تمدنی واقعہ کو دیکھ کر نہایت قابلیت کے ساتھ محققانہ و مورخانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس پر بحث و نظر کرکے ایک غیر متعصبانہ رائے قائم کی ہے حصول مواد کے لئے لیبان نے عام مغربی مورخین کے برعکس ممالک عربیہ اور بالخصوص اندلس (Hispania.) کی سیاحت کرکے بچشم خود ان تمام چیزوں کو دیکھا ہے اور براہ راست

مواد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیبان نے سیاسی اور جنگی واقعات کا ذکر بہت ہی سرسری طور پر کیا ہے۔ اس کا اصل موضوع بحث مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو پیش کرتا ہے۔ اس کیلئے لیبان نے ہر قسم کی تصاویر بکثرت بہم پہنچائی ہیں اور ان کے ذریعہ سے تمدن کے خصائص الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے مصور و متشکل بنا کر پیش کئے ہیں۔ ان تصاویر کے ذریعہ سے جو بات بیک نظر ذہن نشین ہو جاتی ہے وہ الفاظ کے ذریعہ سے بمشکل سمجھ میں آسکتی تھی۔

تمدن عرب چھ حصوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک حصہ میں متعدد ابواب ہیں اور ہر ایک باب میں کئی کئی فصلیں ہیں۔ قبل اسلام عرب کے جغرافیہ اور تاریخ سے ابتدا کی گئی ہے، بعثت قرون اولی اور مسلمانوں کے زمانۂ عروج اور عہد اقبال کے تمدن پر نہایت جامعیت کے ساتھ سیر حاصل تفصیلی مباحث کئے گئے ہیں اور پھر آخر میں بتلا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ مصنف کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت کیا تھی۔

تمدن عرب میں لیبان نے جا بجا "اشاعت اسلام" کے اسباب پر بھی بحث کی ہے اور اس بارے میں اس نے جو رائے قائم کی ہے وہ اُس رائے سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے جو یورپ کے مصنفین بالعموم ازراہِ تعصب و تنگ نظری بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر لیبان نے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "اشاعت اسلام" کے متعلق یورپ کے مصنف جو کچھ سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اس کی نسبت لیبان نے تمدن عرب کے مختلف مقامات پر اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، تاریخ کے ان حقائق سے آپ کو فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بدولت اسلام صرف ایک صدی میں دنیا کا ایک عالمگیر مذہب بن گیا تھا اور دنیا کی جو قومیں گروہ در گروہ ——————

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔   اور تونے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق درجوق داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

کی تعبیر بن کر اسلام میں داخل ہوئیں۔ اُن کے جذب وکشش کا سبب کیا تھا اور پھر ان اقوامِ عالم کے عادات ومعتقدات، اوضاع ورسوم اور فکر ونظر پر اسلام کا جو مخصوص اثر مرتب ہوا وہ دنیا کی تاریخ میں کتنا گہرا اور پائیدار ثابت ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ جب بھی کسی شخص نے ذہنی تعصبات سے بالاتر ہو کر سکونِ خاطر کے ساتھ اسلام کی تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہے جو لیبان کے پیش کردہ نتائج ہیں۔ موسیو لیبان نے اسلامی تاریخ کے جن واقعات سے یہ نتائج استخراج کئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

"بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیرانِ اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیسا نرم سلوک کرتے تھے، یہ سلوک اُس معاملہ کے مقابلہ میں جو صلیبیوں نے اسی شہر کے باشندوں کے ساتھ کئی صدی بعد کیا نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے اور آپ نے سفرونیس (Sophronius) بطریق سے درخواست کی کہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہمراہ چلے۔ اُسی وقت حضرت عمرؓ[سلہ] نے منادی

سلہ جس منادی کے اعلان کا لیبان نے اس مقام پر حوالہ دیا ہے اُس معاہدہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمرؓ نے بیت المقدس کے لوگوں کو دی ہے۔ اس امان کا تعلق ان کی جان ومال، کلیسہ، صلیب، تندرست اور بیمار اور تمام مذہب والوں کیلئے ہے۔ اس طرح پر کہ ان کی عبادت گاہوں میں نہ سکونت کی جائیگی نہ وہ منہدم کئے جائینگے حتی کہ اُن کے احاطہ وغیرہ کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائیگا۔ ان کی صلیبوں اور مال میں کمی نہیں کی جائیگی۔ مذہب کے بارے میں بھی ان پر کوئی جبر نہ ہوگا۔ ان میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں

کرادی کہ میں اس امر کا ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کی جان ومال اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کیا جائے گا اور مسلمان عیسائیوں کے گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جو سلوک عمرؓ (ابن عاص) نے مصریوں کے ساتھ کیا وہ بھی اس سلوک سے کم نہ تھا انھوں نے باشندگانِ مصر سے وعدہ کیا کہ انھیں مذہب کی پوری آزادی، کامل انصاف اور جائیداد کی ملکیت کے مکمل حقوق بلا روک ٹوک حاصل ہوں گے اور ان ظالمانہ اور غیر محدود ٹیکسوں کے عوض میں جو شہنشاہانِ یونان ان سے وصول کیا کرتے تھے صرف ایک سالانہ جزیہ لیا جائیگا جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپیہ تھی۔ رعایائے صوبجات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہدو پیمان میں شریک ہو گئے اور جزیہ کی رقم انھوں نے پیشگی ادا کردی۔ عمالِ اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے کہ انھوں نے اُس رعایا کے ساتھ جو ہر روز شاہنشاہ قسطنطنیہ کے عمالوں کے ہاتھوں سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتی تھی اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے بہ کشادہ پیشانی مذہب اسلام اور عربی زبان کو قبول کر لیا۔ میں بار بار کہوں گا کہ یہ وہ نتیجہ ہے جو ہرگز

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) پہنچایا جائے گا۔ بیت المقدس میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے۔ بیت المقدس کے لوگوں کا فرض ہوگا کہ وہ اطاعت کریں اور دوسرے شہروں کی طرح جزیہ دیں۔ یونانیوں کو شہر سے نکالدیں۔ یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان ومال کو اس وقت تک امن ہے جب تک وہ جائے پناہ میں نہ پہنچ جائے۔ لیکن جو یونانی بیت المقدس ہی میں رہنا چاہے اس کیلئے بھی امن ہے البتہ اس کو جزیہ دینا ہوگا۔ بیت المقدس کے لوگوں میں سے جو شخص یونانیوں کے ساتھ جانا چاہے تو وہ جا سکتا ہے جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر اللہ کا، رسول اللہ، خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں اس معاہدہ پر خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان گواہ ہیں۔ ۱۵ھ میں لکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری فتح بیت المقدس)

بزور شمشیر حاصل نہیں ہوسکتا اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے مصر پر حکومت کی وہ ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ (ص ۱۳۲-۱۳۳)

عربوں سے پہلے مصریوں نے ایک ہی مرتبہ اپنے مذہب کو بدلا تھا اور وہ اس زمانہ میں جبکہ قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ملک میں غارت گری برپا کی تھی اور تمام پرانی یادگاروں کو برباد اور منہدم کردیا تھا۔ اور پرانے مصری معبودوں کی پرستش کو ایسا جرم ٹھیرایا تھا جس کی سزا موت تھی مصریوں نے اس مذہب کو جو اس قدر جبر کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا بادل ناخواستہ منظور تو کر لیا مگر قبول نہیں کیا تھا۔ اور آگے چل کر جس سرعت کے ساتھ انھوں نے عیسائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جابرانہ مذہب کا تسلط ان کے قلوب پر کس درجہ کمزور تھا۔

جو اثر عربوں نے مصر پر ڈالا وہی انھوں نے افریقہ، شام، ایران وغیرہ دوسرے ممالک مفتوحہ میں بھی پھیلایا۔ ان کا تسلط نہ فقط ہندوستان تک پہنچا جہاں سے وہ محض گذر گئے تھے بلکہ چین تک بھی پھیل گیا جہاں صرف اُن کے تاجروں کا گزر ہوا تھا۔

ممالک شرقیہ پر بہت سی اقوام نے تسلط حاصل کیا، ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ نے وقتاً فوقتاً حکومت کی اگرچہ ان اقوام کا سیاسی تسلط ہمیشہ قوی رہا مگر ان کا تمدنی اثر عموماً بہت ہی خفیف تھا، باستثنا اُن شہروں کے جن میں وہ قائم ہوئے وہ نہ اپنے مذہب کو جاری کر سکے نہ اپنی زبان کو نہ اپنے فنون حرفت کو۔ مصر کا ملک، خاندان بطلیموسیہ اور رومیوں دونوں کے وقت میں اپنی اُسی قدیم حالت پر قائم رہا اور یہاں خود فاتحین نے اپنی مفتوحہ قوم کی زبان، مذہب اور طرز تعمیر اختیار کر لیا۔ وہ عمارات جن کو سلاطین بطلیموسیہ نے بنایا اور جن کی رومی قیصروں نے تجدید کی ہمیشہ فراعنۂ مصر کے طرز پر تعمیر ہوتی رہیں جس نتیجہ کو یونانی، ایرانی، اور رومی مشرق

میں حاصل نہ کرسکے تھے وہ عربوں نے نہایت سرعت کے ساتھ اور بلا جبر حاصل کرلیا۔ بظاہر مصر وہ ملک معلوم ہوتا تھا جس میں ایک غیر قوم کے خیالات کا قائم ہوجانا نہایت دشوار تھا۔ تاہم عمروؓ (ابن عاص) کی فتح سے ایک صدی کے اندر ہی مصر کا ملک اپنے سات ہزار برس کے تمدن کو بھول گیا اور اس نے ایک نیا مذہب، نئی زبان اور نئی صنعت اس استحکام کے ساتھ اختیار کرلی کہ یہ چیزیں ان ملک گیروں کے بعد بھی جنھوں نے ان کو جاری کیا تھا قائم اور باقی رہیں۔

تاریخِ عالم میں کسی قوم کے اثرات کی اس سے زیادہ، صاف اور صریح مثال موجود نہیں ہے کل اُن اقوام نے جن سے عربوں کو کام پڑا خواہ وہ چند روز کے لئے ہی کیوں نہ ہو ان کے تمدن کو قبول کرلیا اور جب وہ صفحۂ روزگار پر سے گذر گئے تو خود ان کے فاتحین نے جو ترک و مغل وغیرہ تھے اُن کے تمدن کو اختیار کرلیا اور دنیا میں اس کی اشاعت کے حامی و سرپرست بن گئے۔ کئی صدی سے تمدنِ عرب مرچکا ہے لیکن اس وقت بھی بحر اٹلانٹک سے لیکر دریائے سندھ تک اور بحر متوسط سے ریگستان اور افریقہ تک ایک ہی مذہب اور ایک ہی زبان جاری ہے اور یہ مذہب اور یہ زبان پیغمبر اسلام کا مذہب اور زبان ہے۔ (ص ۵۱۰ لغایۃ ۵۱۲)

ممکن تھا کہ عربوں کی ابتدائی کامیابیاں اُنھیں اندھا کردیتیں اور ان کے ہاتھوں سے معمولی فاتحین کی زیادتیاں کراتیں اور مفتوحہ اقوام پر سختی اور ان کو بزورِ شمشیر اس مذہب کے قبول کرنے پر مجبور کردیا جاتا جسے دنیا میں پھیلانا ان کا اصلی مقصود تھا اگر وہ ایسا کرتے تو کل وہ اقوام جو اس وقت تک مفتوح نہ ہوئی تھیں اُن سے لڑنے کو کھڑی ہوجاتیں۔ عربوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے آپ کو اس خطرناک گرداب سے بچایا جس میں جنگ صلیبی والے کئی صدی بعد شام کی فوج کشی کے وقت گھر گئے تھے۔ اس خوش تدبیری کی بدولت جو نئے مذہب والوں میں کم ہوتی ہے خلفائے راشدین نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ مذہب اور نظاماتِ تمدن بزور

شمشیر جاری نہیں ہوسکتے اور ہم نے دیکھا ہے کہ وہ جہاں کہیں گئے انھوں نے مفتوحہ اقوام کے ساتھ نہایت ملائمت کا سلوک کیا اور ان کو قانون، نظامات اور مذہب کی پوری پوری آزادی دی اور اس امن وامان کے بدلے جس کی انھوں نے اپنے اوپر ذمہ داری لی اُن سے ایک خفیف محصول لیا جو مقدار میں اس محصول سے کم تھا جو وہ پہلے دیتے تھے۔ دنیا میں کبھی ایسے متحمل اور روادار ملک گیر پیدا نہیں ہوئے اور نہ ایسا نرم اور مہربان کوئی مذہب ہوا ہے۔ (ص ۱۲۷)

مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ اگر مسیحی اقوام نے اپنے فاتحین کے مذہب کو قبول کرلیا اور بالآخران کی زبان کو بھی اختیار کرلیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اپنے جدید حاکموں کو ان قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں وہ اس وقت تھے بہت زیادہ منصف پایا، نیز اُن کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا۔ پیغمبر اسلام نے دوسرے مذہب والوں اور علی الخصوص یہود و نصاریٰ سے بے انتہا رواداری برتی ہے۔ یہ اس قسم کی رواداری ہے جو اور مذاہب کے بانیوں میں شاذ ہے اور ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان احکام کی پابندی آپ کے جانشینوں نے کس درجہ کی ہے۔ کل ان مسلم اور غیر مسلم مورخین نے جنھوں نے عربوں کی تاریخ کو بغور پڑھا ہے اس رواداری کا اعتراف کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقوال سے جن کو ہم نقل کرتے ہیں (اور جن کے مثل اور بھی بہت سے اقوال موجود ہیں) معلوم ہوگا کہ ہماری یہ رائے صرف ایک ذاتی رائے نہیں ہے۔ رابرٹسن اپنی تاریخ چارلس پنجم میں لکھتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے جن میں اشاعت مذہب کے جوش کے ساتھ رواداری ملی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ اپنے پیغمبر کے دین کو بزور شمشیر پھیلاتے تھے اور دوسری طرف ان اشخاص کو جو اُسے قبول نہیں کرتے تھے اپنے اصلی ادیان پر قائم رہنے دیتے تھے۔

میشو (Mechaw.) اپنی تاریخ جنگ صلیبی میں لکھتا ہے کہ احکام قرآنی جو مذہب کے

دفاع میں تلوار سے لڑنا سکھاتے ہیں جملہ دینوں سے نہایت رواداری برتتے ہیں۔ ان احکام کی رو سے بطریقوں، راہبوں اور ان کے ملازموں کو "جزیہ" معاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو خاص راہبوں کے قتل کرنے سے ممانعت فرمائی ہے کیونکہ یہ لوگ نماز پڑھنے والے تھے۔ جس وقت حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انھوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا برخلاف اس کے جب صلیبیوں نے اس مقدس شہر کو فتح کیا تو انھوں نے نہایت بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور یہودیوں کو جلادیا۔"

یہی مصنف اپنی دوسری کتاب سفر مشرق میں لکھتا ہے کہ عیسائیوں کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے کہ مذہبی رواداری جو مختلف اقوام میں ایک بڑا قانون مروت ہے، ان کو مسلمانوں نے تعلیم کی ہے۔ یہ بھی ایک ثواب کا کام ہے کہ انسان دوسرے مذہب کی عزت کرے

افاداتِ امام عبدالوہاب الشعرانی

در باب وسعت مطالعہ

از ملک ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی

امام عبدالوہاب الشعرانی (۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء) بن احمد بن علی بن احمد بن .... بن محمد بن موسیٰ بن الامام حنفیۃ بن امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ! جن کے اجداد میں امام محمد (ابن حنفیہ) کے بعد سات پشتوں تک بلا فصل تاجدارانِ تخت و تاج تھے (یعنی) السلطان احمد[1] ابن السلطان سعید[2] ابن السلطان قاشین[3] ابن السلطان محیا[4] ابن السلطان زوفا[5] ابن السلطان ریان[6] ابن السلطان محمد[7] بن موسیٰ بن السید محمد بن الحنفیہ ——— [1]

لیکن بنفسہ امام شعرانی از شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ تھے۔ آپ کے اجداد میں ان تاجدارانِ سبع اصلاب کے تذکرے صرف کتب تاریخ میں رہ گئے مگر امام عبدالوہاب اور اُن جیسے دوسرے بے شمار ——— "شہانِ بے کمر" کے حروفِ حکایات تاریخ میں ثبت ہیں نعا نقاہوں اور منبروں پر سنے جاتے ہیں اور اہلِ علم کے حلقوں میں چرچا ہے۔

افسانہ اُن کے عشق کا مشہور ہو گیا

امام واسع العلم اور کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ صاحبِ واردات تھے اور کتاب و

---

[1] الطائف المنن الکبریٰ للامام عبدالوہاب الشعرانی (صاحب تذکرہ)

سنت کا مذاکرہ کیسے اس نعمت سے محروم رکھتا ہے! "نگہ ناز جسے بھی آشنائے راز کرتی" ہے "اپنی خوبیٔ قسمت پر اُس کا ناز بجا" ہے۔ ان ہی اہل اللہ میں سے امام ممدوح ہیں اور اسی اظہار فخر میں اپنے قال وحال کا کچھ تذکرہ خود زیب قرطاس فرمایا ہے۔ کہ اہلِ علم جسے تحدث بالنعمۃ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کا استدلال آیہ :- فَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ :- سے کیا جاتا ہے برمحل!

ہمارے اربابِ سیر نے پہلے فن رجال کی طرح ڈالی۔ اب اس پر نئی نئی راہیں نکلنا شروع ہوئیں، رجال میں ثقات وحفاظ اور ضعفاء، ومتروکین پر علیحدہ علیحدہ دفاتر بھی قلم بند کیے۔ یہ راہیں پوری طرح قائم ہو چکیں تو اپنے واردات پر اپنے ہی قلم سے لکھا۔ اور جس طرح ضبط رجال صرف ان کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔ اسی طرح اپنے سوانح خود مرتب کرنا بھی مسلمانوں کی اوّلیت ہے لیکن نوع اول میں کسی کو اُن کے بعد یارائے تالیف نہ ہوسکا کہ فن روایت کے مطابق ان نقالانِ مغرب کو اپنی تاریخ وسیرۃ کی حفاظت منظور ہی نہ تھی۔ البتہ قسم ثانی پر ان کی توجہ ہوئی گئی اور اس میں اہلِ مغرب نے کچھ نہ کچھ لکھا بھی تو واردات نہیں بلکہ تجربات سیاسی اور ماحول پر تاثرات!

اور ہمارے اسلاف میں ان حضرات نے اپنے اپنے واردات بغرض اظہار تحدث بالنعمۃ سپرد خامہ فرمائے۔

(۱) شیخ عبدالغافر الفارسی الغزنوی النیسابوری
(۲) الشیخ العلامۃ العماد الکتاب الاصفہانی
(۳) الامام العلامۃ لسان الدین بن الخطیب
(۴) الشیخ ابوعبداللہ القرشی
(۵) الشیخ ابوالربیع المالقی
(۶) الشیخ صفی الدین بن ابی المنصور

(۷) الامام الزاہد ابو شامہ

(۸) الشیخ الامام المقری الفقیہ یاقوت الحموی

(۹) الامام المحدث الحافظ تقی الدین الفارسی

(۱۰) الامام الورع الزاہد ابوحیان

(۱۱) الامام ابن حجر العسقلانی (صاحب فتح الباری)

(۱۲) امام جلال الدین السیوطی

(۱۳) امام شعرانی (عبدالوہاب) الموصوف بالتذکرۃ الصدر[۱]

علمائے ہند میں سے اس نہج خاص پر صرف خاتمۃ العلام امیر الملک نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) نے اپنا تذکرہ بعنوان "ابقاء المنن بالقاء المحن" (اردو) میں لکھا۔ نواب ممدوح کے ماسوا دوسرے علمائے ہند) نے اپنے سوانح وتراجم اپنے قلم سے مرتب کیے۔ مگر اس نہج سے بہت متغائر۔ کہ انہیں صرف یادداشتیں کہیے نہ کہ بطریق تحدث بالنعمۃ! یا بصورت واردات واحوال خود!

امام شعرانی نے علمائے ہند میں شیخ علی متقی برہان پوری (۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء) سے اپنی ملاقاتوں کا معاملہ عجیب انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے یعنی!

"شیخ علی الہندی نزیل مکہ سے ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء میں تعارف نصیب ہوا۔ کبھی میں انکی جائے قیام پر حاضر ہوتا کبھی وہ میرے غریب خانہ پہ تشریف لاتے وہ ایک مقدس عالم تھے۔ بے حد ضعیف ونزار۔ بھوکے رہنے سے ان کے بدن پہ ایک اوقیہ گوشت بھی تو نہ تھا۔ بہت کم سخن۔ بے حد عزلت پسند۔ صرف نماز جمعہ کے لیے

---

[۱] اللطائف المنن الکبریٰ للشعرانی ص (۲)

گھر سے نکلتے اور حرم پاک کی صف کے ایک طرف کھڑے ہوتے۔ بعد ادائے رکعتیں فوراً اپنی قیام گاہ پہنچ جاتے۔"

"فقراکی ایسی جماعت ان کے ہاں تیار تھی۔ صداقت جن کے حال و قال سے ٹپکتی تھی۔ اور سب اللہ تعالیٰ کی طرف راغب۔ ایک تلاوت قرآن میں مصروف ہے۔ دوسرا ذکر میں محو ہے۔ کوئی مراقبہ میں مستغرق ہے۔ بعض مطالعہ میں منہمک ہیں۔ یہ پوری جماعت مکہ معظمہ میں لاثانی تھی" لہ

سُن رکھو اک فسانہ ہیں یہ لوگ!

تعداد تصانیف | امام شعرانی (۷۴) کتابوں کے مولف ہیں جن کا تذکرہ صاحب عقود الجوہر فی تراجم من لہم خمسون تصنیفا فمائۃ فاکثر" میں یکسر جا کر دیا ہے۔ ۲ہ

امام (شعرانی) کے متعلق یہ مضمون صرف ان کے مطالعہ کے تذکرہ میں ہے جسے انہوں نے اللطائف المنن الکبریٰ (اپنے خود نوشتہ واردات) میں زیب قرطاس فرمایا ہے۔ یہ سوانح عمری دو جلدوں میں ہے (حصہ اول در صفحہ ز ۳۱۵) و جلد دوم در صفحہ (۲۸۱)۔ کل صفحات ۶۰۰) باریک ٹائپ (مصری) پر محتوی ہے۔ اور باب "لفظ" و مما من اللہ تبارک و تعالیٰ علیّ" (انعامات الٰہی میں سے ایک انعام مجھ پر یہ ہے) سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح بات سے بات نکلتی آتی ہے اور کس حسن اسلوب سے!

آپ کے مطالعہ کی پوری داستان قلم بند کرنا تو محال ہے۔ امام ـــ نے چند مہمات کتب کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس میں اُن کتابوں کا ماجرا بھی سپرد خامہ کیا۔ جو ایک سے زائد مرتبہ پڑھیں۔ اس پہ

لہ منقول از مشرق ستطام احمد بن حنبلؒ و برحاشیہ کنز العمال العلی المتقی طبع مصر۔ ۲ہ یہ تالیف ہی جمیل بک العظم محاسب المعارف بیروت کی اور مطبع اہلیۃ بیروت ۱۳۲۶ھ میں طبع ہوئی ہے۔

غور فرمائیے۔

(۱) جو کتابیں دو[۲] مرتبہ پڑھیں ! فروع[۱] ابن الحداد۔ التعقبات[۲] (علی المہمات لابن العماد) الخادم[۳]۔ دو مرتبہ پوری کتاب اور بعد میں نصف کتاب مکرر پڑھی۔ شرح[۴] بخاری (للکرمانی) تفسیر[۵] القرطبی۔

(۲) اور یہ کتابیں تین[۳] مرتبہ پڑھیں ! کتاب[۱] الام (للشافعی) اور اس کا اکثر حصہ ضبط ہو گیا۔ شرح[۲] مسند الشافعی (للحاولی) محلی[۳] (ابن حزم) الرافعی[۴] الکبیر قواعد[۵] زرکشی (بعد مطالعہ اس کا اختصار بھی لکھا) تفسیر[۶] خازن تفسیر[۷] الکبیر۔ تفسیر[۸] الصغیر (ہر دو از شیخ عبدالعزیز الدیرینی) تفسیر[۹] در منثور (للسیوطی)

(۳) اور ان کتابوں کا پانچ پانچ مرتبہ مطالعہ کیا ! شرح[۱] البخاری (للبرماوی) شرح[۲] صحیح مسلم (للشیخ زکریا) تفسیر[۳] بیضاوی۔ حاشیہ[۴] علی الکشاف (لابی زرعۃ العراقی) حاشیہ[۵] الشیخ زکریا علی الکشاف (للشیخ زکریا)

(۴) اور سات سات مرتبہ یہ کتابیں پڑھیں ! کتاب[۱] الروضہ۔ تفسیر[۲] ابن عادل

(۵) اور دس[۱۰] مرتبہ ! تفسیر[۱] الکواشی (؟) کا مطالعہ کیا

(۶) اور پندرہ مرتبہ ! شرح[۱] المہذب (؟) شرح[۲] صحیح مسلم للنووی کتاب التہذیب الاسماء والصفات (ایضاً للنووی)

(۷) اور تیس[۳۰] مرتبہ ! شرح[۱] الروض (للشیخ زکریا) تصحیح[۲] شرح المنہاج (از قاضی عجلون) کہ جلال محلی کی شرح المنہاج پر ہے۔ تفسیر[۳] جلالین (للسیوطی)

(۸) اور جو کتابیں صرف ایک ایک مرتبہ مطالعہ میں آئیں ! شرح[۱] شرح الروض (از ابن سولہ) شرح الروض شیخ زکریا کی ہے۔ جس کا مطالعہ تیس[۳۰] مرتبہ کیا اور اس کا تذکرہ اوپر گذرا۔ مختصر[۲] المزنی۔ مسند[۳] امام شافعی۔ مختصر[۴] المحلی (لابن عربی) جو کہ محلی ابن حزم پر ہے۔ اور تیس ضخیم مجلدات میں ہے۔ الحاوی[۵]۔ (از امام ماوردی) تیس مجلدات میں ہے۔ الاحکام[۶] السلطانیہ (؟) الشامل[۷] (لابن الصباغ) المحیط[۸] (از ابو محمد الجوینی) الفروق[۹] (ایضاً للجوینی المذکور) الوسیط[۱۰]۔ البسیط[۱۱]۔ الوجیز[۱۲] (ہر سہ للغزالی) کتاب[۱۳] المطلب

(لابن الرفعہ) "مع مراجعۃ کمال الدین الطویل فی مشکلاتہ" المہمات[14] (للاسنوی) القوت[15] (للاوزاعی) التکملۃ[16] (للسبکی) التمۃ[17] والعجالۃ[18] (ہر دو از ابن الملقن) شرح[19] المنہاج (لابن قاضی شہبہ) شرح[20] الارشاد (لابن الشریف) شرح[21] الارشاد (للجوہری) شرح[22] التنبیہ (للزنکلونی) شرح[23] التنبیہ (لابن الملقن) شرح[24] التنبیہ (لابن یونس) شرح[25] التنبیہ (للسیوطی) قواعد[26] الشیخ الکبری والصغری (للشیخ عز الدین العلائی) القواعد[27] (؟) شرح[28] المنہاج (للجلال المحلی) الاشباہ[29] والنظائر (للسبکی) الالغاز[30] (للاسنوی)

یہ سب فقہ کی کتابیں ہیں اور فرماتے ہیں "وغیر ذلک من الکتب المشہورۃ فی الفقہ وتوابعہ" لیکن مسند الشافعی کا تذکرہ بھی امام ـــــ نے اسی باب میں کر دیا! کہ حدیث میں ہے۔

اور شروح حدیث میں! | شرح[31] البخاری (للقسطلانی) (پوری کتاب یکصد و نصف ایک مرتبہ) فتح[32] الباری (ابن حجر) شرح[33] صحیح مسلم (للقاضی عیاض) شرح[34] الترمذی (لابن المقری المالکی)

واز قسم تفسیرات! | تفسیر[35] بغوی۔ تفسیر[36] ابن زہرۃ۔ تفسیر[37] ابن کثیر۔ تفسیر[38] ابن النقیب (المقدسی) جو ایک[39] سو مجلدات میں ہے اس سے بڑی تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی (مقولہ امام شعرانی) البسیط[40] الوجیز[41] (ہر دو از امام واحدی) تفسیر[42] امام سنید (ـــــ ابن عبداللہ الازدی) کہ امام وکیع[۵] کے شاگرد ہیں۔ امام ـــــ نے اس کتاب کی احادیث و آثار کی تجرید بھی کی۔ تفسیر[43] بحر مواج (لابن حیان) تفسیر[44] کشاف (للزمخشری) اور کشاف پر مندرجہ ذیل (۱۲) حواشی و شروح کا مطالعہ فرمایا۔

حاشیۃ[45] الکشاف (للطیبی) الانتصاف[46] (لابن المنیر) الانصاف[47] (للعراقی) (زمخشری اور ابن منیر دونوں پر محاکمہ ہے۔ ابن منیر نے علامہ زمخشری کے اعتزال کو آشکار کیا ہے اور عراقی ان مواقع کو ظاہر

---

۵ وکیع مشہور صاحب روایۃ ہیں فقہ میں امام ابو حنیفہ۔ امام ابو یوسف۔ اور امام زفر کے شاگرد ہیں لیکن روایۃ میں ابن المبارک یحییٰ ابن اکثم امام احمد بن حنبل۔ ابن معین۔ ابن المدینی جیسے ائمہ فن وکیع کے شاگرد ہیں سال وفات ۱۹۶ھ یا ۱۹۷ھ ہے اور بعض روایات کے مطابق علمائے سندھ سے ہیں۔ اصل میں نیشاپور قتل من السندۃ (الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص (۹۲) مولانا عبدالحی لکھنوی)

کرتا ہے جن میں ابن منیر سے لغزش ہوئی) الاعراب[۴۷] علی الکشاف (احمد بن یوسف الحلبی) ایضا الاعراب[۴۸] علی الکشاف (للسفاقسی) حاشیہ[۴۹] علی الکشاف (للشیخ قطب الدین الشیرازی) حاشیہ[۵۰] علی الکشاف (فخر الدین الجاربردی) حاشیہ[۵۱] (للشیخ اکمل الدین البابرتی) جو صرف سورہ بقرہ پر دو جلدوں میں ہے۔ وحاشیہ[۵۲] (للشیخ سعد الدین) وحاشیہ[۵۳] (للسید الجرجانی)۔ اور کشاف کے متعلق دو کتب حواشی (۱۱–۱۲) (لابی زرعہ وللشیخ زکریا کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے)

اور مدونات حدیث میں ان کتابوں کا مطالعہ کیا! صحاح ستہ[۵۴ تا ۵۹]۔ صحیح ابن خزیمہ[۶۰]۔ صحیح ابن حبان[۶۱]، مسند امام احمد[۶۲]، موطا امام مالک[۶۳]۔ معاجم ثلاثہ طبرانی[۶۴-۶۵-۶۶]۔ الجامع الاصول لابن اثیر[۶۷]۔ الجامع الکبیر[۶۸] الجامع الصغیر[۶۹]۔ کتاب المعجزات[۷۰]۔ الخصائص الکبری[۷۱] (ہر چہار للسیوطی) اور سنن کبری[۷۲] ودلائل النبوۃ[۷۳] (ہر دو از امام بیہقی) امام ــــ نے سنن کبری کا اختصار بھی لکھا۔ المنتقی[۷۴] لابن تیمیہ (مجد الدین) الھدی النبوی (لابن القیم)

اور لغت میں! صحاح[۷۶] (جوہری) قاموس[۷۷] (فیروزآبادی) نہایہ[۷۸] (ابن اثیر)

اور اصول وکلام میں! شرح العضد[۷۹]، شرح منہاج[۸۰] (للبیضاوی) المستصفی[۸۱] (للغزالی) الامالی[۸۲] (للامام الحرمین) شرح المقاصد[۸۳]، شرح الطوالع والمطالع[۸۴]، سراج العقول[۸۵] (للقزوینی) شرح العقائد[۸۶] (للتفتازانی) حاشیہ لابن ابی الشریف

اور کتب فتاوی میں! فتاوی[۸۸] (ابن ابی زید المروزی) فتاوی[۸۹] (للقفال) فتاوی[۹۰] (للقاضی حسین) فتاوی[۹۱] للماوردی۔ فتاوی[۹۲] للغزالی، فتاوی[۹۳] ابن الصلاح، فتاوی[۹۴] ابن عبد السلام، فتاوی[۹۵] اسنوی، فتاوی[۹۶] السبکی، فتاوی[۹۷] البلقینی، فتاوی[۹۸] الشیخ زکریا، فتاوی[۹۹] شیخ شہاب الدین الرملی۔

اور قواعد میں! قواعد[۱۰۰] الشیخ عز الدین الکبری والصغری[۱۰۱]، قواعد[۱۰۲] العلائی۔ قواعد ابن السبکی[۱۰۳]،

قواعد الزرکشی[۱۰۴] (اور اس کا اختصار بھی لکھا)

اور سیرۃ میں! سیرۃ ابن ہشام[۱۰۵]، سیرۃ ابن اسحاق[۱۰۶]، سیرۃ الکلبی[۱۰۷]، سیرۃ ابی الحسن البکری[۱۰۸]،
سیرۃ الطبری[۱۰۹]، سیرۃ الکلاعی[۱۱۰]، سیرۃ ابن سید الناس[۱۱۱]، سیرۃ الشیخ محمد الشامی[۱۱۲]. جسے شامی نے
ایک ہزار کتابوں سے ملخص کیا۔)

اور تصوف میں! التصوف لابی طالب المکی[۱۱۳] - الرعایۃ للحرث المحاسبی[۱۱۴]. الحلیۃ لابی نعیم[۱۱۵]. الرسالۃ
للقشیری[۱۱۶]، العوارف والمعارف للسہروردی[۱۱۷]، الاحیاء[۱۱۸] ـــــ للغزالی. الفتوحات المکیہ لابن عربی[۱۱۹]
(بعد مطالعہ اس کا اختصار بھی لکھا) " ثم اختصرتہا و ـــــ المواضع المدسوسۃ علی الشیخ منہا"
رسالۃ النور للشیخ احمد الزاہد[۱۲۰] ومنحۃ المنۃ[۱۲۱] للسید محمد الغمری، منازل السائرین[۱۲۲] للہروی - وشرح[۱۲۳]
الفصوص (للقاشانی)، وشعب الایمان[۱۲۴] (للقصری[۵])

اب امام شعرانی مائل الی التصوف ہو گئے۔ شیخ علی الخواصؒ کے حلقہ میں شرف حاضری
نصیب ہوا۔ اور مطالعہ و تالیف کے تمام اسباب و اشواق نذر بیعت کرنے پڑے، فرماتے ہیں۔

" مجاہدہ کی صورت یہ قرار پائی کہ میرے مرشد علی الخواص رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ
اپنی تمام کتابیں بیچ کر ان کا زر مبیع مساکین میں تقسیم کر دوں۔ حکم بجا لایا۔ شرح الروض
کتاب الخادم۔ قوت (اوزاعی) جیسی بے نظیر کتابیں علحدہ کرنا پڑیں " (اللطائف ۵۶)

" اور انعامات الٰہی میں سے ایک نعمت مجھ پر یہ وارد ہوئی جیسا کہ مجاہدہ کے بعد
واضح ہوا کہ میرا یہ تمام اندوختہ علم اخلاص نیت کی بجائے حظ نفس کے لیے تھا" (اللطائف ۵۱)

لیکن مواظبت علی النوافل کے بعد یہ انعام ہوا کہ

" قد عملت بحمد اللہ تعالیٰ علی کشف الغطاء عن وجہ الدلالۃ العلوم کلہا

[۵] اور (۲۸) کتابیں جو ایک سے زائد مرتبہ مطالعہ کیں ۲۸ + ۱۲۴ = ۲۵۲

علی الحق تبارک وتعالیٰ حتی صرت احضر بقلبی مع اللہ تبارک وتعالیٰ علم الحساب والھندستہ والمنطق فضلاً عن العلوم الحقیقیۃ الشرعیۃ ومن کشف اللہ تعالیٰ عن بصرہ وبصیرتہ رأی جمیع العلوم التی بایدی الخلائق مقربۃ الی اللہ تعالیٰ وطریقاً الی دخول حضرتہ ولکن اکثر الناس لم یکشف اللہ تبارک وتعالیٰ عن بصیرتہم فلم ینظروا فی العلوم من حیث الوجہ الدال منہا علی الحق تعالیٰ ففاتہم الکمال ولذالک ذم العارفون رضی اللہ عنہم وقالوا ان علوم ھولاء حجاب یحجبہم بہا عن ربہم ولو انہم نظروا فیہا من حیث الوجہ الدال علی الحق لم یحجبہم عن ربہم ونعالوا درجات العارفین" (اللطایف ص۵)

ترجمہ مختصراً بالآخر اُس کی توفیق مساعد ہوئی اور کشف حجاب اس حد تک ہوا کہ مجھے حساب ، ہندسہ اور منطق میں غور کرنے میں معیت باری تعالیٰ حاصل ہو جاتی چہ جائے کہ علوم شریعت سے ۔ کہ وہ تو اس باب میں اصل راہ ہی ہیں"

" لیکن اکثر اہل علم کا یہ حال ہے ۔ کہ علوم شریعت کی مزاولت کے باوجود حقائق دین وکشف حجاب سے دور ـــــ رہتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگوں کے احوال میں عارفین نے کہا ہے ۔ کہ ان کا علم ہی ان کے اور ذات باری کے درمیان حجاب بن گیا ہے !"

" کاش ! یہ لوگ حقیقت علوم پر نظر کرتے ۔ اور عارفین کے درجات تک رسائی حاصل کر سکتے"

اللطائف المنن ـــــ کی تدوین پر منازل ہفت خواں طے کرنے اور یہ کامرانی طے کرنے

کے بعد ہوئی ہوگی! اصلاح حال کے بعد امام غزالی نے پھر کتابیں جمع کی ہوں گی! تجدید مطالعہ فرمائی ہوگی! اب ہمیں اپنے علم و مطالعہ میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے! امام علامقام کے مطالعہ کا تنوع اور اس کی فراوانی دیکھیے پھر اس کی بجائے اُن کی سکینت پر غور کیجیے بالآخر اُن کا اور اپنا مآل علم و مطالعہ دیکھیے وَاٰتُوا کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ

ضروری اعلان

گذشتہ ماہ ستمبر ۴۷ء کے ہنگامہ فساد میں دفتر برہان کی بربادی کی وجہ سے وہ تمام مقالات جو برہان میں شائع ہونے کے لئے رکھے ہوئے تھے اور ان کتابوں کا کل ذخیرہ جو رسالہ میں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی تھیں یہ سب چیزیں ضائع ہو گئی ہیں اس لئے ہم مقالہ نگار حضرات اور ناشرین کتب دونوں سے معذرت خواہ ہیں۔ مقالہ نگار اصحاب کے پاس اگر ان مقالات کی نقول ہوں تو از راہ کرم انہیں بھیج دیں۔ وہ شائع ہو جائیں گے اسی طرح ناشرین کتب حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اگر اپنی کتابوں پر برہان میں اب بھی تبصرہ چاہتے ہیں تو ایک ایک نسخہ کتاب کا اور ارسال فرما دیں۔ آئندہ مہینہ سے برہان میں تبصرہ کا باب پھر سے مستقلاً شروع ہو جائیگا۔

"اڈیٹر"

اسے ہرگز نہ بھولئے

متعدد اخبارات و رسائل میں اعلان و اطلاع کے باوجود بہت سے حضرات اب بھی "قرول باغ دہلی" کے پتہ پر خطوط اور اخبارات و رسائل بھیج رہے ہیں۔ اس طرح ڈاک میں بے ترتیبی اور بد نظمی ہو رہی ہے۔ مہربانی فرما کر اب "قرول باغ" کو بھول جائیے اور اس نئے پتہ پر ہمیں یاد فرمائیے۔

دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد

دہلی

"منیجر"

غالبؔ اور مومنؔ تغزل کی روشنی میں

(جناب مظفر شاہ خاں صاحب، ایم - اے)

غالبؔ اور مومنؔ معاصرین کی حیثیت سے ایک ہی دور ادب کے پروردہ ہیں لیکن دونوں کے تخیل کی رنگینیاں الگ الگ ہیں۔ غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں رنگ بیدلؔ کے اتباع میں، ندرت تخیل، اور شکوۂ الفاظ کی فکر میں اس طرح کھو گئے تھے کہ ان کے کلام میں واردات محبت اور جذبات نگاری جیسی اہم خصوصیات کے پہلو نمایاں نہ ہو سکے۔

قتل عشاق اور رقص بسمل ایک پامال موضوع ہے، غالبؔ نے اپنے ندرت تخیل سے بہت حد تک ایک نئے اسلوب میں پیش کیا، اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی، پھر بھی وہ جذبات اور وجدانیات کو متاثر نہ کر سکے، اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے ... یاں عرصۂ تپیدن بسمل نہیں رہا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ ... عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ... نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

غالبؔ ایک قنوطی شاعر تھے، ان پر یاسیت اس قدر غالب تھی کہ تمام عمر جگر کاوی اور ماتم کاری میں ہی گذری، ان کے ماحول پر عسرت و تنگدستی اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ ان کے جذبات اسی رنگ میں رنگے ہوئے اشعار کی صورت میں ان کی زبان سے نکلتے تھے،

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ میرؔ کے بعد غالبؔ اردو شاعری میں یاسیت اور قنوطیت کے امام سمجھے جاتے ہیں جس طرح فانیؔ عصر حاضر میں۔

یہ قنوطیت ان کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے، جس کا باعث ان کے ماحول کی تباہ کاریاں تھیں۔ جسے غالب ہمیشہ "رستخیز بیجا" سے تعبیر کیا کرتے تھے اور جس نے ان کو یاس و حسرت کا مجسمہ بنا دیا تھا ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے | سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا | رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غرض اس قسم کے سیکڑوں شعر غالب کے یہاں موجود ہیں۔ جنہیں پڑھ کر غالب کے مصائب اور دکھ درد کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی زندگی کا قنوطی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

دوسری اہم خصوصیت اور رجحان جس نے غالب کے تغزل کے اس پہلو کو ابھرنے نہیں دیا وہ ان کا رشک ہے۔ جس میں شعری کیف اور اثر آفرینی کھو گئی ہے ان کے رشک کی حدیں یہاں تک وسعت خواہ ہیں کہ ان کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ؎

قیامت ہے ہوا ہے مدعی کا ہم سفر غالبؔ | وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر | جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں | ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے | ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ غالب کے یہاں تغزل تو ہے لیکن ان کے تغزل میں ان کی ندرت تخیل، طرز ادا اور اسلوب بیان نے جو مشکل پسندی کے خصائص جمع کر دیئے تھے انہوں نے تغزل کی ان کیفیتوں کو، جنہیں جان تغزل کہا جاتا ہے اور سوز و اثر جس کے لازمی نتیجے ہیں، ان کے کلام میں پیدا نہیں ہونے دیا، اگرچہ ان کی ان چند سادہ اور صاف غزلوں میں یہ وصف بھی موجود ہے جو انھوں

نے رنگ بیدلؔ کو ترک کرنے کے بعد کہی ہیں۔ مثلاً

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت غم سے وہ بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

حقیقت یہ ہے کہ ان کی نازک خیالی اور بلند پردازی کی تاب عاشقانہ شاعری نہ لاسکی اسی باعث

ان کا کلام ان کے معاصرین مومنؔ اور ذوقؔ کے مقابلہ میں فروغ نہ پا سکا۔ اس سلسلہ میں سب سے

پہلی چیز ان کے کلام کی بے سوزی وبے کیفی ہے خود مرزاؔ اس حقیقت سے آگاہ تھے چنانچہ اپنے کلام

کی عدم مقبولیت کا الزام زمانہ کی ناآہلیت کے سر رکھ کر انھوں نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ　　نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بررُوئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے　　یاں امتیاز ناقص وکامل نہیں رہا

کبھی اپنے فارسی کلام کو پشت پناہ بناکر کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست

اس خصوص میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے کچھ مرزا ہی کی طرف سے بے پروائی برتی گئی اس لئے

ان کی جدت پسندی مذاق عامہ کا ساتھ نہ دے سکی اس ماحول کی طبائع ذوقؔ کی سادگی وروانی، محاورہ

اور روزمرہ سے آراستہ شاعری کو پسند کرتی تھیں ان کو مومنؔ کا کیف آفریں، روح کی گہرائیوں تک

اتر جانے والا تغزل مطلوب تھا، جس میں معاملہ بندی کے ایسے حسن کارانہ اسالیب موجود ہوں جن

کو سوقیت سے کوئی رابطہ نہ ہو

مومنؔ کے یہاں نازک خیالی کے باوجود ان کا تغزل، ندرت تخیل نادر اور دور از کار تشبیہات

کے پردوں میں چھپا ہوا نہیں ہے ان کے یہاں واردات وجذبات ایک انوکھی طرز ادا کے ساتھ موجود ہیں۔ مومنؔ کے اسلوب بیان میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ بیان کا ایک ٹکڑا چھوڑ جاتے ہیں جس کو پڑھنے والا خود اپنی طرف سے اس کے معنیٰ کے لئے ختم کر لیتا ہے جس کے باعث لطف کلام میں ایک خاص چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں تو مومنؔ خاں کا تغزل، کیا طرز ادا اور کیا اسلوب بیان دونوں حیثیتوں سے اس بلندی پر ہے جسے غالبؔ کی ندرت تخیل اور بلند پروازی بھی نہ دبا سکی اور ان کے بیان کی شوخی اس کی لذت کو پھیکا کر سکی مگر ان کے تغزل کا نمایاں وصف اور اہم پہلو ان کی معاملہ بندی ہے جو جان تغزل ہے یہ وہ دشوار گذار مرحلہ ہے کہ اس راہ میں ایک ہلکی سی لغزش کلام کو متانت اور سنجیدگی سے گرا دیتی ہے۔ ہماری شاعری میں جرأتؔ کی معاملہ بندی مشہور ہے۔ لیکن وہ ان کے طرز ادا اور ان کے علمی افلاس کے باعث سراسر سوقیت بن کر رہ گئی ہے۔ خود مرزا غالبؔ سلامتی فہم کے باوجود جب اس راستہ سے گذرے ہیں اور جب انھوں نے اس نغمۂ تغزل کو اپنے مضراب تخیل سے چھیڑا ہے تو وہ بھی "خارج پردہ" ہو کر رہ گئے ہیں ؎

بوسہ دیتے ہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۔۔۔ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ۔۔۔ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غرض کہ اس قسم کے سیکڑوں شعر غالبؔ جیسے دقیقہ سنج اور نازک خیال شاعر کے یہاں موجود ہیں جس میں ایک ذرا سی بے اعتدالی نے سوقیت پیدا کر دی ہے۔

مگر یہی دشوار گذار مرحلہ مومنؔ کی شاعری کی جان ہے اور ان کا عظیم ترین سرمایۂ فکر، اس معاملہ بندی کو مومنؔ نے اپنے نازک خیال سے اس قدر لطیف اور پرکیف بنا دیا ہے کہ آج تک اس کی لطافت باقی ہے ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ۔۔۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا

ایک دوسری غزل کے چند شعر سنئے ؎

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو — شب عاشق سحر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

اور سنئے ؎

کہتے ہو تم کہ ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
تقدیر ہی بری، مری تقدیر ہی بری — بگڑے جو پرسش سبب اجتناب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

غزل کے حقیقی خد وخال، جذبات محبت، واردات عشق اور وہ معاملات جو اس راہ میں ہر وقت بلاکشان محبت کو پیش آتے رہتے ہیں، اب ان کو اپنی جولانی طبع سے اگر وسعت دے کر تصوف واخلاقیات کے مباحث کا سرمایہ دار بنا دیا جائے تو تغزل کے حقیقی اعتبار سے ان اوصاف اور ان وسعتوں کو تغزل یا عشقیہ شاعری کے تحت میں جگہ دینا اور کمال فن کی دلیل گردانا ارادتمندی یا خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی - آج مرزا غالب کے تغزل اور ان کی رفعت تخیل سے مرعوب ہو کر خواہ ڈاکٹر بجنوری کی طرح غالب کی شاعری اور دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہہ دیا جائے لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ مدحیہ الفاظ کی بلند آہنگیاں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتیں خود ڈاکٹر بجنوری نے محاسن کلام غالب میں غالب کے منتخب اشعار کو بعض اہم فلسفیانہ مباحث کے ساتھ منطبق کیا ہے لیکن ان اشعار میں بھی زیادہ وہ شعر وہی ہیں جن میں تغزل کی روح کا فقدان ہے بلکہ وہ صرف علامۃ الدہر

اخلاق یا حکمیہ خیالات ہیں،

یہاں یہ مدعا نہیں کہ غالبؔ کے تغزل کا سرے سے انکار کیا جائے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ غالبؔ کے تغزل میں تغزل کی اصل روح موجود نہیں ہے اور جہاں کہیں انھوں نے اس کیف کو تخلیق کیا ہے وہاں وہ یا تو سوقیت پر آ گئے ہیں یا بلند پروازی کی فضاؤں میں ان کے پر و بال الجھ کر رہ گئے ہیں، اور وہ کیف بھی کھو بیٹھے جو اس سوقیت میں تھا،

لیجئے اب غالبؔ کے وہ اعلیٰ اشعار بھی سنئے جو ان کے تغزل کے شاہکار یا جواہر ریزے سمجھے جاتے ہیں ؎

تھی وہ اک شخص کے تصور سے ۔۔۔ اب وہ رعنائی خیال کہاں
ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق ۔۔۔ لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقت سفر یاد آیا
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں ۔۔۔ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

ان اشعار کے مقابلہ میں مومنؔ کی معاملہ بندی اور نزاکت تخیل، اسلوب بیان اور ندرت ادا ہے جس نے ان کے سارے دیوان کو جان تغزل بنا دیا ہے، مومنؔ کی ایک مرصع غزل کے چند اشعار سنئے ؎

خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی ہے ۔۔۔ رشک سے کیا برباد آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پہ بنا دے گا ۔۔۔ ان کو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا
دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومنؔ ۔۔۔ ہو رہے ہیں وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

مومنؔ کا کلام ندرت تخیل، نزاکت بیان اور معاملہ بندی کے ساتھ سراسر تغزل کا گنج گرانمایہ

ہے، جس میں انھوں نے اچھوتے اسلوب بیان کے ساتھ عامۃ الورود خیالات عشق و محبت کو جن میں جوش و سرمستی بدرجہ اتم موجود ہے پیش کیا ہے اور باایں ہمہ نزاکت تخیل و ندرت بیان، سوقیت یا ابتذال نام کو نہیں - ان ہی کمالات نے مومن کے تغزل کو ان کے تمام معاصرین خصوصاً غالب سے قرنوں آگے بڑھا دیا اور مرزا باایں سلامتی فہم قدرت بیان میں وہاں تک نہ پہنچ سکے -

---

خلافتِ راشدہ: تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن

قیمت ۱۲؁ مجلد ۱۲؁ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ

۱۹۴۳ء: مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ۸؁ مجلد للعہ

سرمایہ:- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ

ورفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت

کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ۲؁ مجلد ۲؁

خلافتِ بنی امیہ:- تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ۸؁

مجلد ۱۲؁ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ۔

۱۹۴۴ء:- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت

جلد ثانی للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم انبیاء علیہم السلام

کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی۔ للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی ۸؁ مجلد للعہ

۱۹۴۵ء:- قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف

پر جدید اور محققانہ کتاب عا مجلد ۳؁

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان صہ مجلد ۸؁

انقلابِ روس۔ سے

۱۹۴۶ء: ترجمان السنۃ:- ارشاداتِ نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ جلد اول عہ مجلد عہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا نظم مملکت للعہ مجلد صہ

تحفۃ النظار۔ یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ

قسم اعلیٰ ۳؁ قسم دوم دو روپے آٹھ آنے۔

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر

نتیجہ خیز اور دلچسپ کتاب۔ دو روپے۔

مفصل فہرستِ کتب دفتر سے طلب فرمائیے

اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل

بھی معلوم ہوگی۔

Registered. No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہوجاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کراکر دفتر رسالہ برہان دہلی قرولباغ سے شائع کیا۔

ندوة المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوة المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء:- اسلام میں غلامی کی حقیقت:- جدید اڈیشن جسمیں نظرثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳ مجلد للعہ

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ مجلد سے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:- اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم۔ قیمت ۳ مجلد للعہ

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸ر

۱۹۴۰ء:- نبی عربی صلعم:- تاریخ ملت کا حصہ اول جسمیں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے جدید اڈیشن جسمیں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت عہ مجلد ۱۲ر

فہم قرآن، جدید اڈیشن جسمیں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت ۱۲ر مجلد ۳

غلامانِ اسلام:- اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت ۶ مجلد ۵ر زیرِ طبع

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جسمیں حک و فک کے بعد غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے قیمت ۶ مجلد ۶ر

۱۹۴۱ء:- قصص القرآن جلد اول:- جدید اڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک۔ قیمت ۵ر مجلد ۶ر

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب عہ مجلد سے

بین الاقوامی سیاسی معلومات:- یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت ۸ر

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب اور تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن دو روپے زیر طبع،

۱۹۴۲ء:- قصص القرآن جلد دوم۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک دوسرا اڈیشن ۳ مجلد للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام:- وقت کی اہم ترین کتاب جسمیں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن للعہ مجلد ۵ر

مسلمانوں کا عروج اور زوال:- صفحات ۵۰۰ جدید اڈیشن قیمت للعہ مجلد ۵ر۔

خلافتِ راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن قیمت ۲ مجلد ۱۲ر مضبوط اور عمدہ جلد قیمت للعہ

جلد بست و یکم　　　　شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۴۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

نظرات

آہ لعلِ شب چراغ ہند

گذشتہ چند ماہ میں، وہ کون سی قیامت تھی جو ہمارے سر پر نہیں ٹوٹی اور مصیبت وادبار کی ایسی کون سی قسم تھی جو ہندستانی (۱۵ر اگست سے پہلے کے ہندستان) پر نہیں آئی۔ انسانیت کی دھول اُڑی مذہب واخلاق کے قصرِ رفیع کی اینٹ سے اینٹ بجی، جوہر آدمیت وشرافت کی عبائے زرنگار کا ایک ایک تار بکھر گیا، امن وعافیت کی کتاب کا ورق ورق منتشر ہوا۔ اور آسائش حیات وعزت نفس کی دھجیاں بہیمیت ودرندگی کی فضائے تاریک میں پراگندہ ہوکر رہ گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی شاید پیرِ فلک کے ذوقِ ستم وایذارسانی کی تسکین اوراس کے حوصلۂ بیداد کی تشفی نہ ہوسکی کہ اس نے ہندستان کی کلاہِ افتخار کا وہ کوہ نور ہیرا اور خستہ حال انسانیت کی قبائے ناموس کا وہ تکمۂ زریں بھی توڑ لیا جو خود غرضی ونفس پرستی کی موجودہ متعفن دنیا میں ہندستان اور انسانیت دونوں کی امیدوں

اور تمناؤں کا آخری سہارا اور ان کی عظمت رفتہ کی آرزوے بازیافت کا واحد آسرا تھا

دردیست چرخ نقب زن اندر سرائے غم — آرے بہرزہ قامت ادخم نیادہ است
آسودگی مجو کہ کسے را بزیر چرخ — اسباب ایں مراد فراہم نیادہ است
در جامۂ کبود فلک بین وبس بداں — کیں چرخ جز سراچۂ ماتم نیادہ است

وادر یغا کہ وہ عدم تشدد کا دیوتا جس نے سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی کبھی اپنے دشمن پر انگلی نہیں اٹھائی، امن و عافیت کا وہ منادو داعی جس نے شدید سے شدید غیظ و غضب کے موقع پر بھی اپنے مخالف کے لیے کوئی دل آزار کلمہ زبان سے نہیں نکالا، وہ انسانیت کا علم بردار حقیقی جو تعصب و تنگ نظری کے جذبات کی فراوانی کے عالم میں بھی ایک کوہ استقامت اور صبر و تحمل کی چٹان بنا اپنے مقام پر کھڑا رہا، مذہب و اخلاق کا وہ پیکر زریں جس نے حیوانیت و درندگی کے بحران عظیم میں بھی اپنے قدم کو ایک لمحہ کے لیے جادۂ مستقیم سے متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اور حق و صداقت کا وہ سچا پجاری جو کذب و افترا اور دروغ و باطل کی بلاانگیز موجوں میں بھی صحت فکر و عمل اور راست گفتاری و راست کرداری کی کشتی کو طوفان زدگی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا آہ! صد آہ کہ ۳۰ جنوری ۴۸ء کی شام کو خود اس کے ایک ہم وطن و ہم ملک نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اس کے نحیف و زار جسم کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر ہندستان کی پیشانی پر ایک ایسا بدنما داغ لگا دیا جو کبھی مٹائے نہ مٹے گا

گاندھی جی نسلاً ہندستانی اور مذہباً ہندو تھے۔ لیکن وہ انسانیت عامہ کا اتنا بلند اور اعلیٰ تصور رکھتے تھے کہ دنیا میں اگر کسی انسان کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا تو اس کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ زمین کے کسی گوشے میں بھی کسی پر ظلم ہوتا تو وہ اس کی تڑپ سے خود بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کے اعتقاد میں رنگ و نسل، مذہب و مشرب اور فکر و خیال کا اختلاف محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ انسانیت عامہ اور عالمگیر اخوت و برادری کا رشتہ ان کے نزدیک سب سے مقدم تھا۔ وہ ہر انسان کو دوسرے انسان کا بھائی یقین کرتے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، عدم تشدد اور سچائی جس کا حاصل یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ ان کے تمام افکار و اعمال کی اساس و بنیاد تھے۔ انہوں نے نصف صدی کے قریب ہندستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے ان تھک جد و جہد کی اور آخر کار اس میں کامیاب ہو کر رہے۔ لیکن ان کی یہ جد و جہد قومیت کے تنگ نظرانہ تصور پر ہرگز مبنی نہیں تھی اور ان کا مطالبۂ آزادی اس لیے نہیں تھا کہ وہ ہندستانی ہونے کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت رکھتے اور ان کو اپنا دشمن

سمجھتے تھے نہیں بلکہ جیسا کہ انہوں نے بار بار کہا ہے اور اسے اپنے عمل سے ثابت بھی کر دکھایا۔ وہ انگریزوں کے بھی ایسے ہی دوست اور خیر خواہ تھے جیسے کہ وہ اپنے یا اپنوں کے تھے اور ان کا مطالبۂ آزادی صرف اس لیے تھا کہ وہ اس کو ہندستان کا طبعی اور قدرتی حق سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا وسیع اور زرخیز ملک اس طرح آزاد ہوگیا کہ قوت حاکمہ کے کسی فرد کی ناک سے نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی کا یہ کارنامہ اس درجہ حیرت انگیز اور عظیم الشان کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں تاریخ میں اس کو پڑھیں گی اور گاندھی جی کی عظمت و فکر و عمل کا اعتراف کریں گی۔

گاندھی جی اگرچہ ایک خاص ملک کی پیداوار تھے اور ایک خاص مذہب سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے "سچائی" کے اصول پر شدت کے ساتھ عامل ہونے کی وجہ سے کسی حقیقت کو محض تقلیداً اور دوسروں کی پیروی میں کبھی قبول نہیں کیا وہ دل و دماغ کی پوری وسعتوں کے ساتھ حق و صداقت کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہے اور جہاں کہیں ان کو کسی گوہر گراں مایہ کا سراغ ملا اس کو کسی کی ملامت د ترد ید کے خوف کے بغیر فوراً حفاظت و احتیاط کے ساتھ چن لیا۔ اس بناپر ان کی شخصیت مذہب و فلسفۂ اخلاق کی مختلف صداقتوں اور سچائیوں کا ایک حسین و لطیف مجموعہ بن گئی تھی اور ان کو ہر شخص اپنے سے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ ہندوؤں کو ان میں رام چندر جی کی حق پرستی و صداقت شعاری نظر آتی تھی تو مسلمانوں کو ان میں خواجہ معین الدین اجمیری اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے فقر و مسکنت اور درویشی و بے نفسی کا جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ عیسائی ان کو مسیحی تعلیمات کا علم بردار سمجھتے تھے تو سکھ ان میں گرونانک کے جرأت اخلاق اور بے باک صداقت کا پرتو دیکھتے تھے غرض یہ کہ وہ اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے ایک ایسے گل صد رنگ و سدا بہار تھے کہ جس مذہب کا پیرو بھی ان کو دیکھتا بے ساختہ پکار اٹھتا تھا

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

پھر وہ بدنصیب جن کے مذہب کی اصل اخلاقی اور تمدنی تعلیمات کا تعصب و تنگ نظری کے ہاتوں خاکہ اڑ چکا ہے وہ تو اس مجموعۂ رنگ و بو اور پیکرِ اخلاق و حسنِ خو کو دیکھ کر دم بخود ہو جاتے اور یہ کہہ کر رہ جاتے تھے کہ

مجھے خندۂ گل پہ آتا ہے رونا　　　کہ اس طرح ہنسنے کی خو تھی کسی کی

ان کی اس ہمہ گیر محبوبیت اور ہر دل عزیزی کا ہی یہ ثمرہ ہے کہ کتنے ہی آدمی بلا اختلاف مذہب وملت حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی شدتِ الم میں دنیا سے چل بسے اور کتنے ہی تھے جو زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو گئے۔ پھر ماتم بھی اس درجہ عالم گیر ہوا کہ دنیا میں آج تک کسی کا نہیں ہوا۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا، ہر رنگ اور ہر نسل کا، ہر ملک اور ہر قوم کا چھوٹا بڑا، عالم وجاہل، امیر وغریب، مذہب پرست اور لامذہب کوئی ایسا نہیں تھا جس کے دل پر اس حادثہ کو سن کر چوٹ نہ لگی ہو اور اس کی آنکھیں اشک بار نہ ہو گئی ہوں لوگ فرطِ محبت وعقیدت میں ان کو باپو کہتے تھے اور کوئی شک نہیں کہ وہ بنی نوع انسان کے سچے ہمدرد وغم گسار ہونے کی باعث نہ صرف ہندستان کے بلکہ کل کائنات انسانی کے باپو تھے آج وہ دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کے سر پر سے قلبی شفقت وپریم کا ایک مقدس ہاتھ اٹھ گیا۔

اس موقعہ پر ہمیں یاد آیا کہ مشہور صوفی اور بزرگ حضرت مولانا جلال الدین رومی کا جنازہ جب قونیہ میں اٹھا تو جہاں مسلمان چیخیں مار مار کر رونے لگے عیسائی اور یہودی بھی بے ساختہ اشک بار ہو گئے لوگوں نے ان سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ عیسائیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک یہ بزرگ ہستی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شبیہ تھی تو ہمارے لیے یہ حضرت عیسیٰ تھی۔ یہودی بولے کہ ہم کو اس شخصیت میں حضرت موسیٰ کا سا تقدس اور ان کی سی خو بو نظر آتی تھی۔ واقعی سچ فرمایا "جو خدا کا ہو گیا ساری دنیا اس کی ہو گئی۔"

ہندستان میں اختلاف مذہب کی وجہ سے پچھلے دنوں جو خون خرابہ ہوا اس کی نظیر تو تاریخ میں نہیں ملیگی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر جب مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی یہ مسئلہ اس زمانہ میں بھی چند در چند مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا اور اس کے حل کرنے میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی تھیں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ خالص اسلامی فکر کے بالمقابل اپنی اصل قومی عصبیت کے رجحانات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے یا بالفاظ صحیح تر ہنگامی جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں اصل اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ جب سلطنت کی طرف سے اس مسئلہ کا کوئی حل پیدا نہیں ہو سکا تو مسلمانوں میں صوفیائے کرام اور ہندوؤں میں ان کے مصلحین ومفکرین کی جماعت نے وقتاً فوقتاً اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی چنانچہ اس سلسلہ میں سکندر لودھی کے عہد میں بھگتی تحریک کا آغاز ہوا اور کبیر داس اور بابا نانک جیسے لوگ اس کے علم بردار ہوئے۔ پھر بعد میں اکبر نے دین الٰہی کی داغ بیل بھی اسی تحریک کے زیر اثر ڈالی۔ لیکن ان تحریکوں کو اس لیے فروغ نہیں ہو سکا کہ انہوں نے مذہب کی انفرادیت کو برباد کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دی جو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر خواہ کتنی ہی خوبصورت اور جاذب نظر معلوم ہوتی ہو۔ لیکن کوئی اپنے مذہب کا سچا پرستار اسے قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اس راہ سے ہٹ کر گاندھی جی نے اختلافِ مذہب کی مشکل کا جو حل نکالا وہ بالکل طبعی اور فطری تھا

انہوں نے ہندو یا مسلمان، عیسائی یا سکھ کسی سے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے کوئی نیا مذہب اختیار کرلے۔ بلکہ ان کا بنیادی فکر یہ تھا کہ تمام مذاہب میں بنیادی صداقتیں اور سچائیاں ایک ہی جسم اور قالب کے اعتبار سے شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں لیکن روح سب کی ایک ہے یعنی یہ کہ وہ خدا پرستی اور نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پس جب روح سب مذاہب کی ایک ہے اور انسانیت عامہ کے تصور کے پیش نظر ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے تو پھر محض اختلاف مذہب کی بنا پر آپس میں لڑنا جھگڑنا اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے گاندھی جی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اپنی پراتھنا میں جس کو وہ ہر روز بڑی پابندی سے مجمع عام میں کرتے تھے ہر مذہب کی مقدس کتاب کے ٹکڑے شامل کرلیے لیکن اپنی ہمہ گیر عظمت و شہرت کے باوجود نہ تو کوئی نیا مذہب ایجاد کیا اور نہ انہوں نے کسی مذہب کے پیرو کو اپنا مذہب ترک کرنے کی دعوت دی۔ اس کے برخلاف ان کا پیغام یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کی پابندی کر کے صحیح معنی میں خدا پرست ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہر شخص واقعی طور پر خدا پرست ہو جائے تو اختلاف مذہب کی وجہ سے جو بربادیاں آتی ہیں وہ نہ آئیں اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری محبت اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں

گاندھی جی کی زندگی کا سب سے بڑا مشن عدم تشدد اور سچ کی تعلیم تھا دیکھنے میں یہ دو لفظ ہیں لیکن ان میں اخلاق و موعظت کے دفاتر پوشیدہ ہیں گاندھی جی جس چیز کو عدم تشدد کہتے تھے وہ وہی ہے جس کو قرآن نے آیت ذیل میں بیان کیا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ	ایک ایسے طریقہ پر مدافعت کرو جو بہترین ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارا شدید دشمن بھی پکا دوست بن جائے۔

ہتھیاروں اور تشدد کے ذریعہ صرف جسم کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ مگر دل نہیں بدلے جا سکتے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی حق بات پر محض حق کے لیے قائم ہو اور وہ زبردست اخلاقی طاقت کا مظاہرہ کرے تو شدید ترین دشمن بھی رام ہو کر دل سے دوست بن جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کی اور ہر آسمانی مذہب کی یہی تعلیم ہے لیکن گاندھی جی نے اپنے بلند پایہ کردار، عظیم الشان ضبط نفس اور حیرت انگیز قوت عزم و عمل سے جس طرح اس حقیقت کو سچ کر دکھایا وہ مصلحین عالم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔

۹ ستمبر ۴۷ء کو وہ دہلی پہونچے تو تمام شہر قتل و غارت گری کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ حکومت اور اس کی پولیس اور فوج اس آگ پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن گاندھی جی کے یہاں پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا آگ پر کسی نے پانی ڈال دیا ہے لیکن اس کے باوجود دلوں میں نفرت و عناد اور جذبہ قتل و غارت گری کا جو زہر بھرا ہوا تھا وہ نہ نکلا گاندھی جی نے پراتھنا میں روزانہ تقریریں کیں بیانات شائع کیے پرائیویٹ مجلسوں میں افہام و تفہیم کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ دل پھر بھی نہیں بدلے تو انہوں نے حق و انصاف

کے لیے جان کی بازی لگادی اور برت رکھ لیا۔ یہ برت کیا تھا! گویا ایک برق تھی جو تعصب اور تنگ نظری کے پردوں کو چاک کر گئی فساد پرور عناصر کو اب اپنی موت نظر آئی تو انہوں نے گاندھی جی کو ختم کر دینے کا ہی منصوبہ باندھ لیا اور ۳۰ رجنوری کی شام کو وہ اسے عمل میں بھی لے آئے۔

لیکن ہر شخص محسوس کر رہا ہے کہ اس کا اثر کیا ہوا؟ تاریخوں میں پڑھا ہے کہ پہلے زمانہ میں خاص خاص دریا تھے کہ ان میں جب طوفان آتا تھا تو جب تک کسی کی بھینٹ نہیں لیتا تھا فرو نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح پاکستان اور ہندستان میں فرقہ وارانہ منافرت کا جو شدید طوفان اٹھ رہا تھا وہ غالبًا فرو ہونے کے لیے اس ملک کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کی قربانی کا ہی انتظار کر رہا تھا کہ اس کے عمل میں آتے ہی یک بیک مسموم دل و دماغ پاک و صاف ہو گئے اور جو لوگ شدت جذبات میں اندھے ہو گئے تھے ان کو بھی شاہد حقیقت کا روشن و تابناک چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ پس گاندھی جی کے اصول عدم تشدد اور حق پرستی کی شاندار کامیابی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ دلوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا کام جو دنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں کر سکتی وہ انہوں نے اپنے خون کے قطروں سے کر دکھایا اور خود جان دے کر پورے ملک کو نہایت ہولناک تباہی و بربادی سے بچا لیا۔

قدرت کو یہی منظور تھا کہ گاندھی جی عام محسنین انسانیت اور معلمین اخلاق کی طرح انتہائی مظلومیت کے ساتھ جان دیں۔ بہر حال اگرچہ آج ان کا جسم ہم میں نہیں ہے لیکن ان کی آتما امر اور زندہ جاوید ہے اور ان کے جسم سوختہ کی راکھ کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ حق کی بے لوث پیروی اور عدم تشدد میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔ ہندستان کو یا کسی اور ملک کو اگر خوش حال ہونا اور ترقی کرنا ہے تو ان دو اصولوں پر کاربند ہونا ناگزیر ہے۔ اب گاندھی جی کے نام لیواؤں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا فرض ہے کہ گاندھی جی انہیں جو راستہ دکھا گئے ہیں اس پر وہ عزم و ہمت اور خود اعتمادی و ہوشیاری کے ساتھ اس طرح چلتے رہیں کہ فتنہ پرداز اور دشمن ملک عناصر کو پھر ابھرنے اور سر اٹھانے کا موقع نہ ملے اگر ہم نے ایسا کیا تو گاندھی جی کی آتما کو سکھ پہونچے گا اور ہم بھی امن و اطمینان سے رہ کر ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکیں گے۔

تدوین حدیث

(۲)

حضرت مولنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات
جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

امام مالکؒ صحابہ سے استفادہ کرنے والے حضرات کے دستور کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان میں بعض لوگ حدیثوں کو لکھ کر یاد کرتے اور جب یاد ہو جاتی تھیں تو مٹا دیتے تھے (دیکھو جامع بیان العلم، ص ۶۴) اور یہ دستور زمانے تک جاری رہا ابن سیرین کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا بھی قاعدہ تھا کہ حدیثوں کو لکھ لیتے

فاذا حفظہ محاہ (طبقات ابن سعد ۷ ج) مگر جب یاد کر لیتے تو پھر اس کو مٹا دیتے

خالد الحذاء کے حالات میں بھی ہے وہ خود ہی فرمایا کرتے کہ بڑی حدیثوں کو میں پہلے لکھ لیتا ہوں

فاذا حفظتہ محوتہ۔ پھر جب ان کو یاد کر لیتا ہوں تو نوشتہ کو مٹا دیتا ہوں۔ (ابن سعد ص۱۳۳ ج ۷، قسم دوم)

ان میں بعض لوگوں سے تو صراحتہ اس قسم کے الفاظ منقول ہیں مثلاً ابن عساکر نے اسماعیل ابن عبیدہ محدث کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ:۔

ینبغی لنا ان نحفظ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما نحفظ القرآن (۷ ج تاریخ دمشق) ہم لوگوں کو چاہیے کہ رسول اللہؐ کی حدیثوں کو اسی طرح یاد کریں جیسے ہم قرآن یاد کرتے ہیں۔

ذہبی نے مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے متعلق یہ الفاظ ابو علی نیشاپوری کے حوالہ سے نقل کیے ہیں کہ

کان ابن خزیمہ یحفظ الفقہیات من حدیثہ کما یحفظ القاری السورۃ (ص ۲۶۱ ج ۲ تذکرۃ الحفاظ)	فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے تھے جیسے قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

ذہبی نے بھی اسرائیل بن یونس کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنے دادا ابو اسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ :۔

کنت احفظ حدیث ابی اسحاق کما احفظ السورۃ من القرآن۔ (ص ۱۹۹)	ہم ابو اسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کو اس طرح یاد کرتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں یاد کی جاتی ہیں

شہر بن حوشب کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ احمد عبد الحمید بن بہرام کے پاس شہر کی حدیثوں کا ذخیرہ تھا اور ان کو

کان یحفظ کانہ یقرأ سورۃ القرآن (تھذیب ص ۳۷۱ ج ۴)	ساری حدیثیں زبانی یاد تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قرآن کی کوئی سورۃ پڑھ رہے ہیں۔

ابو داود الطیالسی جن کی مسند دائرۃ المعارف حیدرآباد میں طبع بھی ہو چکی ہے حافظ ابن حجر نے تہذیب میں ان کا یہ دعوی نقل کیا ہے کہ اسرد ثلاثین الف حدیث ولا فخر ص ۱۸۳ - ۴۹ (میں تیس ہزار حدیثیں فر فر زبانی سناتا ہوں اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے) اسی طرح مشہور تابعی قتادہ کے ترجمہ میں امام بخاری اور ابن سعد وغیرہ نے جو یہ قصہ نقل کیا ہے کہ سعید بن عروبہ سے قتادہ نے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورہ بقرہ سناتا ہوں سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سنا ایک حرف کی بھی غلطی قتادہ نے نہ کی پھر مجھ کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ :۔

لانا بصحیفۃ جابر احفظ منی بسورۃ البقرۃ	حضرت جابر بن عبد اللہ کی نوشتہ حدیثوں کا مجموعہ جس کا

(تاریخ کبیر بخاری) ص ۱۸۲ ج ۴ نام صحیفہ تھا) وہ سورہ بقرہ سے بھی مجھے زیادہ یاد ہے

یہ وہی جابر ہیں جن کا پہلے ہی ذکر آچکا ہے یعنی جابر بن عبداللہ صحابی کی حدیثوں کا مجموعہ عہد صحابہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ قتادہ اسی کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ قرآن کی سورہ سے بھی زیادہ مجھے صحیفہ جابر کی حدیثیں یاد ہیں۔

بلکہ روایات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ حفظ کرنے والے بچوں کو شروع ہی سے جیسے قرآن کے حفظ میں لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ حدیث بھی بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھی اور صحابہ ہی کے عہد میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی ابن عباس کے غلام عکرمہ جن کی تعلیم پر ابن عباس نے خاص توجہ کی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ تابعین کے عہد میں چند ممتاز ائمہ میں ایک بہت بڑے امام کی حیثیت عکرمہ کی ہو گئی تھی۔ اپنی تعلیمی سرگذشت بیان کرتے ہوئے عکرمہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ:۔

کان ابن عباس یضع الکبل فی رجلی علی تعلیم القرآن والسنن (ص ۹۰ تذکرہ) ابن عباس میرے پاؤں میں قرآن اور حدیثوں کی تعلیم دینے کے لیے بیڑی ڈال دیتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اپنے بچوں کو بعض لوگ بچپن ہی سے حدیث یاد کرنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ ابن سیرین بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جن کے والد نے بچپن ہی سے ابوہریرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ ابن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے دونوں بچوں کی قوت یادداشت اور حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ابوہریرہ نے کیا تو یحییٰ میں ان کو زیادہ صلاحیت نظر آئی۔

فکناہ ابوھریرۃ لحفظہ۔ (ابن سعد ص ۱۵۰ ج ۷) ابوہریرہ نے یحییٰ کی یادداشت دیکھ کر ان کی کنیت رکھی۔

جیسے قرآن کے حفظ میں سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں حفظ کا کام جتنا استوار اور مضبوط ہوتا ہے۔

معمر ہونے کے بعد یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی حسن بصری فرماتے ہیں کہ :۔

طلب الحدیث فی الصغر کالنقش فی الحجر۔ (ص ۸۲ جامع ۱) — بچپن میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنا ایسا ہے جیسے پتھر میں نقش کرنا

عبد اللہ بن مسعود کے خلیفہ اور شاگرد رشید علقمہ خود اپنے متعلق فرماتے :۔

ماحفظت وانا شاب فکانی انظر الیہ فی قرطاس اوورقۃ (ص ۸۲ جامع ۱) — اپنے نوجوانی کے زمانے میں جو چیزیں میں نے زبانی یاد کر لی تھیں ان کی حالت ایسی ہے کہ کاغذ یا ورق میں لکھی ہوئی وہ گویا میرے سامنے ہیں۔

اور صرف یاد کر لینا کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یاد کرنے کے بعد بار بار ان ہی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے رہنا یہ ایسا مسئلہ تھا جس کی ہر استاد اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے ہوئے اصرار کرتا تھا

صحابہ کرام میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فرمایا کرتے تھے :۔

اکثروا ذکر الحدیث فانکم ان لم تفعلوا یدرس علمکم (ص ۱۰۱ جامع) — حدیث کو بار بار دہراتے رہو، اگر ایسا نہ کروگے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

عبد اللہ بن مسعود فرماتے :۔

تذاکروا الحدیث فان حیاتہ مذاکرتہ۔ (ص ۱۴۱ معرفۃ علوم الحدیث للحاکم) — بار بار حدیث کو دہراتے رہو، کیونکہ اس کو زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کہتے کہ :۔

تذاکروا الحدیث — بار بار حدیث کو دہراتے رہو،

حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے کہ یاد رکھو :۔

غائلۃ العلم النسیان وترک المذاکرۃ — علم کی آفت اس کا بھول جانا ہے اور دہرانے کو

(ص ۱۴۱ جامع) چھوڑ دینا۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بھی تلامذہ سے کہتے :-

ان احیاء الحدیث مذاکرتہ	حدیث کو زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بار
فتذاکروا	بار دہرایا جائے، پس چاہیے کہ تم لوگ دہراتے
(ص ۱۱۱ جامع)	رہو۔

جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بار بار یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے بھی رہنا چاہیے نیز ہم درس رفقا کو چاہیے کہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر یاد کیا کریں ایک سے غلطی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر دے اس باہمی مذاکرہ کرنے کا صحابہ ہی کے زمانہ میں رواج پڑ گیا تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ کا حلقہ درس حدیث جو مسجد نبوی میں قائم تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے عطا کہتے ہیں کہ

کنا نکون عند جابر بن عبد الله	ہم لوگ جابر بن عبداللہ کے پاس ہوتے (یعنی ان
فیحدثنا فاذا خرجنا من عنده	سے حدیثیں سنتے) پھر جب ان کے حلقہ سے باہر
تذاکرنا حدیثہ	نکل آتے تو ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باہم مل کے
(ص ۳۵۴ ابن سعد)	ہم لوگ دہراتے۔

استاد کے پاس سے اٹھ جانے کے بعد باہم ایک دوسرے کے ساتھ حدیثوں کا جو مذاکرہ کرتے تھے اس مذاکرے کی نوعیت کیا ہوتی تھی سعید بن جبیر سے کسی نے پوچھا کہ ابن عباس سے جتنی باتیں روایت کرتے ہو کیا سب براہ راست ان سے پوچھ کر تم نے سیکھی ہیں بولے کہ نہیں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کی مجلس میں حدیثیں بیان کی جاتیں میں بھی خاموش بیٹھا رہتا۔ جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے جاتے اور

یتحدثون فاحفظ۔ ابن سعد	اور باہم ان ہی حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تو میں

ان حدیثوں کو یاد کر لیتا۔ (ص ۱۷۹ ج ۶)

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ بار بار اپنی پڑھی ہوئی حدیثوں کو اتنا دہراتے کہ دوسروں کو بھی وہ حدیثیں محض ان کے یاد کرنے اور دہرانے کی وجہ سے یاد ہو جاتی تھیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ جیسے سنا جاتا ہے۔ صحابہ اور تابعین ہی کے عہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث یاد کرنے والوں کا بھی آموختہ لوگ سنتے تھے۔ عروہ بن زبیر حضرت عائشہ صدیقہ کے علم کے راوی ہیں ان ہی کا حال ان کے صاحبزادے ہشام بن عروہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد مجھے اور میرے دوسرے بھائیوں عبد اللہ، عثمان و اسماعیل وغیرہ کو حدیث پڑھا دیتے پھر ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے کہ :۔

کرر و اعلی وکان یعجب من حفظی۔ جو کچھ تم نے پڑھا اور یاد کیا ہے وہ مجھے سناؤ اور وہ (یعنی ہشام کے والد عروہ ہشام کی قوت یادداشت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے (تاریخ کبیر بخاری ص ۴)

ابن عباس کے شاگرد سعید بن جبیر بھی کہتے تھے کہ ابن عباس مجھ سے فرماتے :۔

انظر کیف تحدث عنی فانك قد حفظت عنی حدیثا کثیرًا مجھے بتاؤ، کہ مجھ سے تم حدیثیں کس طریقہ سے روایت کروگے کیونکہ تم نے بہت بڑا ذخیرہ حدیثوں کا مجھ سے سن کر یاد کیا ہے۔ (ج ۶ ص ۱۷۹- ابن سعد)

سعید ہی کا بیان ہے کہ شروع میں ابن عباس نے مجھ سے آموختہ سننا چاہا تو میں گھبرایا میری اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباس نے فرمایا کہ :۔

اولیس من نعمة اللہ علیك ان تحدث وانا شاهد فان کیا حق تعالیٰ کی یہ نعمت نہیں ہے کہ تم حدیث بیان کرو، اور میں موجود ہوں، اگر صحیح طور پر بیان

اصبت فذالک وان اخطأت علمتک کر گئے تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے

(ابن سعد ص ۱۷۹ ج ۶) اور اگر غلطی کرو گے تو میں تم کو بتا دوں گا۔

اسی لیے تاکہ یاد کرنے والوں کو یاد کرنے میں سہولت ہو، چند حدیثوں سے زیادہ ایک دن کا سبق عموماً نہیں ہوتا تھا۔ زہری اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ:۔

لیکن الحفظ لہ بالتدریج قلیلاً قلیلاً چاہیے کہ بتدریج حدیثوں کو تھوڑا تھوڑا کرکے یاد

(تدریب الراوی) ص ۱۸۰ کیا جائے

لکھا ہے کہ اس موقعہ پر زہری اس مشہور حدیث کو بھی یاد دلاتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے یعنی

خذوا من الاعمال ما کام کا بوجھ بس اتنا اٹھاؤ۔ جسے تم برداشت

تطیقون کر سکتے ہو،

وہ یہ بھی کہتے کہ:۔

من طلب العلم جملۃ فاتہ جملۃ جو ایک ہی دفعہ چاہتا ہے کہ سارے علم کو نگل جائے

(ص ۱۸۰ تدریب) وہ سب کو کھو بیٹھتا ہے،

سلیمان تیمی کے تذکرہ میں ذہبی نے لکھا ہے کہ چند خاص شرائط کے ساتھ اپنے حلقہ درس میں طلبہ کو شریک ہونے کی اجازت دیتے تھے پھر ان کے معیار پر جو پورے اترتے حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی اور

نحدثہ خمسۃ احادیث (تذکرہ ۱۴۳ ج ۱) صرف ایک دفعہ میں کل پانچ حدیثیں سناتے،

اسی طرح مشہور تابعی ابو قلابہ کے تذکرہ میں ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ان کے شاگرد خالد بیان کرتے تھے کہ:۔

كنا ناتي ابا قلابة فاذا حدثنا ثلاثة احاديث قال قد اكثرت (ص ۱۳۴ - ابن سعد) ہم ابو قلابہ کے پاس جاتے تین حدیثیں بیان کرنے کے بعد کہتے کہ بہت ہوگیا،

اور زہری کا یہ بیان جو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے

انما العلم حديث او حديثان (ص ۱۰۰ اتذکیب) علم تو کل ایک حدیث یا دو حدیثیں ہو سکتی ہیں۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو حدیثوں سے زیادہ وقت واحد میں وہ نہیں سکھاتے تھے۔ بڑی سے بڑی مقدار جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث شعبہ کے متعلق یحیی بن سعید القطان کا بیان ہے کہا کرتے تھے :-

لزمت شعبة عشرين سنة فما كنت ارجع من عنده الا بثلاثة احاديث وعشرة اكثر ما كنت اسمع منه في كل يوم (ص ۱۳۶ خطیب ج ۱۴) شعبہ کے حلقہ میں بیس سال تک میں پابندی کے ساتھ شریک رہا، اس تمام عرصہ میں میں نے دیکھا کہ ان کے پاس سے جتنی حدیثیں روزسن کر ہم گھر لوٹتے ان کی بڑی سے بڑی تعداد ایک دن میں تیرہ حدیثوں سے زیادہ نہ ہوتی۔

اپنے اس طریقہ پر محدثین کو کتنا اصرار تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابراہیم[۱] موصلی کے صاحب زادے اسحاق کو حدیث کا جب شوق ہوا تو عباسی دربار کے مشہور وزیر یحیی بن خالد برمکی سے اسحاق نے چاہا کہ سفیان بن عیینہ سے سفارش کریں لیکن سفیان پانچ حدیثوں سے زیادہ ایک دن میں پڑھانے پر راضی نہ ہوئے یحیی نے سفیان سے جب بہت اصرار کیا تو سر

---

[۱] عباسی دربار کا مشہور مغنی ہے۔ شاید اسی لیے اس کے بیٹے کو سفارش کی ضرورت پیش آئی لکھا ہے کہ یحیی برمکی نے سفیان سے پہلی دفعہ جب اس کا ذکر کیا کہ اسحاق کو بھی حدیث پڑھائیے تو انہوں نے ناپسند کیا تھا بعد کو راضی ہوئے لیکن دستور روزانہ جتنی حدیثوں کے سکھانے کا تھا اس سے تو ہی ہٹنے پر راضی نہ ہوئے زیادہ سے زیادہ دس تک پہنچے۔

سات تک پہنچے اور ان کی تاکید و الحاح جب حد سے بڑھ گئی تو مجبوراً راضی ہوئے کہ اگر سویرے اسحاق میرے پاس آیا کریں گے تو روزانہ دس حدثیں پڑھا دوں گا۔ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۵۔

اور محدثین کا کام حدثیوں کے متعلق صرف اساتذہ کے حلقوں ہی تک ختم نہیں ہوجاتا تھا بلکہ عام قاعدہ یہی تھا کہ ایام طلب کی مشغولیتوں سے فارغ ہونے کے بعد پڑھی اور یاد کی ہوئی حدثیوں کو اسی طرح دہراتے رہتے تھے جیسے قرآن کے حافظ بھی حفظ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا دور کرتے رہتے ہیں یاد کی ہوئی حدثیوں کے دور کا اصطلاحی نام "مذاکرہ" تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کا رواج صحابہ ہی کے زمانہ میں ہوچکا تھا ابن عباس اپنے تلامذہ کو مذاکرہ کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے کہ:۔

مذاکرۃ العلم ساعۃ خیر من احیاء لیلۃ عبادت میں شب بیداری سے زیادہ بہتر ہے کہ علم کو دہرایا جائے ایک گھنٹہ کے لیے۔ (تذکایب) ص ۱۸۰

اور شاید اس لیے کہ قرآن بکثرت لوگوں کے پاس لکھا ہوا اس زمانہ میں موجود تھا بخلاف حدثیوں کے کہ زیادہ تر اس کی بنیاد حفظ اور یاد ہی پر تھی حضرت ابو سعید الخدری تو یہاں تک فتوے دیتے کہ:۔

مذاکرۃ الحدیث افضل من قرأۃ القرآن حدیث کو بار بار دہراتے رہنا قرآن پڑھنے سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ (ص ۱۸۰ تذکریب)

اس قسم کی ہدایتوں کا یہ اثر اور نتیجہ تھا کہ سننے والا اگر کوئی نہ ملتا تو بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ مکتب خانہ چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کرکے حدثیں سناتے اسماعیل بن رجا کے حال میں لکھا ہے کہ

انہ کان یجمع صبیان الکتاب فیحدثہم اسماعیل مکتب خانہ کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے

لئلا ینسی حدیثہ۔ (جامع ص ۱۰۲) حدیث اس لیے بیان کرتے تاکہ وہ بھول نہ جائیں،

عطار خراسانی کے متعلق بھی قریب قریب اسی کے یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ یعنی

اذا لم یجد احدًا اتی المساکین فحدثہم جب کوئی ان کو نہ ملتا تو غربا کی جماعت میں آکر حدیثیں

یرید بذالک یحفظ (ص ۱۱۱ جامع) بیان کرتے، مطلب حدیثوں کو یاد رکھنا تھا،

بعض لوگ گھر کی چھوکریوں کے سامنے اپنے محفوظات کو دہراتے۔ ان سے کہتے بھی جاتے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ میں یہ چیزیں نہ آرہی ہوں گی لیکن میری غرض تو اپنے علم کو تازہ کرنا ہے اور یہ ابراہیم نخعی کے اس مشورے کی گویا تعمیلی شکل تھی جو اپنے شاگردوں کو وہ دیا کرتے تھے کہ

اذا سمعت حدیثا فحدث بہ جب کوئی حدیث تم سنو تو چاہیے کہ سننے کے ساتھ

حین تسمعہ ولو ان تحدث ہی دوسروں سے اس کا ذکر کرنا شروع کردو خواہ

بہ من لا یشتہیہ اس قسم کے آدمی کے سامنے کیوں نہ ہو، جو تم سے

حدیث سننا نہ بھی چاہتا ہو،

کہتے کہ اس طرح دہرانے سے یوں سمجھو کہ تم حدیث کو اپنے سینے میں لکھ رہے ہو (جامع ص ۱۰۱)

خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر "حدیث" سے تعلق رکھنے والی علمی جماعت کے لیے ان چند چیزوں کو جو ضروری قرار دیا جاتا تھا یعنی کہا جاتا تھا کہ

اول العلم الاستماع ثم الانصات ثم علم (یعنی علم حدیث) میں پہلا کام تو سننا ہے، پھر کان

الحفظ ثم النشر (ص ۱۱۸ جامع) لگانا، پھر یاد کرنا، پھر عمل کرنا، اور آخر میں اشاعت،

عبداللہ بن مبارک فضیل بن عیاض سفیان ثوری وغیرہ سب ہی سے مذکورہ بالا الفاظ منقول ہیں بظاہر ان اقوال میں "حفظ" سے مقصد یہی ہے کہ سننے کے بعد سنی ہوئی حدیثوں کو چاہیے کہ محدث زبانی یاد کرے۔ جس کا طریقہ وہی تھا جو بیان کیا گیا۔

عام طور پر صحیح حدیث کے شرائط کو بیان کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے الفاظ کتابوں میں لوگوں کو جو ملتے ہیں تو بہ ظاہر "حفظ" کے اس لفظ سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ راوی کے حافظہ کو غیر معمولی طور قوی ہونا چاہیے گویا عام اور معمولی حافظہ والے لوگ "صحیح حدیث" کے راوی بن ہی نہیں سکتے لیکن دراصل یہ ایک مغالطہ ہے بلکہ یہاں غرض "حفظ" سے وہی ہے کہ "راوی" نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو خواہ حفظ اور یادداشت کی قوت اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظہ والے آدمی کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسہ اور اعتماد کے قابل ہو جاتی ہے جیسے غیر معمولی حافظہ والوں کے محفوظات پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ قرآن کے حفاظ جس کی بہترین زندہ مثال ہیں۔

اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حافظہ زیادہ قوی تھا خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ قدرتاً عرب کے باشندوں کی سمجھا جاتا ہے کہ یادداشت کی قوت انہیں زیادہ بہتر تھی یا نوشت و خواند کا رواج چونکہ عرب میں کم تھا لوگ زیادہ تر حافظہ کی قوت سے کام لینے کے عادی تھے اور قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جتنا زیادہ کام لیا جاتا ہے عام طور پر وہی زیادہ بالیدہ اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے جیسے برعکس اس کے آدمی جس قوت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے بہ تدریج وہ کمزور ہونے لگتی ہے میکانیکی اور دخانی، برقی سواریوں کے اس دور میں جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اب آدمی میں پیادہ پا، اونٹ، گھوڑوں کی پیٹھ پر مسافت کے قطع کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے جو پچھلی نسلوں کے ان افراد میں پائی جاتی تھی جن کی رسائی عصر حاضر کی سواریوں تک نہیں ہوئی تھی یا یہ سمجھا جائے کہ جیسے انسان کی عام فطری اور جبلی قوتوں میں بعض استثنائی غیر معمولی مظاہر کی پیدائش اگرچہ ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہے لیکن جب ان سے کام لیا جاتا ہے تو وہ منظر عام پر آجاتے ہیں اور

دنیا کو ان سے واقف ہو جانے کا موقعہ مل جاتا ہے اسی قانون کے تحت حافظہ کی غیر معمولی قوتوں سے کام لینے کا موقعہ اسلام کو اپنی ابتدائی صدیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق مل گیا اور اسی استعمال کی وجہ سے عجیب و غریب تجربات انسانی قوتِ حفظ و یاد داشت کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کو ہوئے اسماء الرجال کی کتابوں سے انتخاب کرکے ان تجربات کو ایک جگہ اگر جمع کر دیا جائے تو فطرتِ انسانی کے اس خاص پہلو کے متعلق معلومات کا ایک حیرت انگیز مجموعہ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ کمًا وکیفًا آدمی کا حافظہ ارتقا کے کن حدود تک پہونچ سکتا ہے اس کا ان معلومات کی روشنی میں پتہ چل سکتا ہے۔ مثلاً ایک نہیں ایسے حافظہ کی متعدد مثالیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ سن لینے کے بعد بات کا بھولنا ان لوگوں کے لیے ناممکن تھا ابن شہاب زہری یہ کہتے ہوئے کہ ایک دفعہ سن لینے کے بعد آج تک دوبارہ پھر اسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت مجھے کبھی نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی حدیث کے متعلق مجھے شک ہوا خود اپنا ذاتی تجربہ اپنے حافظہ کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ کل ایک دفعہ ایک حدیث کے بعض الفاظ میں مجھے شک سا محسوس ہوا

فسالت صاحبی فاذا ھو کما قلت (ص ۱۰۴ تذ) — میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا تب معلوم ہوا کہ صحیح وہی تھا جو میں کہتا تھا،

یا امام بخاری کے متعلق ان کے رفیقِ درس جن کا حاشد بن اسماعیل نام تھا خود اپنا یہ ذاتی مشاہدہ نقل کرتے تھے کہ بخاری ابھی غلام (نوعمر) ہی تھے اور ہمارے ساتھ حدیث کے ایک حلقہ میں شریک ہوئے حاشد کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کا تو قاعدہ یہی تھا کہ استاد حدیثیں بیان کرتا جاتا تھا اور ہم لوگ لکھتے جاتے تھے لیکن بخاری کو ہم نے دیکھا کہ بجائے لکھنے کے چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں اور لکھتے نہیں ان کے اس حال کو دیکھ کر کچھ دن تو ہم لوگوں نے صبر سے کام لیا مگر جب ایک زمانہ اسی

حال میں گذر گیا تب ساتھیوں نے ان کو ٹوکنا شروع کیا کہ بے کار درس کے حلقہ میں تم کیوں آتے ہو جب کچھ لکھتے ہی نہیں بخاری لوگوں کے اس اعتراض کو سن کر کچھ جواب نہیں دیتے خاموش گذر جاتے حاشد کہتے ہیں کہ آخر ایک دن لوگوں نے جب ان کو بہت زیادہ چھیڑا تو دیکھا کہ غصہ آگیا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ تم لوگوں کا کیا مطلب ہے لاؤ جو کچھ تم لوگوں نے لکھا ہے لے کر بیٹھ جاؤ اور سنو میں سب کو زبانی سنا دیتا ہوں حاشد کا بیان ہے کہ:۔

فزاد علی خمسۃ عشر الف فقرۃ کلھا   پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں اس بندہ خدا نے

عن ظھر قلب (ص۱۲۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج۲)   زبانی سنا ڈالیں،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک دفعہ سن لینے کے بعد امام بخاری کے حافظہ کو یاد رکھنے کے لیے دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال ابن عباس زہری شعبی وغیرہ محدثین کے حافظہ کا لوگوں نے بیان کیا ہے میں نے پہلے بھی اس کا کہیں ذکر کیا ہے اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حافظہ کی یہ مثالیں نادر اور عجیب ضرور ہیں لیکن اگر تلاش کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس قسم کی استثنائی مثالیں ہر زمانہ میں مل سکتی ہیں ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ کو کہیں نہ کہیں ایسے افراد مل جائیں جن کے یاد رکھنے کے لیے صرف ایک دفعہ کسی شعر یا گفتگو وغیرہ کا سن لینا کافی ہو، شاہجہاں نامہ میں شاہ جہاں بادشاہ کے عہد حکومت کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عین الدولہ نے شاہی دربار میں ترہت (بہار) کے دو زنار دار (برہمن) کو پیش کیا جن کی خصوصیت یہ تھی کہ

ہر دو دہ بیت ہندی را کہ دہ شاعر بتازگی گفتہ باشند وگوش زد ہیچ کس نہ شدہ باشد بہ یک شنیدن یاد می گیرند وآں ابیات را بہماں ترتیبے کہ شعرا گفتہ وخواندہ باشند از بر خواندہ (ص ۲۶۹ بادشاہ نامہ ج ۱) خود شاہ جہاں نے دونوں کا امتحان لیا اور چنانکہ بعرض مقدس رسید

بود بود قورع آمد" بادشاہ نے انعام واکرام کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔

حافظہ کے مذکورہ تجربے میں جن خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے قریب قریب یہ وہی بات ہے جو امام بخاری کے متعلق بغداد کے علماء کے تجربہ میں آئی تھی واقعہ مشہور ہے کہ سو حدیثوں کے متن اور سند کو الٹ پلٹ کرکے امام کے سامنے سو آدمیوں نے پیش کیا تھا کہتے ہیں کہ امام بخاری ہر حدیث کو سن کر پہلے تو کہتے رہے کہ میں اس حدیث سے ناواقف ہوں جب سوالات ختم ہوئے تب امام متوجہ ہوئے اور پوچھنے والوں کی جو ترتیب تھی اسی ترتیب سے اس کی طرف رخ کرکے فرماتے کہ تم نے یہ حدیث پوچھی تھی جس کی سند تم نے یہ بیان کی لیکن یہ اس حدیث کی سند نہیں ہے بلکہ فلاں حدیث کی ہے صحیح سند اس حدیث کی یہ ہے ایک سے سو تک ہر ایک کا آپ نے تفصیلی جواب مذکورہ بالا طریقے کے التزام کے ساتھ دیا۔ آخر جب یہ ہو سکتا ہے تو بے چارے تربہت کے ان زنار داروں کی یادداشت کے اس کمال میں کیوں شک کیا جائے۔

ہم عام حافظہ والے لوگ ان استثنائی مظاہر کے آثار و نتائج کا واقعہ یہ ہے کہ صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ حافظ ابو زرعہ رازی جن کا ذکر ابھی کچھ دیر پہلے گذرا ہے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ کسی ستم ظریف نے خدا جانے اس کو کیا سوجھی کہ اس مضمون کا حلف اٹھا لیا یعنی حافظ ابو زرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں زبانی اگر یاد نہ ہو تو اس کی بیوی کو طلاق ہے یہ کہنے کے بعد بے چارے حافظ صاحب کے پاس وہ آیا پریشان تھا کہ حلف اٹھانے کو تو میں نے اٹھا لیا ہے لیکن بیوی اب قبضہ میں رہتی ہے یا نہیں بظاہر کسی کے شک کرنے پر غصہ میں اس قسم کا حلف اس نے اٹھا لیا ہوگا بہرحال وہ آیا اور مسئلہ کی جو صورت تھی بیان کی۔ حافظ نے جواب میں کہا کہ:۔

تمسك بامرأتك	اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھ (یعنی طلاق واقع
(تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۴)	نہ ہوئی تیری بیوی تیرے نکاح ہی میں ہے)

ظاہر ہے کہ ذرا سا بھی شک حافظ کو اگر اس میں ہوتا کہ ایک لاکھ حدیثیں ان کو یاد نہیں ہیں تو جس پر شرعاً اس کی بیوی حرام ہو چکی تھی محض اپنی نام و نمود اور اپنی بات کو باقی رکھنے کے لیے اس قسم کا فتویٰ قطعاً نہیں دے سکتے تھے۔

بہر حال آپ کو اختیار ہے کہ حفاظ حدیث کی ان مثالوں کو چاہے ان عام استثنائی مثالوں کے ذیل میں شمار کیجیے یا مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ کا جو یہ دعویٰ تھا کہ :۔

اعطی اللہ ھذہ الامۃ من الحفظ ما لم یعط احداً من الامم خاصۃ خصہم بھا وکرامۃ اکرمھم بھا۔ (ص ۳۹۵) زرقانی ج ۵	حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس امت کو (یعنی امت محمدیہ اسلامیہ) کو حفظ اور یادداشت کی غیر معمولی قوت سے سرفراز فرمایا ہے دنیا کی قوموں اور امتوں کے درمیان (امت اسلامیہ) کا یہ خاص امتیازی سرمایہ ہے جس کے ساتھ خدا نے اس کو مختص کیا اور حق تعالیٰ کی یہ نوازش ہے جس سے یہ امت نوازی گئی ہے۔

آپ بھی یہی مان لیجیے کہ آخری دین ہونے کی وجہ سے اسلام کی اساسی بنیادوں کو قدرت نے جیسے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے اتنا مستحکم اور استوار کر دیا کہ آئندہ خواہ کچھ بھی اب گذر جائے لیکن ابتدائی بنیادیں دین اسلام کی اتنی مضبوط اور گہری ہیں کہ ان کی وجہ سے اسلام کا دنیا سے مٹ جانا عقلاً بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے، یہی بات کہ دنیا کے سارے ادیان و مذاہب جن کی تاریخ سے ہم واقف ہیں سب کو صدیوں کے بعد ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ حکومت و سلطنت کی قوت سے اس کو امداد پہونچائی جائے لیکن پندرہ بیس سال کے اندر اندر دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس آخری دین کی تبلیغ و اشاعت استحکام و استواری میں اپنے

سارے مادی ذرائع وسائل کو وقف کیے ہوئے تھی۔ یقیناً عہد فاروقی تک پہونچتے ہوئے اسلامی حکومت روئے زمین کی سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی کیونکہ مشرق و مغرب کی دونوں عالم گیر قوتیں (رومن امپائر اور پرشین امپائر) اس کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں اسلام اور اسلامی تعلیمات آج ہزار سال کے بعد صدیوں تک بالکلیہ اپنے اصلی خط وخال کے ساتھ تروتازہ حال میں جو نظر آرہے ہیں اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں اسلام کی ابتدائی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ اب خواہ اس واقعہ کو لوگ بخت واتفاق کا نتیجہ قرار دیں یا اسلام کو جس قدرت نے بنی آدم کے آخری دین ہونے کی حیثیت عطا کی ہے اسی کی طرف سے سمجھا جائے۔ کہ قصداً وارادۃً یہ انتظام کیا گیا تھا۔ قتادہ بے چارے چونکہ مسلمان تھے اسلام کو خدا کا دین مانتے تھے اس لیے نہ صرف دوسروں ہی کے متعلق بلکہ خود اپنے حافظہ کے متعلق صبح وشام ان کو مسلسل جو تجربات ہوتے رہتے تھے سب کو تائید غیبی کے ظہور کی ایک شکل یقین کرتے تھے خود ان ہی کے متعلق لکھا ہے کہ بصرہ جو ان کا وطن تھا وہاں کے علماء وقت سے استفادہ کے بعد مدینہ منورہ سعید بن المسیب تابعی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پہونچے معلومات سے دماغ ان کا پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا مدینہ آنے کی غرض معلومات کا اضافہ اور معلوماتِ حاصلہ میں زیادہ جلا پیدا کرنا تھا سعید بن المسیب سے سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ انہوں نے چھیڑ دیا مہمان خیال کرکے کچھ دن تو سعید کچھ نہ بولے جو پوچھتے جواب دیتے جاتے تھے مگر بات جب برداشت سے باہر ہوگئی تب ذرا غصہ کے لہجہ میں سعید نے کہا کہ "جو کچھ تم نے اب تک دریافت کیا ہے ان کو تم یاد کر چکے" مطلب یہ تھا کہ صرف تم پوچھتے ہی چلے جاتے ہو جو کچھ اب تک سن چکے ہو اسے یاد بھی کیا ہے یا نہیں اس پر قتادہ نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ جی ہاں جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا مجھے سب یاد ہے اسی کے ساتھ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فقط وہی چیزیں نہیں جو سعید سے سنی تھیں بلکہ سعید کے سوا جس جس مسئلہ کے متعلق جو دوسروں سے سنا تھا سنا دیا۔ سعید کو سخت تعجب ہوا اور بولے "میں نہیں جانتا تھا کہ تم جیسی شخصیت کو خدا نے پیدا کیا ہے" (ابن سعد)

شیخ ابوالقاسم جلال الدین تبریزی

(از جناب ڈاکٹر محمد سلیم صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ شعبہ تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

آذربائیجان ایران کا ایک مشہور صوبہ ہے۔ تبریز اس کا قدیم پایۂ تخت ہے۔ یہ شہر اسلامی تمدن و تہذیب کا بڑا مرکز ہے بارھویں صدی عیسوی میں یہاں بہت سے بزرگ تھے ان میں سے ایک شیخ ابوسعید تھے۔ یہ اپنے رنگ میں نرالے تھے اپنے ہمعصروں میں اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے ممتاز تھے کہ فتوح نہیں لیتے تھے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے خود فاقہ کرتے تھے اور جو لوگ ان کی خانقاہ میں رہتے تھے، وہ سب بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ جب خانقاہ میں کچھ کھانے کو نہیں ہوتا تھا، تو سب پھل وغیرہ سے افطار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی خانقاہ میں تین دن کا فاقہ ہوا۔ یہ خبر شہر کے والی کو ملی۔ وہ ان کے اصول سے واقف تھا، لیکن ان کی اس تکلیف کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے حاجب کو زر دے کر ان کے خادم کے پاس بھیجا اور تاکید کر دی کہ اس کی خبر ان کو نہ ہو۔ حاجب نے ایسا ہی کیا۔ خادم نے زر قبول کر لیا۔ کھانا پکنے لگا۔ لوگ کھانے لگے۔ اس کھانے کے اثر سے ان کی عبادت میں فرق آیا۔ خادم کو بلایا کھانے کے متعلق پوچھا۔ خادم چھپا نہ سکا، حقیقت کا اظہار کیا۔ وہ بہت خفا ہوئے جہاں تک حاجب ان کی خانقاہ میں آیا تھا، وہاں تک کی مٹی کھدوا کر پھنکوا دی اور جو رقم رہ گئی تھی وہ خادم کو دے کر اپنی خانقاہ سے نکال دیا۔[۱]

جب ان کی بزرگی کی شہرت عام ہوئی۔ بہت سے مرید ان کے ارد گرد جمع ہو گئے

۱؎ فوائد الفواد ۔ ۲۳ رشعبان ۷۰۷ھ

ان میں نشتران کی تعلیم وتربیت سے زیادہ فیض یاب ہوئے ان لوگوں نے دنیا کو ترک کیا۔ سیر وسیاحت اپنا شعار بنایا۔ تہمد باندھتے عرقچی پہنتے، سر پہ کلاہ اوڑھتے، دنیا کی سیر کرتے بندگان خدا کی رشد وہدایت کرتے [۱] ان میں سے جنہوں نے شہرت پائی، شیخ ابوسعید کا نام زندہ رکھا اور دیار ہند میں آئے، وہ شیخ ابوالقاسم جلال الدین تبریزی تھے۔

شیخ جلال الدین تبریزی کا طریقہ ان کے ہمعصروں سے جُدا تھا۔ نہ اُنہوں نے شیخ معین الدین چشتی اور شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کی طرح اپنا کوئی مستقل مستقر بنایا اور نہ ان لوگوں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر لوگوں کی ہدایت کی۔ جب تک ان میں طاقت رہی چل پھر کر لوگوں کو اللہ کے راستہ پر لگایا ہندو مسلم دونوں کو اللہ کا پیغام سنایا اور تبریز سے بنگال تک دین حق کو پھیلایا۔

ان باتوں کے باوجود ان کا پورا حال کسی نے نہیں لکھا ان کے خاندان اور سلسلہ کا ذکر نہیں کیا۔ پردۂ خفا میں رکھا۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے تعلیم بخارا میں پائی اور زمانۂ طالب علمی میں ان کے سات سال نہایت غربت وتنگی میں گزرے۔ اس مدت میں ان کے پاس بجز ایک جانگیہ کے کوئی اور کپڑا نہ تھا [۲]۔ اور اپنے پیر کی وفات پر تبریز سے بغداد آئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی، بانی خاندان سہروردیہ اور مصنف عوارف المعارف کی خدمت میں پہنچے۔ جس وقت یہ بغداد آئے تھے، اُس وقت شیخ شہاب الدین سہروردی بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ ضعیفی کی وجہ سے خنک سرد کھانا نہیں کھا سکتے تھے، لیکن اس بڑھاپے کے باوجود حج کو جایا کرتے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی سر پر دیگدان رکھتے جو آگ اور دیگ اُن کے ساتھ ہوتے۔ جب شیخ شہاب الدین سہروردی کے کھانے کا وقت ہوتا، گرم گرم کھانا اُن کے سامنے رکھتے [۳]۔ شیخ جلال الدین تبریزی میں جو کمی تھی اُس خدمت سے پوری ہوگئی۔ خادم سے مخدوم ہو گئے۔

۱۔ خیرالمجالس ع ۲۶ (مجلس)، ۲۔ سیرالاولیاء۔ ص ۶۳ ۳۔ فوائدالفوائد۔ ۲۳ رشعبان ۷۱۲ھ

اسی زمانہ میں شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی اپنے واپسی سفر میں بیت المقدس سے بغداد آئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے "چوب خشک" تھے، آن کی آن میں ان میں آگ لگ گئی۔ ستر ہویں دن خلافت سے سرفراز ہوئے۔ خرقہ اور خلافت نامہ لے کر گھر کی طرف چلے۔ شیخ جلال الدین تبریزی اُن کی جدائی کی تاب نہ لا سکے، شیخ شہاب الدین سہروردی کی اجازت سے ان کے ساتھ ہوئے۔ دونوں نیشا پور تک ساتھ آئے۔ یہاں کے بزرگ شیخ فریدالدین عطار سے شیخ جلال الدین تبریزی ملنے گئے۔ جب مل کر واپس آئے تو شیخ بہاء الدین ذکریا سے اُن کی یہ گفتگو ہوئی۔

شیخ بہاء الدین ذکریا۔ شہر میں کس بزرگ سے ملے۔

شیخ جلال الدین تبریزی۔ شیخ فریدالدین عطار سے۔

شیخ بہاء الدین ذکریا۔ کیا باتیں ہوئیں۔

شیخ جلال الدین تبریزی۔ مجھکو دیکھ کر شیخ فریدالدین عطار نے کہا کہ درویش کہاں سے آئے ہیں میں نے جواب دیا، بغداد سے۔ اس پر اُنھوں نے دریافت کیا کہ آج کل وہاں اللہ والے کون ہیں۔ میں خاموش رہا۔

شیخ بہاء الدین ذکریا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کا نام کیوں نہیں لیا؟

شیخ جلال الدین تبریزی۔ شیخ فریدالدین عطار کی مشغولیت کی عظمت مجھپر اتنی غالب آئی کہ میں دم بخود ہوگیا۔

اس سے شیخ بہاء الدین ذکریا کو غبار خاطر ہوا اور یہاں سے دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتان چلے آئے اور شیخ جلال الدین تبریزی خراسان ہوتے ہوئے بغداد لوٹ آئے۔ اسی زمانے میں اوش کے ایک بزرگ شیخ قطب الدین بختیار کاکی اپنے پیر شیخ معین الدین چشتی کی ملاقات کے لئے بغداد آئے جب انھوں نے اپنے پیر کو یہاں نہیں پایا تو یہ بھی دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ جلال الدین

تبریزی بھی ان کے ساتھ چلے۔ دونوں ملتان تک ساتھ آئے اور شیخ بہاء الدین ذکریا کے گھر مہمان رہے۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی دہلی چلے آئے اور شیخ جلال الدین تبریزی ملتان ہی میں رہے[1]۔ تقریباً ایک سال بعد یہ بھی دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کھتوال[2] پڑتا تھا۔ یہاں شیخ فرید الدین گنج شکر سے ملے ان کو فیضیاب کیا اور دہلی کی طرف بڑھے[3]۔

دہلی ایک بڑی سلطنت کی راجدھانی تھی۔ دین پرست۔ علم پرست۔ صوفی منش، شب زندہ دار، اور عادل بادشاہ سلطان التمش کا پایۂ تخت تھی۔ حکومت شخصی تھی، لیکن انصاف پسند تھی، متمدن تھی، مہذب تھی، صوبوں میں بغاوت کی آگ بھڑک گئی تھی لیکن اس کی آنچ دہلی تک نہیں پہنچی تھی۔ لوگ سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہندو مسلم ساتھ رہتے تھے۔ ان دونوں میں اتحاد تھا، اتفاق تھا۔ دہلی میں نہ جدال تھا، نہ قتال تھا، نہ جمنا کا پانی لال تھا۔ علمائے مشائخ اور عوام بھاگ کر باہر سے آتے تھے۔ اصلی باشندوں سے مل جل کر شیر و شکر ہو جاتے تھے۔ باہر والوں نے دہلی کو دہلی بنایا تھا، علوم و فنون کا مرکز بنایا تھا۔

جب صوفی منش بادشاہ کو ان کے آنے کی خبر ملی۔ خوشی سے ان (بادشاہ) کی باچھیں کھل گئیں۔ گھوڑا منگوایا، سوار ہوئے اور ان کے استقبال کو چلے۔ بادشاہ کے پیچھے مشائخ، علماء اور عوام کا بھی ہجوم تھا شہر کے باہر پہنچے۔ ان کو آتے دیکھا، گھوڑے سے اتر گئے، پیدل ان تک پہنچے۔ سلام کیا۔ کلام کیا۔ شیخ جلال الدین تبریزی شہر کی طرف چلے۔ سلطان بھی چلے، ہجوم بھی چلا۔ سب شہر کے قریب پہنچے۔ سلطان نے شیخ الاسلام نجم الدین صغرا سے شیخ جلال الدین تبریزی کے قیام گاہ کے لئے کہا اور کہا کہ عمارت قصر شاہی کے قریب ہو تاکہ آنے جانے، ملنے جلنے میں آسانی ہو۔ شیخ الاسلام حاسد تھے۔ ان میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ قصر شاہی کے نزدیک ایک عالیشان عمارت تھی۔ ایک عرصہ سے خالی تھی، اس میں انسان کے

۱؎ سیر العارفین (قلمی نسخہ) ص ۱۱۱ و ۳۸ - ۳۹ - ۲؎ اب یہ مقام مشائخ کی چاولی کہلاتا ہے۔ اور ملتان کے نزدیک ہے۔ ۳؎ سیر الاولیاء۔ ص - ۲۳

کے بدلے جن رہتے تھے ۔ بیت الجن کے نام سے مشہور تھی ۔ شیخ الاسلام نے شیخ جلال الدین تبریزی کے لئے اس عمارت کو منتخب کیا ۔ سلطان نے اس کو ناپسند کیا ۔ اس پر شیخ الاسلام نے کہا "کہ اگر یہ بزرگ ہیں تو مکان جن سے خالی ہو جائے گا ۔ اور اگر ناقص ہیں تو اپنی سزا کو پائیں گے " شیخ جلال الدین تبریزی نے اس جملہ کو سُن لیا ۔ کنجی منگوا کر ایک دُرویش کو دی اور اپنا حمائل شریف بھی دیا ۔ دُرویش مکان کے دروازے پر گیا اور یہ آواز دی " شیخ جلال الدین تبریزی آرہے ہیں " جن اپنے پاؤں پٹختے ہوئے شور و غُل مچاتے ہوئے ، مکان سے نکل گئے ۔ عمارت صاف ہوئی ۔ شیخ جلال الدین تبریزی آئے اور اس میں رہنے لگے ۔[1]

ان سے تقریباً ایک سال پہلے شیخ قطب الدین بختیار کاکی ، شیخ معین الدین چشتی کے خلیفۂ اول بھی دہلی آئے تھے ۔ سلطان التمش نے ان کا بھی خیر مقدم بہت جوش و خروش سے کیا تھا ، شہر میں قصر شاہی کے قریب رہنے کے لئے کہا تھا ۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی شاہی دربار کی فضا سے آگاہ تھے ، درباری علماء کی سیرت و عادت سے واقف تھے ، سلطان کے کہنے کو نہ مانا تھا اور شہر کے قریب قیام کیا تھا ۔ اس طرح سے اپنے کو شاہی دربار سے دور رکھا تھا ۔ ایک دن شیخ جلال الدین تبریزی ان سے ملنے اپنے گھر سے نکلے ۔ حُسنِ اتفاق اُسی وقت شیخ قطب الدین بختیار کاکی بھی ان کی ملاقات کے لئے شہر کی طرف چلے ۔ دونوں کی ملاقات ایک تنگ و تاریک گلی میں ہوئی ۔ دونوں ایک دُوسرے سے بغل گیر ہوئے ۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی ان کو اپنے گھر لے گئے ۔ ایک دن اور ایک رات شیخ جلال الدین تبریزی ان کے گھر مہمان رہے ۔ دوسرے دن جمعہ تھا ، دونوں نے ایک ہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی ۔ بعد نماز دونوں اپنے اپنے گھر آئے ۔[2]

شیخ جلال الدین تبریزی کی بزرگی کا معیار جو شیخ الاسلام نجم الدین صغرا نے متعین کیا تھا ، اس پر

---

[1] سیر العارفین ص ۱۰۷ - ۱۰۸ [2] ایضاً ص ۱۰۸ - ۱۰۹

یہ پورے اُترے۔ بیت الجن جنوں سے خالی ہوگیا۔ لیکن اس پر بھی شیخ الاسلام اپنی حاسدانہ حرکت سے باز نہ آئے اور اُن کے ہر فعل پر نکتہ چینی کرنے لگے۔

شیخ جلال الدین تبریزی شب بیدار تھے۔ عشار کی نماز پڑھ کر یادِ خدا میں بیٹھتے، رات بھر عبادت کرتے، عشار کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے اور سو جاتے، چاشت تک سوتے۔ ایک دن ایسے ہی، چادر اوڑھے، اپنے گھر کے آنگن میں سوئے ہوئے تھے اور ان کا غلام ان کا پاؤں داب رہا تھا۔ شیخ الاسلام سلطان کو صبح کی نماز پڑھانے قصرِ شاہی کے بالاخانہ پر آتے۔ نماز سے فارغ ہو کر سلطان کسی کام میں مشغول ہوگئے۔ شیخ الاسلام اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اتفاق سے ان کی نظر شیخ جلال الدین تبریزی پر پڑی۔ سلطان کو بلا کر لائے، ان کی طرف اشارہ کیا اور سلطان کو ان سے بدظن کرنے کے لئے، کہا "نماز کا وقت ہے یا سونے کا؟" غالباً سلطان ان کی عادت سے واقف تھے، کہا ممکن ہے نماز پڑھ کر سوتے ہوں۔" اس کا جواب شیخ الاسلام نہیں دے سکے۔ کاش! بات یہیں تک ہوتی تو برا نہ تھا۔ شیخ الاسلام حسد میں اخلاقیات کو بھول گئے اور کہا "یہ حسین غلام ان کا پاؤں کیوں داب رہا ہے۔" سلطان نے جواب دیا کہ" اس میں شک وشبہ کی کیا بات ہے۔ اور ایک بزرگ کو اس میں کیا خطرہ ہے"[1]۔ شیخ الاسلام اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور شرمندہ اپنے گھر آئے۔ ان کو ذلیل کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ سوچتے سوچتے سازش پر اُتر آئے

اس وقت دہلی میں ایک مطربہ تھی۔ گوہر کے نام سے مشہور تھی۔ حسن میں یکتا تھی۔ جمال میں لاثانی تھی۔ عیاش امرا، اوباش رؤسا اس پر مرتے تھے، لیکن کسی کے ہاتھ نہیں چڑھتی تھی۔ چھوٹے بڑے سب کے گھر جاتی تھی۔ شیخ الاسلام کے گھر بھی جاتی تھی۔ کبھی کبھی شیخ جلال الدین تبریزی کے یہاں بھی حاضر ہوتی تھی۔ شیخ الاسلام نے اس کو اپنی سازش کا آلہ بنایا۔ شیخ جلال الدین تبریزی پر الزام لانے کے لئے آمادہ کیا۔ پانچسو دینار سُرخ پر معاملہ ہوا۔ مطربہ چالاک تھی۔ آدھی رقم اُسی وقت رکھوالی۔ بقیہ احمد بقال کے ذمہ

---

[1] ایضاً ص ۱۰۹

بطور امانت کے رکھوادی۔ بات پختہ ہوگئی۔ مطربہ خوش خوش گھر گئی۔ شیخ الاسلام نے بہتان کو شہرت دی۔ گھر گھر اس کا چرچہ ہونے لگا۔ ہر شخص کی زبان پر آنے لگا۔ ایک دن شیخ الاسلام کو موقعہ ملا مطربہ کو سلطان کے سامنے حاضر کیا۔ جو کچھ انھوں نے سکھلایا تھا، بلاجھجک اور بے خوف مطربہ نے بیان کیا۔ کہنے کو تو کہہ گئی۔ لیکن کوئی شہادت پیش نہ کرسکی۔ سلطان نے شیخ جلال الدّین تبریزی کو اس بہتان سے بری قرار دیا۔ شیخ الاسلام نے شرعی نکتہ نکالا۔ اس پر سلطان نے ان کو مدعی ٹھہرایا۔ اور مقدمہ کی چھان بین اور فیصلہ کے لئے مشائخ ہند کا محضر قائم کرنے کا حکم دیا۔ فرامین جاری کئے گئے۔ ایک بڑی تعداد میں مشائخ دہلی آئے۔ شیخ بہاء الدّین ذکریا بھی آئے۔ جمعہ کے دن سب جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ سلطان نے حکم منتخب کرنے کا حق شیخ الاسلام کو دیا۔ اُنھوں نے شیخ بہاء الدّین ذکریا کو حکم چنلیا۔ بعد نماز جمعہ سب پھر اسی مسجد میں جمع ہوئے۔ اس وقت اکابر و اشراف بھی آئے۔ سب حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ مطربہ آئی۔ شیخ جلال الدین تبریزی کو بلانے ایک آدمی بھیجا گیا۔ جونہی شیخ جلال الدّین تبریزی مسجد کے دروازہ پر آئے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیخ بہاء الدّین ذکریا ان کے پاس گئے۔ ان کے جوتوں کو صاف کیا اور بغل میں دباتے ہوئے، اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ اس سے سلطان بہت متاثر ہوئے۔ مقدمہ ختم کرنے کو کہا لیکن حکم نے اس تجویز کو رد کیا۔ شیخ جلال الدّین کی جو تعظیم کی تھی، اس کی وجہ بیان کی۔ اُن کی پاکیزگی اور معصومیت پر اظہار خیال کیا۔ یہ سب شیخ الاسلام سنتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ اس سے حکم کو خیال ہوا کہ اگر مقدمہ بغیر چھان بین کے ختم کیا گیا تو شیخ الاسلام کو خیال ہوگا کہ شیخ جلال الدّین تبریزی کی تعظیم و تکریم کرکے ان کے عیب کو چھپایا گیا ہے، لہذا انھوں نے مقدمہ کی تفتیش کا حکم دیا۔ مطربہ محضر کے سامنے آئی۔ سچ بولنے کو اس سے کہا گیا۔ گو گو ہر پیشہ کے اعتبار سے مطربہ تھی لیکن خوفِ خدا شیخ الاسلام سے زیادہ رکھتی تھی۔ کانپ گئی، لرز گئی۔ سچ بولی۔ شیخ جلال الدّین تبریزی کو معصوم بتلایا۔ اپنی کمزوری کا اقرار کیا۔ شیخ الاسلام کی سازش کو فاش کیا۔ احمد بقال بھی بلایا گیا۔ اس نے

بھی وہی کہا جو مطربہ نے کہا تھا اور جو رقم اس کے ذمہ تھی ہبہ کی۔ شیخ الاسلام پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم سے ڈوب گئے۔ آنکھیں نیچی کر لیں اور جو حسد کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ ہوا۔ شیخ الاسلامی سے برطرف کر دئے گئے [۱]۔ لیکن شیخ جلال الدین تبریزی بھی اس کے بعد دہلی میں نہ رہے۔ اور وہاں سے پہلے بدایوں اور پھر لکھنوتی کا رُخ کیا۔ دہلی چھوڑتے وقت انھوں نے کہا "چوں من دریں شہر آمدم، زرِ صرف بودم۔ ایں ساعت نقرہ ام تا بیشتر چہ خواہد شد" [۲]۔ لیکن ان کا انجام نہایت شاندار ہوا۔ بدایوں اور بنگال کے ہزاروں آدمی ان سے فیض یاب ہوئے اور سیدھی راہ پر آئے۔

اسلامی تمدن کے مرکز کے لحاظ سے بدایوں دہلی سے پرانا تھا۔ یہ شہر قبلۃ الاسلام تھا۔ علماء کا مسکن تھا، مشائخ کا مخزن تھا، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم عام تھی۔ غریب امیر سب پڑھتے تھے۔ یہاں تصوف کا بھی چرچا تھا۔ کبیدہ خاطر، افسردہ دل اور مغموم شیخ جلال الدین تبریزی یہاں پہنچے۔ ان کی آمد سے شہر میں ہل چل مچ گئی۔ گھر گھر اسلام و تصوف کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے شہر کا جائزہ لیا۔ اپنا کام شروع کیا اور یہیں سے ان کے کارناموں کا آغاز ہوا۔

دہلی کے واقعہ نے ان کو اب ہوشیار اور محتاط کر دیا تھا۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے حاکم شہر قاضی کمال الدین جعفری سے ملنے گئے۔ قاضی نماز میں مشغول تھے۔ "کیا قاضی نماز ادا کرنا جانتے ہیں؟" کہہ کر واپس آئے۔ دوسرے دن قاضی ان کے یہاں آئے۔ جو جملہ شیخ کہہ کر آئے تھے، اُسے دُہرایا، اپنی نماز کی دُرستگی کی دلیل میں اُن کتابوں کا ذکر کیا جو اُنھوں نے نماز اور اس کے احکام پر لکھی تھیں اور شیخ سے سوال کیا "کیا فقراء سجدہ اور رکوع کسی اور طرح کرتے ہیں یا کوئی دوسرا قرآن پڑھتے ہیں"۔ شیخ نے ان الفاظ میں علماء اور فقراء کی نماز میں فرق بیان کیا:۔

"علماء کی نماز ایسی ہے۔ وہ کعبہ پر نظر رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ جب ان کو کعبہ

---

[۱]۔ فوائد الفوائد۔ ۱۲ رذالحجہ ۷۱۳ھ۔ [۲]۔ ایضاً

نہیں دکھائی دیتا ہے تو اس کی طرف رُخ کرتے ہیں - اور جب کوئی ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں اس کا رخ بھی نہیں دکھلائی دیتا تو قیاس کرتے ہیں - علماء کا قبلہ ان تین صورتوں کے سوا اور دوسرا نہیں ہے - لیکن فقرا جب تک عرش نہیں دیکھ لیتے ہیں، نماز ادا نہیں کرتے ہیں"

یہ باتیں قاضی کو بُری معلوم ہوئیں لیکن کچھ نہ بولے اور چپ چاپ اپنے گھر آئے - رات آئی اور سو گئے - خواب میں شیخ جلال الدین تبریزی کو عرش پر مصلیٰ بچھائے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا - لیکن اس کا کوئی اثر ان پر نہیں پڑا اور یہ اپنے خیال پر قائم رہے - صبح سویرے اُٹھے، وضو کیا، نماز پڑھی، قرآن مجید کی تلاوت کی - اتنے میں سورج نکل آیا - ناشتہ کیا، کپڑے پہنے، اپنے بیٹے برہان الدین کو ساتھ لیا اور ایک مجلس میں گئے - اتفاق کی بات اس مجلس میں شیخ بھی آئے - گفتگو شروع ہوئی، بات چیت ہونے لگی - شیخ نے کہا " اے فلاں! علماء کا کام اور رتبہ ظاہر ہے - ان کے پڑھنے کی نیت وغایت یہ ہوتی ہے کہ مدرس ہو جائیں یا قاضی یا صدر جہاں - ان کا مرتبہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا ہے - لیکن فقراء کے مرتبے بہت ہیں - پہلا مرتبہ وہ تھا جو رات قاضی کو دکھلایا گیا " شیخ کا یہ کہنا تھا کہ قاضی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے - اپنی غلطی کا اعتراف کیا - معافی کی درخواست کی - اپنے لڑکے کو شیخ کے قدموں میں ڈال دیا - اس کو شیخ کا مرید بنایا - اپنے لئے بطور تبرک ایک کلاہ لی اور اپنے گھر آئے [1]

حاکم شہر کا معتقد ہونا تھا کہ شہر میں شیخ کی بزرگی کی دھوم مچ گئی - جوق در جوق لوگ ان کی خدمت میں آنے - کچھ معتقد ہوئے، کچھ مرید بنے - ایک دن شیخ ان لوگوں کے ساتھ سوتھ ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے - یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے - ان کو اُٹھتے دیکھ کر لوگ بھی کھڑے ہو گئے - یہ سب اپنی جگہ پر کھڑے رہے - شیخ وضو کرنے پانی کے نزدیک گئے - وضو کر کے آئے - لوگوں سے کہا کہ ابھی ساتھی شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغرا دنیا سے کوچ کر گئے - یہ سنکر لوگوں نے بھی وضو کیا - شیخ نجم الدین

---

[1] فوائد الفواد - سوار رجب ۷۲۰ھ خیر المجالس ص ۱۱

صغرا کے جنازے کی غائبانہ نماز ادا کی گئی اور شیخ نے ان کی مغفرت کی دعا کی [1]

اور مشائخ کی طرح شیخ جلال الدین تبریزی بھی مردم شناس اور سیرت ساز تھے۔ مولانا علاؤالدین اُصولی جو اپنے وقت کے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، بدایوں کے علماء میں ایک مشہور عالم تھے، اور بحیثیت ایک اُستاد کے ممتاز تھے۔ اپنے بچپن میں بدایوں کی گلیوں میں آوارہ گرد پھرا کرتے تھے۔ ایک دن ان کا گذر شیخ کی قیام گاہ کی طرف ہوا۔ شیخ نے ان کو اپنے پاس بلایا، اپنا پیراہن اُتار کر ان کو پہنایا۔ پیراہن کا پہننا تھا کہ ان کی حالت بدل گئی، ان کے قلب کی ماہیت اور ہوگئی کھیل کود سب بھول گئے۔ کتاب لے کر مکتب میں گئے۔ محنت سے علم حاصل کیا۔ عالم ہوئے۔ علم سے خود مستفیذ ہوئے۔ اور اوروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچایا۔ شیخ نظام الدین اولیاء اور دوسروں کو حدیث اور فقہ کا درس دیا [2]۔

ابھی تک جو کچھ شیخ جلال الدین تبریزی نے کہا تھا وہ اور مشائخ کی زندگی کا بھی مقصد تھا۔ لیکن جو چیز اپنے ہمعصروں سے ان کو ممتاز کرتی ہے وہ ان کا غیر مسلموں کو دولتِ ایمان سے مالا مال کرنا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس وقت بدایوں شہر کے قریب ایک مواسی (حصار بند گاؤں) تھا جو کٹھنیر کہلاتا تھا۔ اس گاؤں کے باشندے زیادہ تر ڈاکو تھے۔ ان میں سے کچھ رہزنی کو چھپانے کے لئے دودھ دہی بیچنے کا پیشہ کرتے تھے۔ ایک دن ان میں سے ایک سر پر دہی کی ہانڈی لئے ہوئے شہر پہنچا۔ پھرتا پھرتا شیخ جلال الدین تبریزی کی منزل کی طرف آیا۔ شیخ کو دیکھا اور کھڑا ہوگیا، گھور کر دیکھا اور چلا اٹھا "کیا دین محمدی میں ایسے لوگ بھی ہیں؟" یہ کہہ کر دہی کی ہانڈی زمین پر رکھدی۔ اور ان کے قدموں پر گر پڑا۔ انھوں نے آواز دی۔ ان کے مرید پیالے اور چمچے لے کر آئے۔ سب نے مل کر دہی کھایا۔ کچھ شیخ نے بھی نوش فرمایا۔ اس کے بعد انھوں نے اس سے کہا "اب جاؤ"۔ بولا "کہاں جاؤں؟ کلمہ پڑھائیے۔ مسلمان بنائیے"۔ انھوں نے اس کو کلمہ

---

[1] فوائد الفوائد ۱۰ ررمضان المبارک ۷۱۵ھ۔ [2] ایضاً ۱۹ ررمضان ۷۱۶ھ۔

پڑھایا، دین حق میں داخل کیا، اپنا مرید بنایا اور اس کا نام علی رکھا[1]

کلمہ پڑھتے ہی ہندو ڈاکو کا قلب ساری آلودگیوں سے پاک ہوگیا۔ اس کا قلب، قلب مومن ہوگیا۔ اس نے رہزنی سے توبہ کی اور پاک صاف ہوگیا۔ علی کے نام نے اپنا اثر دکھلایا۔ جو زر و نقد لوٹ کھسوٹ اور چوری سے جمع کیا تھا، اُس کو راہِ خدا میں خرچ کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے پیر سے رضامندی لے کر گھر گیا۔ مومن ہونے کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ بیوی کو اپنے ساتھ نہ رہنے میں نارضامند پایا۔ مومنہ ہونے ہونے کے لئے کہا۔ وہ بہت خفا ہوئی، بگڑی، بہت کچھ برا بھلا کہا اور ایمان لانے سے انکار کیا۔ علی کچھ نہ بولے چپ چاپ اُٹھے اور اُٹھ کر سارا زر و نقد جمع کیا۔ اس کا ایک حصہ اپنی بیوی کو دیا اور یہ کہہ کر "تم میری ماں اور بہن کے مانند ہو" اس سے اپنا رشتہ قطع کیا[2] ایک لاکھ جیتل لے کر اپنے پیر کی خدمت میں آئے۔ شیخ نے یہ رقم انھیں کو رکھنے کے لئے کہا۔ چند دنوں میں انھوں نے اپنے پیر کی ہدایت کے مطابق سارا سرمایہ خدا کی راہ میں تقسیم کر دیا[3]

گو شیخ جلال الدّین کی مقبولیت عوام میں دن بدن بڑھتی جاتی تھی اور لوگ ان سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے بدایوں کو اپنا مستقل مستقر بنا سکتے تھے لیکن ہندوستان آنے سے پہلے اپنا اصول مرتب کر چکے تھے۔ سیر و سیاحت اپنا شعار بنا چکے تھے، لہٰذا اس اصول کے مطابق لکھنوتی کی طرف چلے اور بیرون ہند سے آنے والوں میں آپ پہلے بزرگ تھے جو اس کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن جانے سے پہلے بدایوں میں اپنا ایک خلیفہ چھوڑ گئے۔ خلافت کا منصب کسی مشہور و معروف عالم کو نہیں دیا۔ بلکہ نومسلم، تائب اُمّی علی کو عطا فرمایا۔

آپ کے مرید اور معتقد جانتے تھے کہ آپ پھر لوٹ کر بدایوں نہیں آئیں گے، لہٰذا آپ کی روانگی کو دن بہت سے آپ کے ساتھ چلے۔ تھوڑی مسافت کے بعد آپ کے حکم سے سب لوٹ آئے۔ لیکن

---

[1] ایضاً۔ ۲۸ صفر ۷۱۵ھ وخیر المجالس ص ۵۶۔ [2] خیر المجالس ص ۵۶۔ [3] فوائد الفوائد۔ ۲۸ صفر ۷۱۵ھ خیر المجالس ص ۵۶

علی نہیں لوٹے۔ آپ کے ساتھ چلے۔ تھوڑی دور چل کر آپ نے ان کو واپس جانے کا حکم دیا۔ "میں کس کے پاس جاؤں۔ میں آپ کے سوا کس کو رکھتا ہوں اور جانتا ہوں" انھوں نے کہا اور پھر ساتھ چلے۔ تھوڑی دور کے بعد شیخ نے پھر ان سے لوٹ جانے کو کہا "آپ میرے مخدوم و پیر ہیں۔ یہاں میں بغیر آپ کے کیا کروں گا" "پھر جاؤ! یہ شہر تمہاری حمایت میں ہے" شیخ نے کہا۔ آپ کا یہ آخری فرمان تھا۔ اب علی کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ روتے پیٹتے شہر واپس آئے۔ تازندگی یہیں رہے۔ اُمّی تھے۔ صرف نماز ادا کرنا جانتے تھے۔ لیکن صادق تھے۔ علماء و مشائخ ان کی عزت و تعظیم کرتے تھے۔ یہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور ولی اللہ تھے[1]۔ یہ سارے کرشمے شیخ جلال الدین تبریزی کے تھے۔

لکھنوتی، جہاں اب گور واقع ہے، بنگال کے آخری راجہ رائے لکھمن سن کا مغربی دارالحکومت تھا۔ اس کو بختیار خلجی نے فتح کیا تھا۔ بنگال میں مسلمانوں کا مرکز تھا۔ لیکن اب تک یہاں کسی شیخ کا قدم نہیں پہنچا تھا۔ یہاں شیخ جلال الدین آنا تھا کہ لوگ جوق در جوق ان کی خدمت میں آئے۔ مرید ہوئے۔ انھوں نے اس جگہ ایک خانقاہ تعمیر کی اور باغات اور زمین خرید کر لنگر خانے کے لئے وقف کیا۔ یہ سارا کام کر کے آگے بڑھے۔ بندر دیوحل پہنچے۔ اپنے لئے یہاں ایک تکیہ تعمیر کیا اور اس میں رہنے لگے۔ فضا حسب دلخواہ تھی۔ دل کھول کر اسلام کی اشاعت کی۔ بُت پرستوں کو خدا پرست بنایا[2]۔ جس مشن پر ہندوستان آئے تھے وہ پورا ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کے دن بھی پورے ہوئے۔ ۶۴۳ھ میں واصل بحق ہوئے[3]۔ بندرگاہ ہی میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد اس بندرگاہ کی آمدنی اُن کے لنگر خانہ کے لئے وقف کر دی گئی[4]۔

---

[1] سیر العارفین۔ ۸ (مطبوعہ) ۱۷۱ [2] خزینۃ الاصفیا ص ۲۸۳ ۔ [3] سیر العارفین ۔ ص ۱۱۴

صحیح بخاری کی فنی خصوصیات

(از جناب مولوی محمد سلیم الدین صاحب - صدیقی ایم - اے)

"یہ مقالہ موصوف نے اپنے استاذ حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی نگرانی میں جامعہ عثمانیہ کے قاعدہ کے مطابق ایم - اے (دینیات) کے سلسلہ میں لکھا تھا - حضرت مولانا نے اسے ہمارے پاس برہان میں اشاعت کے لئے بھیجدیا ہے - مولانا کو برہان اور اہل برہان سے جو بزرگانہ و مشفقانہ تعلق ہے وہ رسمی شکریہ کی سطح سے بہت بلند و بالا ہے البتہ اس کی معذرت کرنا ضروری ہے کہ مقالہ کا ابتدائی حصہ جو تمہیدی حیثیت رکھتا ہے اور جس میں لائق مقالہ نگار نے زیادہ تر خود مولانا کے مضامین کو ہی سامنے رکھ کر جمع و تدوین حدیث پر کلام کیا ہے - ہم نے اس کو حذف کر دیا ہے کیونکہ خود مولانا کا مقالہ تدوین حدیث برہان میں شائع ہو رہا ہے - اصل موضوع بحث سے متعلق صاحب مقالہ نے جو مفید معلومات خوش اسلوبی سے مرتب کرکے پیش کی ہیں وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے شایان شان ہیں اور امید ہے کہ اس سے ارباب ذوق عموماً اور مدارس عربیہ کے اساتذہ و طلباء خصوصاً فائدہ اٹھائیں گے - "برہان"

فن حدیث پر جو کچھ کام ہوا ہے اس کو ہم دو حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں ایک

تو متن حدیث کے نقطہ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ احادیث سے جو نتائج پیدا ہوں اِن کو نکال کر احادیث کے ساتھ ۔۔۔ جائے اس سلسلہ میں تھوڑا بہت کام امام مالک نے موطا تصنیف کر کے کیا تھا مگر ان کا کام اول تو بہت مختصر تھا۔ جیسا کہ سب ہی کو معلوم ہے کہ امام مالک کا یہ مجموعہ صرف پانچ سو حدیثوں تک محدود تھا اور کون نہیں جانتا کہ حدیثوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حدیثوں کی کمی موطا کے نقائص میں سے ہے ۔ ہر شخص کا نصب العین جدا ہوتا ہے اور پانچ سو حدیثوں کا یہ مختصر مجموعہ اِن کے نصب العین کے لئے بہت کافی تھا۔

دوم بڑی کمی موطا میں یہ تھی کہ صرف فقہ کے عملی ابواب تک امام مالک نے دائرہ عمل کو محدود فرما دیا تھا ظاہر ہے کہ اسلام صرف فقہ کے عملی مسائل ہی کا نام تو نہیں ۔ بلکہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انسانیت کے تمام پہلوؤں کے متعلق اپنے اندر بہترین نمونے رکھتی ہے اِس ... لئے دوسرے ابواب کا ترک امام مالک کی ذات یا کام پر کوئی حرف نہیں لا سکتا کیونکہ امام مالک کے عہد میں زیادہ طلب فقہی مسائل کی تھی اس طلب کے مطابق رسد بھی مہیا ہو گئی اور بس ۔

رہا دوسرا کام جو حدیث کے متعلق انجام دیا جا سکتا تھا ۔ وہ سند کا مسئلہ ہے امام بخاری سے پہلے مسانید کی شکل میں گو یہ کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا جا چکا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ سند کے راویوں کے جانچنے اور سند میں دوسری خصوصیتیں جو ہونی چاہئیں ان کی طرف کم توجہ کی گئی تھی ۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے ۔

وجلها بحسب الوضع جامعة   مسانید جو اس زمانے میں مدون کئے گئے

بلیٰ ما یدخل تحت التصحیح	ہیں سب کا حال یہ ہے کہ ان میں ایسی روایتیں
والتحسین والکثیر منھا	بھی شریک کرلی گئی ہیں جن میں بعض صحیح بعض
یشتملہ الضعیف فلا	حسن ہیں، اور بڑا حصہ ان روایتوں کا ضعیف
یقال لغثہ سمین [1]	ہے، پس ان کتابوں کی کمزور روایتوں کو قوی
	نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یہی دو ضرورتیں تھیں جن کی تکمیل کا تقاضا وہ زمانہ کر رہا تھا جس میں امام بخاری پیدا ہوئے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ امام بخاری نے کیا کیا۔

بخاری کی وجہ تصنیف | عام طور پر کتابوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ امام بخاری کی کتاب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ سنداً اس میں اعلیٰ ترین معیاری حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ گویا اصح ترین حدیثوں کا جمع کرنا یہی مسئلہ امام بخاری کی نظر میں سب سے زیادہ اہم تھا۔ اس خیال کی تائید میں لوگ اس قسم کی چیزوں کا بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً بخاری کی وجہ تصنیف کے سلسلہ میں حافظ ابن حجر نے اور دوسری وجوہات کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری کے استاد اسحٰق ابن راہویہ نے اپنے حلقۂ درس میں یہ خواہش ظاہر کی۔

لو جمعتم کتاباً مختصراً فی سنۃ	کاش! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کے متعلق تم لوگ ایک مختصر سی کتاب جمع کر دیتے

کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی وہ تمنائی فقرہ تھا جو کہ امام بخاری کے دل کا پہلا تیر بنا وہی دل میں چبھتا رہا اور اس عظیم الشان خدمت پر اس نے امام کو آمادہ کیا جو آج دنیا کے سامنے "صحیح بخاری" کی شکل میں موجود ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسحٰق ابن راہویہ

---

[1] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص۵

کے مذکورہ بالا فقرہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ چونکہ گذشتہ مسانید میں صحت کا التزام نہیں رکھا گیا تھا بلکہ وہ زیادہ تر ضعیف روایتوں پر تھیں اس لئے امام بخاری نے یہ کتاب لکھی۔ فرماتے ہیں:-

فحرکت ھمته لجمع الحدیث	اسی چیز نے امام بخاری کی ہمت افزائی
الذی لا یرتاب فیه امین	کی، یعنی ان حدیثوں کے جمع کرنے پر تیار
وقوی عزمه علی ذالك[1]	ہوئے جن کی صحت میں ایک امانت دار آدمی
	شک نہیں کرسکتا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں سے اسی طرح کے اقوال منقول ہیں مثلاً امام شافعیؒ کی طرف یہ جملہ منسوب کیا گیا ہے۔

اول من صنف فی الصحیح البخاری	سب سے پہلے صحیح حدیث جس شخص
ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل	نے جمع کی وہ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل
ثم تلاہ مسلم بن الحجاج	بخاری ہیں ان کے بعد مسلم بن الحجاج
القشیری[2]	القشیری نے اس کام کو انجام دیا۔

اس قسم کے فقرات نقل کرنے والوں کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک امام بخاری کے سامنے سند حدیث کے علاوہ متن حدیث کی خدمت کا کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر حدیث کی خدمت کے دونوں پہلو تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے دوسرے پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی یا اس کو کم اہمیت دی تاہم اہل علم کے ایک طبقہ سے۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ

---

[1] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص۵ [2] ہدی الساری ص۸ بحوالہ ابن صلاح

محدث دہلوی کی نظرِ دقیق سے امام کی خدمات کا اتنا اہم پہلو کیسے اوجھل رہ سکتا تھا شاہ صاحب شرحِ تراجم کے دیباچہ میں فرماتے ہیں -

وارادایضاان یفرغ جھدہ	امام بخاری نے اپنی توجہ اس مسئلہ کی طرف
فی الاستنباط من حدیث	بھی مبذول کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	وسلم کی حدیثوں سے نتائج پیدا کئے جائیں
ویستنبط من کل حدیث	اور یہ کہ ایک ایک حدیث سے متعدد مسائل
مسائل کثیرۃ جدا وھذا امر	وقوانین پیدا کئے جائیں اور یہ ایک ایسا طریقہ
لم یسبقہ الیہ غیرہ[۱]	تھا جس کی طرف امام بخاری سے پہلے کسی
	نے توجہ نہ کی تھی -

النووی شارح مسلم نے بھی متن حدیث کے متعلق امام بخاری کی حدیث کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے - فرماتے ہیں :-

لیس مقصود البخاری الاقتصار	امام بخاری کی غرض فقط یہی نہیں ہے
علی الاحادیث فقط بل مرادہ	کہ اپنی کتاب میں صرف صحیح حدیثوں کو
الاستنباط منھا والاستدلال	جمع کر دیں - بلکہ اُن کا مقصد یہ بھی ہے
لابواب ارادھا ولھذا المعنی	کہ حدیثوں سے نتائج پیدا کئے جائیں
اخلی کثیرا من الابواب عن	اور جو ابواب انہوں نے قائم کئے ہیں
اسنادللحدیث واقتصرفیہ	ان کے ثبوت میں حدیثوں سے استدلال
علی قولہ فیہ فلان عن النبی	کیا جائے یہی وجہ ہے جو بخاری کی کتاب

[۱] شرح تراجم ابواب بخاری ص۳۱۲ مطبوعہ دائرہ المعارف حیدرآباد دکن

صلی اللہ علیہ وسلم ونحو ذلک وقد یذکر المتن بغیر اسنادہ وقد یوردہ معلقا وانما فعل ھذا لانہ اراد الاحتجاج للمسئلہ التی ترجم لہا واشار الی الحدیث لکونہ معلوما وقد یکون مما تقدم وربما تقدم قریبا ویقع فی کثیر من ابوابہ الاحادیث الکثیرۃ وفی بعضہا ما فیہ حدیث واحد وفی بعضہا ما فیہ ایۃ من کتاب اللہ

کے بہت سے ابواب میں حدیث کا ذکر بغیر اسناد کے پایا جاتا ہے۔ ان ابواب میں بخاری نے صرف اس پر قناعت کیا ہے یعنی فلاں شخص سے اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کی گئی ہے یا اسی قسم کے الفاظ میں وہ حدیث کا ذکر کر دیتے ہیں، کبھی صرف حدیث کے متن کو اسناد کے بغیر ہی درج کر دیتے ہیں یعنی "معلق" روایتوں پر قناعت کی".... اور یہ سب انھوں نے اس لئے کیا ہے کہ مقصود ان کا یہ تھا کہ اس مسئلہ پر دلیل پیش کریں جسے باب کا ترجمہ بنایا ہے، اور حدیث کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ عام طور پر اہل علم کو وہ حدیث معلوم ہوتی ہے یا خود بخاری میں (سند کے ساتھ) حدیث کا ذکر پہلے آچکا ہوتا ہے یا قریب ہی میں اس حدیث کو روایت کر چکے ہیں پھر بعض بابوں میں ایک ہی حدیث بلکہ کبھی قرآن کی صرف کسی آیت ہی کا ذکر کر کے چھوڑ

صرف یہی لوگ نہیں بلکہ نووی سے پہلے مشہور محدث جلیل الاسماعیلی نے بھی امام بخاری کی خدمت کے اس پہلو کی طرف تنبیہ کی ہے۔ ابن خزیمہ نے الاسماعیلی کے ان الفاظ کو نقل کیا ہے :-

اما بعد نانی نظرت فی کتاب الجامع الذی الفہ ابو عبداللہ البخاری ورایتہ جامعا کما سمی لکثیر من السنن الصحیحہ ودالا علی جمل من المعانی الحسنۃ المستنبطہ التی لا تکمل لمثلہا الا من جمع الی معرفۃ الحدیث ونقلتہ والعلم بالروایات وعللہا علما بالفقہ واللغہ وتمکنا منہا کلہا وتبحرا فیہا ؎۱

امابعد - اس فقیر نے اس "کتاب جامع" کا مطالعہ کیا جسے ابو عبداللہ البخاری نے تالیف کیا ہے واقعی میں نے ان کی اس کتاب کو "جامع" ہی پایا، جیسے انہوں نے اس کا نام "جامع" رکھا ہے یعنی صحیح حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے ماسوا اس کے ان کی اس کتاب میں بڑا سرمایہ ان حقائق اور نتائج کا بھی درج ہو گیا ہے جنہیں حدیثوں سے وہی آدمی نکال سکتا ہے جو حدیث کا بھی عالم ہو اور حدیث کے راویوں کے حالات سے بھی واقف ہو (اور مخفی کمزوریاں روایتوں میں جو پائی جاتی ہیں) جنہیں اصطلاحاً علل کہتے ہیں ان میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو، نیز فقہ اور لغت میں بھی کافی دسترس رکھتا

؎۱ ہدی الساری صـ۶ بحوالہ امام النووی

اسماعیلی نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں ایک خاص نکتہ پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام بخاری کے نصب العین کا پتہ خود اس نام سے بھی چلتا ہے جو اپنی کتاب کا انہوں نے رکھا تھا یعنی "المسندی الجامع" "مسند بلحاظ سند حدیث اور جامع باعتبار متن حدیث ورنہ اصطلاح محدثین میں "جامع" اور "مسند" کتب حدیث کی دو مختلف اقسام ہیں۔

ان جلیل القدر ہستیوں کے اس بیان کو سامنے رکھتے ہوئے امام بخاری کی خدمت کے اس پہلو کو نظر انداز کرنا قرین انصاف نہیں معلوم ہوتا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر بخاری شریف کا بہ نظر غور مطالعہ کیا جائے تو خود بخود امام بخاری کی خدمت کا یہ پہلو سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کے تراجم اس کے لغوی و معنوی محاسن اور اور استنباط مسائل کا عجیب و غریب طریقہ اس کے ان ہی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں ایک زمانہ سے موطا اور بخاری کے متعلق ایک قدیم اختلاف چلا آرہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بخاری نے امام مالک کی پیروی کی حتیٰ کہ ترمذی کے مشہور شارح علامہ ابو بکر بن العربی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

إن كتاب الجعفي (البخاري)	الجعفی (یعنی امام بخاری) کی کتاب درحقیقت
هو الأصل الثاني والموطا هو	نقش ثانی ہے اور موطا کی حیثیت نقش اول
الأول واللباب[1]	اور بخاری کی کتاب کے مغز کی ہے۔

اور بعضوں کا خیال ہے کہ امام بخاری کا مقصد فقہ الحدیث نہیں بلکہ صرف صحیح الحدیث کا جمع کرنا تھا اس لئے وہ کہتے ہیں کہ دونوں کتابوں میں کوئی نسبت نہیں کیونکہ امام مالک نے ۔

[1] تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ص

مزجه باقوال الصحابة وفتاوی	امام مالک نے حدیثوں کو صحابہ اور تابعین
التابعين ومن بعدهم	بلکہ تابعین کے بعد والوں کے اقوال سے مخلوط کر دیا ہے۔

لیکن حافظ مغلطائی بخاری کے حنفی شارح اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لا فرق بين البخاري والموطا	(مخلوط ہونے کے لحاظ سے) بخاری کی
فی ذلك لوجوده ايضاً في	کتاب اور موطا میں کوئی فرق نہیں ہے
البخاری من التعاليق ونحوها	کیونکہ بخاری میں بھی "تعالیق" کا جو حصہ ہے اس کی حیثیت بھی تو وہی ہے (یعنی معلقات بخاری صحابہ وتابعین وغیرہ کے اقوال پر مشتمل ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری کے سامنے بھی وہی دونوں باتیں تھیں جو امام مالک کے پیش نظر تھیں مگر امام بخاری اس میدان میں امام مالک سے بازی لے گئے ہیں معرفۃ الحدیث سنداً وفقہ الحدیث معناً یہی وہ دو نظریے تھے جو ان اماموں کے پیش نظر تھے۔ سند کے لحاظ سے تو سب متفق ہیں کہ بخاری کی کتاب کا نمبر تمام کتب احادیث میں اوّل ہے رہا فقہ الحدیث تو اس میں کام کی نوعیت تو ایک ہی سی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ امام مالک کی کتاب کا کام صرف فقہی احکام تک محدود ہے اور بخاری میں علاوہ فقہی احکام کے انسانی زندگی کے دوسرے ان تمام شعبوں کو شریک کر لیا گیا ہے جن پر عموماً مذاہب میں خصوصاً اسلام میں بحث کی گئی ہے۔ اور یہ چیز بخاری کو ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔

امام بخاری کے اتباع | غرض اس بات کو ماننا ہی پڑتا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر حدیث کے یہ دونوں پہلو تھے قبل اس کے کہ ان کے کام کے ان دونوں حصوں پر بحث کی جائے یہ مناسب ہوگا کہ مختصراً ان کاموں کا ذکر بھی کردیا جائے جو فن حدیث میں امام بخاری کے بعد کئے گئے۔ کہ ان سے امام بخاری کی خدمات پر گونہ روشنی پڑتی ہے۔

حافظ ابن حجر ان کاموں کے متعلق فرماتے ہیں۔

تصنیف میں امام بخاری کے بعد بعض لوگوں نے ان کی پیروی کی جن میں حسن بن علی بھی ہیں مگر انہوں نے صرف سنن کی حد تک اپنے کام کو محدود رکھا۔ اسی گروہ میں ابو داؤد سجستانی بھی ہیں، امام بخاری کے ہم عصر ہیں انہوں نے اپنی اس کتاب میں جس کا نام انہوں نے "سنن" رکھا ہے، امام بخاری ہی کی پیروی کی کوشش کی ہے البتہ ان کی کتاب میں یہ ہے کہ صحیح روایت اگر باب میں نہ ملی تو جن روایتوں کی سند میں گونہ ضعف بھی تھا ان کے درج کرنے سے احتراز نہیں کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کے بعد ان بزرگوں نے فقہ الحدیث میں امام کی پیروی کی لیکن صحت احادیث کا التزام اس شدت سے نہ رکھ سکے۔ البتہ امام مسلم نے فقہ الحدیث کی طرف توجہ نہ کی اور صرف صحیح حدیثیں جمع کرنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ ان ہی کے متعلق حافظ نے لکھا ہے۔

وکان یقاربه فی العصر فرام مرامه	مسلم بن الحجاج کا زمانہ امام بخاری کے زمانہ
وکان یاخذ عنه او عن کتبه الا	کے قریب تھا انھوں نے اسی نصب العین کو
انه لم یضایق نفسه مضایقة	سامنے رکھا جسے بخاری نے اپنی کتاب کی

ابن عبد اللہ وروی عن جماعۃ	تصنیف میں رکھا تھا، مسلم امام بخاری سے
کثیرۃ لم یتعرض ابو عبد اللہ	یا ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں لیکن اپنی
للروایۃ۔[1]	کتاب میں مسلم نے اتنی سخت گیریوں سے کام
	نہیں لیا ہے جتنی سختی امام بخاری نے اختیار
	کی اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلم نے ان لوگوں کی بھی
	روایتیں لے لی ہیں۔جن سے بخاری نے نہ لی تھیں

حافظ ابن حجر کے ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اگلے اس قسم کا کام پیش نہ کر سکے اسی طرح بخاری کے بعد آنے والوں سے بھی اس نوعیت کا کوئی کام پیش نہیں کیا اگر کسی نے سند حدیث کی طرف توجہ کی ہے تو فقہ الحدیث کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا ہے اور کسی نے فقہ الحدیث پر دھیان دیا ہے تو سند حدیث کو نظر انداز کر دیا ہے مختصر یہ کہ یہ دونوں خوبیاں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں یہ امام بخاری اور صرف امام بخاری کا حصہ تھا کہ اس قدر حسن و باسلیقگی سے دونوں پہلوؤں پر مساویانہ کام کیا ہے اور دونوں میں کامیاب رہے ہیں پس سچ کہا گیا ہے کہ سنداً بھی۔

لم یبلغ احدٌ من التشدد مبلغ	ابو عبد اللہ کی پرواز تک نہ تشدد میں کوئی ان
ابن عبد اللہ	کے برابر ہوا،
اسی طرح فقہ الحدیث کے لحاظ سے۔	
ولا تسبب الی استنباط المعانی	اور نہ فقہ الحدیث تراجم ابواب کے متعلق
واستخراج لطائف فقہ الحدیث	نتائج کے پیدا کرنے اور دقیق لطائف کے

---

[1] ہدی الساری ص۹ [2] ہدی الساری ص۹

دتراجم الابواب[1] استنباط میں کسی کو اتنی کامیابی ہوئی جتنی کامیابی

بخاری کو ہوئی،

البتہ اس سلسلہ میں اور اس نوعیت کے کام میں اگر کسی نے کچھ امتیاز حاصل کیا ہے تو

وہ امام ترمذی کا کام ہے۔

بخاری شریف کی سندی خصوصیات

سنداً امام بخاری نے اپنی کتاب میں کن کن خصوصیتوں کو پیش نظر رکھا اس کے متعلق خود

امام بخاری سے صراحتاً کوئی چیز منقول نہیں المقدسی نے اپنی کتاب "شروط الائمۃ الخمسۃ" میں

لکھا ہے۔

ان البخاری ومسلما ومن ذکرنا	بخاری اور مسلم اور جن لوگوں کا میں نے ان کے
بعدھم لم ینقل عن واحد منھم	بعد تذکرہ کیا ہے ان میں سے کسی ایک سے
انہ قال شرطت ان اخرج	یہ منقول نہیں ہے کہ اپنی اپنی کتابوں کے متعلق
فی کتابی ما یکون علی شرط فلاں	انھوں نے اس کی تصریح کی ہو کہ فلاں فلاں شرط
	کو میں نے پیش نظر رکھا ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ فلاں روایت بخاری کی شرائط

کے مطابق ہے اور فلاں مسلم کی تو ان شرائط کی تصریح خود ان ائمہ نے نہیں فرمائی ہے۔ البتہ امام

بخاری سے اس قسم کی روایتیں منقول ہیں مثلاً ایک تو یہی کہ اسحٰق ابن راہویہ نے اشارہ کیا تھا کہ

صحیح حدیثوں کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا جائے دوسرے محمد ابن سلیمان کے حوالے سے یہ واقعہ نقل

---

[1] ہدی الساری ص۹

کیا جاتا ہے کہ بخاری نے ان سے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں اور امام بخاری کے ہاتھ میں پنکھا ہے اور مکھیوں کو آپ پر سے ہٹا رہے ہیں اس خواب کو تعبیر کے بعض ماہرین کے پاس پیش کیا جس کی تعبیر ان لوگوں نے یہ دی تھی کہ آنحضرت کی طرف جو جھوٹی باتیں منسوب کی گئی ہیں ان کے ازالہ کی توفیق امام بخاری کو بخشی جائے گی۔ امام بخاری اپنے اس کام کو اس خواب کی تعبیر قرار دیتے تھے اس کے علاوہ یہ بات بھی ان ہی سے منقول ہے جیسا کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے۔

ما ادخلت فی کتاب الجامع الا ما صح	میں نے اپنی اس کتاب "الجامع" میں نہیں داخل کیا ہے مگر اسی روایت کو جو صحیح تھی۔

کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بخاری نے اپنے مستند اساتذہ احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین اور علی بن مدینی وغیرہ کے سامنے اپنی اس کتاب کو بہ نظر اصلاح جب پیش کیا تو ان تمام بزرگوں نے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے خراج تحسین پیش کیا اور اس بات کی شہادت دی کہ ان کی مندرجہ کتاب میں روایتیں صحیح ہیں صرف چار روایتوں پر کلام کیا۔

مقدسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ صرف ان ہی دو بزرگوں یعنی امام بخاری اور مسلم نے اپنی کتابوں کی پشت پر "صحیح" کا لفظ لکھا ہے۔

مگر ان تمام اقوال و روایات سے زیادہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود ان اماموں کے نزدیک جو روایتیں صحیح تھیں ان ہی کو اپنی کتاب میں درج کرنے کی کوشش کی ہے مگر خود ان کے نزدیک صحت کے شروط کیا تھے اس کا کوئی تصریحی جواب ان کے کلام میں نہیں ملتا بلکہ بعد کو لوگوں نے ان بزرگوں کے طریقۂ عمل کا تتبع کر کے نتائج پیدا کئے ہیں جیسا کہ المقدسی نے لکھا ہے۔

انما یعرف ذلک من سبر کتبھم	ان بزرگوں کی کتابوں کی روایتوں کے جانچنے

ولیعلم بن للک شرت کل رجل منہ ۔ اور پرکھنے سے ان شرائط کا پتہ چلتا ہے اور

درحقیقت ان ہی سے ان میں ہر ایک کے علمی

مقام اور مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔

بہرحال ایک ایسے شخص کے لئے جو بخاری کی خصوصیات بیان کرنا چاہے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ایسے علماء کی جانچ پرکھ کو پیش نظر رکھے یا زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتا ہے کہ لوگوں کی اس رائے پر تھوڑی بہت تنقید و تبصرہ کر دے ۔ اس لئے ہم بھی اپنے اس کام کو اسی بنیاد پر آگے بڑھائیں گے ۔

اس سوال کے جواب میں کہ امام بخاری نے اپنی حدیثوں کی سند میں کن کن خصوصیتوں کا لحاظ رکھا ہے ۔ جن لوگوں نے امام بخاری کے طریقۂ عمل کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی کوشش کی ہے ان میں سب سے پہلے صاحب مستدرک الحاکم کی وہ رائے ہے جسے انہوں نے اپنی کتاب مدخل میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ علاوہ علم شرائط صحت کے صحابی سے بخاری تک دو دو راویوں کا ہونا ضروری ہے دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ بخاری کی ہر سند کی ہر کڑی اکہری نہیں بلکہ دوہری ہے ۔ اور یہی ایک بڑا امتیاز ہے جو دوسری کتابوں کی حدیثوں پر بخاری کی حدیثوں کو حاصل ہے ۔ لیکن بعد کو ارباب تحقیق نے حاکم کے اس دعوے کو واقعہ کے مطابق نہیں پایا ۔ المقدسی نے حاکم کی اس رائے کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ۔

ولعمری انه شرط حسن لو کان	کاش ! حاکم نے جس کلیہ کا دعویٰ کیا ہے ان
موجود آنی کتابیهما الا انا وجدنا	دونوں بزرگوں (بخاری و مسلم) کی کتابوں کی
هذه القاعدة التی ادعی الحاکم	روایتوں پر منطبق ہو جاتا ، مگر واقعہ یہ ہے کہ

منتقضة في الكتابين فمن ذلك في الصحابه ان البخاري اخرج حديث قيس ابن ابي هارون عن مرداس الاسلمي "يذهب السابقون اولا فاولا الحديث" وليس لمرداس راوٍ غير قيس واخرج البخاري عن الحسن البصري عن عمر بن تغلب اني لاعطي الرجل والذي ادع احب الي الحديث ولم يرو عن عمر غير الحسن[1]

حاکم نے جو دعویٰ کیا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے دونوں کتابوں کی روایتوں کے متعلق۔ مثلاً صحابہ ہی کے طبقہ میں لیجئے، بخاری نے قیس بن ہارون کے واسطے سے صحابی مرداس اسلمی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "یذہب السابقون الحدیث" اس حدیث کو مرداس سے قیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا ہے، اسی طرح حسن بصری کے واسطے سے بخاری نے عمر بن تغلب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "انی لاعطی الرجل والذی ادع احب الی" اس روایت کو عمر سے حسن بصری کے سوا اور کسی نے روایت نہیں کیا ہے

اسی طرح وفات ابی طالب والی حدیث جو سعید ابن المسیب عن ابیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مروی ہے اس میں بھی مسیب سے روایت کرنے والے سوائے سعید کے کوئی دوسرے راوی نہیں ہیں۔

مقدسی کی اس تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ ان مثالوں کو پیش کرکے حاکم کے اس دعوے کی تردید کردی جائے۔ کہ بخاری کی سند کی ہر کڑی صحابہ سے آخر تک دوہری ہے۔ مگر حافظ ابن حجر نے مقدسی کی اس تنقید کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

والشرط الذی ذکرہ الحاکم حاکم نے جس شرط کا ذکر کیا ہے اگرچہ بعض

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص

وان کان منتقصا فی حق بعض	صحابہ کی حد تک ان کا کلیہ ٹوٹ جاتا ہے۔
الصحابہ الذین اخرج لھم	لیکن صحابہ کے بعد کے راویوں کو پیش نظر رکھتے
فانہ معتبر فی حق من بعدھم	ہوئے اگر بخاری کی حدیثوں کی ۔۔۔ سند ول
فلیس فی الکتاب حدیث اصل	کو دیکھا جائے تو ایسی ایک حدیث بھی اللہ کی
من روایہ من لیس لہ الا راو واحد	اس کتاب میں نہ ملے گی، جس کا راوی ایک
قط [1]	ہی ہو۔

اگر حافظ کا یہ دعویٰ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو بخاری کی حدیثوں کی مزیت کے لئے یقیناً یہ بہت بڑی ضمانت ہے صحابہ بالاتفاق عدول مان لئے گئے ہیں اس لئے ان کا بیان تائید کا چنداں محتاج بھی نہیں ہے زور پہنچانے کی ضرورت تو صحابہ کی بعد والی کڑیوں میں ہے کیونکہ وہی لوگ محل کلام ہیں اگر اس لحاظ سے حاکم کا دوہری سند والا دعویٰ صحیح ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی مراد بھی یہی تھی اور شاید مقصد کے ادا کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہو یا کتابت کی غلطی ہو۔

اس کے باوجود بھی سچی بات یہی ہے کہ مطلقاً حدیث کی صحت کے لئے سلسلۂ سند کی ہر کڑی کا دوہری ہونا غیر ضروری ہے بلکہ صحت کے حقیقی اسباب وہی ہیں جن کو کسی حدیث کی صحت کے لئے عامہ محدثین ضروری قرار دیتے ہیں۔ یعنی الحازمی کے الفاظ میں۔

شرط الصحیح ان یکون اسنادہ	صحیح حدیث کی شرط یہ ہے کہ اس کی سند متصل
متصلا وان یکون راویہ غیر	ہو اور یہ کہ محدثین میں مسلم ہو، سچا ہو، تدلیس
مدلس ولا مختلطاً متصفا	کا عادی نہ ہو اور نہ اختلاط کا عارضہ اس کو

---

[1] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری مطبوعہ مطبع کبری میریہ

بصفات العدالة ضابطا متحفظا سليم الذهن قليل الوهم سليم الاعتقاد[1]

لاحق ہوا ہو عدالت کے صفات سے متصف ہو، ضبط کا سلیقہ رکھتا ہو، چوکنا بیدار ہو، ذہن اس کا سلیم ہو، وہم میں کم مبتلا ہوتا ہو، اعتقاد بھی اس کا درست ہو،

لیکن اگر کوئی شخص دوہری سند کا التزام کرلے تاکہ اس کی روایتیں تمام کی تمام قوی مانی جائیں تو اس کی اس کوشش کو بہ نظر استحسان ضرور دیکھنا چاہئے اور اس کی اس محنت وجانفشانی کی ضرور قدر ہونی چاہئے اگر امام بخاری اپنی کتاب کو صحت کے انہی شرائط کے مدنظر ترتیب دیتے جو عامہ محدثین نے قرار دی ہیں تو ان میں اور دوسرے ائمہ میں فرق ہی کیا باقی رہتا ؟ -

بخاری کی روایتوں کا امتیاز راویوں کی مدت صحبت اساتذہ کے نقطۂ نظر سے | بہرحال پہلی خصوصیت تو بخاری کی روایتوں کی یہی ہے جس کی طرف الحاکم نے اشارہ کیا ہے لیکن ماسوا اس کے اصل چیز وہ ہے جس کی تفصیل الحازمی نے کی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ اساتذہ حدیث اور ان کے تلامذہ کے تعلقات پر جب نظر کی جاتی ہے تو مدت صحبت کی کثرت کے لحاظ سے ان کے پانچ طبقات پیدا ہوتے ہیں یعنی عدل وحفظ ضبط واتقان وغیرہ عام شرائط کے علاوہ بعض تلامذہ میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ سالہاسال تک اپنے استاد کی صحبت میں سفراً وحضراً خلوتاً وجلوتاً رہے ہیں اور بعض کی صحبت کی کیفیت ایسی نہیں ہے کوئی صرف چند درس میں شریک رہا ہے کوئی صرف سفر میں اپنے استاد کی خدمت بجالاتا ہے بہرحال مدت صحبت کے لحاظ سے پہلی تو وہ کیفیت ہوئی جو اوپر بیان کردی گئی اور آخری صورت یہ نکلتی ہے کہ استاد سے صرف ایک دفعہ شاگرد کی ملاقات ہوئی ہو۔ امام بخاری کی کتاب کا سندی امتیاز یہ ہے کہ پہلے طبقہ

---

[1] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری صٹ

کے راویوں کی روایتوں کو وہ اصل کی حیثیت سے اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں اور تائید میں دوسرے درجہ کے راویوں کو بھی لے لیتے ہیں لیکن امام مسلم اول و دوم طبقہ کے راویوں کے اصل کی حیثیت سے لیتے ہیں اور تیسرے طبقہ کے راویوں کی روایتیں تائیدی طور پر درج کرتے ہیں صحیحین کی ان کتابوں میں سند کے اعتبار سے یہی فرق نظر آتا ہے پانچ طبقات میں سے باقی آخری دو طبقات کی کوئی روایت صحیحین میں نہیں ملتی۔ مثال سے اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ امام زہری جو حدیث کے ایک مرکزی راوی ہیں ان کے شاگردوں میں سے یونس بن یزید عقیل بن خالد مالک بن انس سفیان بن عیینہ شعیب بن ابی حمزہ یہ اول طبقہ کے لوگ ہیں اور امام اوزاعی لیث بن سعد عبدالرحمن بن خالد ابن ابی ذئب دوسرے طبقہ کے تلامذہ ہیں۔ جعفر بن برقان سفیان بن حسین اسحق بن یحییٰ کلبی یہ زہری کے تیسرے طبقہ کے شاگرد ہیں زمعہ بن صالح معاویہ بن یحییٰ الصدفی المثنی بن صباح طبقہ رابعہ کے ہیں اور پانچویں طبقہ کے تلامذہ عبدالقدوس بن حبیب حکم بن عبداللہ اور محمد بن سعید المصلوب ہیں ان اصحاب میں سے آخری دو طبقہ والوں کی روایات صحیحین میں نہیں لی گئی ہیں۔

رواۃ حدیث کو پانچ طبقات میں الحازمی نے جو تقسیم کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے ان کے حوالے سے فتح الباری کے مقدمہ میں اس کو نقل کیا ہے اس کے متعلق ایک بات جس کی املائی شرح میں مولانا انور شاہ کاشمیری قدس اللہ سرہ العزیز نے توجہ دلائی ہے خاص طور پر قابل لحاظ ہے یعنی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح روایتوں کے لئے راویوں میں جن صفات کی ضرورت ہے ان کے ہوتے ہوئے مزید پانچ طبقات پیدا ہوتے ہیں لیکن مولانا موصوف نے تنبیہ کی ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اور ان پانچ طبقات کی تقسیم کی صحیح شکل یہ ہونا چاہئے۔

۱۔ ضبط و اتقان میں بھی ان کا درجہ اعلیٰ ہو اور اساتذہ سے صحبت کی مدت

بھی کافی ہو۔

۲۔ضبط واتقان میں تو اعلیٰ درجہ کے ہوں لیکن صحبت کی مدت کم ہو۔

۳۔ضبط واتقان میں درجہ اعلیٰ ہو لیکن استاد سے لقا صرف ایک یا دو دفعہ ثابت ہو۔

۴۔ضبط واتقان میں بھی درجہ معیاری نہ ہو اور مدت صحبت بھی کم ہو۔

۵۔چوتھے درجے کی خصوصیات کے علاوہ ان پر کچھ جرح بھی کی گئی ہو۔

اس لحاظ سے امام بخاری پہلے درجہ کے راویوں کی روایتیں اصلاً لیتے ہیں اور تائیداً دوسرے درجہ کے راویوں کی روایات بھی لے لیتے ہیں۔ امام مسلم کے ہاں تیسرے درجہ کے لوگوں کی بھی روایات ملتی ہیں لیکن چوتھے اور پانچویں درجہ والوں کی روایتیں مسترد کر دی ہیں ابوداؤد چوتھے طبقہ تک کی روایتیں لے لیتے ہیں اور ترمذی میں پانچویں طبقہ تک کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابوداؤد اور ترمذی کے ہاں صرف چوتھے اور پانچویں درجہ والوں ہی کی روایتیں ہیں اول دوم سوم طبقہ والوں کی روایتیں نہیں ہیں جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ شیخین یعنی بخاری و مسلم کا قاعدہ تو یہ ہے کہ چہارم و پنجم طبقہ کے لوگوں کی روایتیں لیتے ہی نہیں بخلاف اس کے ابوداؤد ترمذی جب اعلیٰ معیار والی روایتیں نہیں ملتی ہیں تو چوتھے اور پانچویں طبقہ والوں کی روایتیں بھی لے لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شیخین کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین بدرجہ مجبوری آخری طبقات کی بھی روایتیں لے لیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے کہ ان طبقات کی تقسیم صرف ان ہی راویوں تک محدود ہے جو عامہ محدثین کی اصطلاح میں "مکثرین" کہلاتے ہیں یعنی جیسا کہ پہلے کہیں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ راوی جن سے بکثرت روایتیں مروی ہیں۔ جیسے زہری ایک مکثر راوی

ہیں اور ان کے شاگردوں کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے اس طرح نافع مولی ابن عمر اعمش قتادہ وغیرہ مکثرین کے تلامذہ کی طبقاتی تقسیم ہو سکتی ہے لیکن راویوں کا وہ گروہ جنہیں مکثرین میں شمار کیا جاتا ہے یا جن سے معدودے چند روایتیں مروی ہیں ان کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

فانما اعتمد الشیخان فی تخریج احادیثھم علی الثقۃ والعدالۃ وقلۃ الخطایا لکن منھم من قوی الاعتماد فاخرجا ما تفرد بہ کیحیی بن سعید الانصاری ومنھم من لم یقوا الاعتماد علیہ فاخرجا لہ ما شارکہ فیہ غیرہ وھو الاکثر[1]

شیخین بخاری و مسلم نے اس قسم کے بزرگوں کی روایتوں کے درج کرنے میں صرف ان کی ثقاہت اور عدالت اور یہ کہ ان سے غلطیاں کم سرزد ہوتی ہیں، بس ان ہی باتوں کو دیکھا ہے پھر ان میں بعض لوگ تو ایسے ہیں جن پر کافی اعتماد کیا گیا ہے اتنا اعتماد کہ صرف ان کے بھروسہ پر روایت بخاری و مسلم نے لے لی ہے، مثلاً یحیی بن سعید الانصاری کی روایتوں کا جو حال ہے، اور بعض لوگ اس سلسلہ میں ایسے ہیں جن پر اتنا زیادہ اعتماد نہیں کیا گیا ہے اسی لئے ان کی روایتیں اسی وقت لی جاتی ہیں جب ان کی تائید میں دوسرا بھی شریک ہو، اور اسی قسم کے لوگ زیادہ ہیں۔

رواۃ بخاری اور مسلم میں فرق | بخاری اور مسلم کے راویوں کے فرق کو شیخ الاسلام علامہ حافظ ابن حجر

---

[1] ہدی الساری ص

نے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب مقدمہ فتح الباری میں بیان فرمایا ہے انھوں نے پانچ فرق بیان کئے ہیں۔

۱۔ چارسو تیس آدمی ایسے ہیں جن سے بخاری میں حدیثیں لی گئی ہیں اور امام مسلم نے نہیں لی ہیں اور ان چارسو تیس آدمیوں میں سے اسی آدمی ایسے ہیں جن پر ائمہ جرح و تعدیل نے کلام کیا بخلاف اس کے مسلم کے چھ سو رواۃ ایسے ہیں جن سے بخاری نے روایت نہیں لی ہے اور ان چھ سو میں سے ایک سو ساٹھ اصحاب پر کلام کیا گیا ہے۔ اس تعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بخاری کے ایسے راوی جن پر کلام کیا گیا ہے مسلم کے راویوں کے مقابلہ میں نصف ہیں اور یہ بہت بڑا امتیاز ہے جو بخاری کو حاصل ہے۔

۲۔ بخاری کے جن راویوں پر کلام کیا گیا ہے عموماً ایسے لوگ ہیں جن سے بہت کم حدیثیں مروی ہیں مگر مسلم میں متکلم فیہ رواۃ کی روایتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے بخاری کے راویوں میں صرف ایک راوی ایسا ہے جس سے امام بخاری نے زیادہ روایتیں لی ہیں اور وہ عکرمہ ہیں جب وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ مگر مسلم کے یہاں سے راویوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مثلاً ابی الزبیر عن جابر حماد بن سلمہ عن ثابت سہیل عن ابیہ وغیرہم۔

۳۔ یہ فرق نہایت اہم ہے اور بخاری کی ترجیح کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے یعنی بخاری کے متکلم فیہ راویوں میں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جن سے براہ راست بخاری نے روایتیں اخذ کی ہیں مگر مسلم میں ان کے اساتذہ کے سوا اوپر کڑیوں میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جن پر جرح کی گئی ہے۔ اس فرق کے اہم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے جن لوگوں سے روایتیں لی ہیں ان کو دیکھنے بھالنے جانچنے پرکھنے کا براہ راست تجربہ ان کو ہوا تھا اور اپنے ان ذاتی

تجربات کی بناء پر انہوں نے ان لوگوں کی پرواہ نہ کی جنہوں نے ان پر جرح کی تھی اور یہ بات قرین قیاس بھی نہیں کہ ایسا شخص جو یہ مطمح نظر و نصب العین لے کر اُٹھا ہو کہ اپنے محبوب پیغمبر کی طرف جو جھوٹی و ضعیف روایتیں منسوب کر دی گئی ہیں اس داغ سے نبوت کے دامن کو پاک کر کے رہیگے پھر اتنی محنت و جانفشانی اس مہم کی سرانجامی میں کی گئی ہر حدیث غسل اور دو رکعت نفلوں کے بعد درج کی گئی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کہے کہ

ما ادخلت فی کتابی الجامع الا — اپنی اس کتاب میں ایسی روایت کو شریک کیا

ما صحّ — ہے جس کی صحت ثابت ہو چکی ہے۔

ایسے شخص سے یہ توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسی حدیثوں کو جس کے راویوں کے متعلق ذاتی تجربات کی بناء پر اس کو معلوم ہے کہ کہنے والے ان کو ضعیف وغیرہ قرار دیتے ہیں اس کا واقعہ سے تعلق ہے اور اس علم کے باوجود اپنی اسی کتاب میں ان ہی لوگوں کی روایتوں کو جگہ دے جس کے متعلق اس کا التزام و اعلان ہو کہ ضعیف روایتوں کو اس میں درج نہ کرے گا۔

۴۔ چوتھا فرق وہی ہے جس کی تفصیل حازمی نے طبقات رواۃ کی بنیاد پر کی ہے جس کو تفصیل سے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اس میں بھی امام بخاری کی نزاکت پسندی امام مسلم کے التزامات سے کہیں بڑھ چڑھ کر نظر آتی ہے

۵۔ پانچواں فرق مُعَنعَن روایات کے بارے میں پیدا ہوتا ہے اس نے بہت سے محدثین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے اور اسی لئے یہ مسئلہ ذرا تفصیل کا محتاج ہے

معنعن روایات | معنعن روایات سے ایسی روایتیں مراد ہیں جن میں رواۃ نے عَنعَنَہ سے کام لیا ہو یعنی ایسے الفاظ استعمال کئے ہوں جو بذات خود اس پر دلالت نہیں کرتے ہوں کہ جن شیوخ سے راوی روایت کرتا ہے اس کی یہ روایت براہ راست ان سے سنی ہوئی ہے یا بالواسطہ

روایت اس تک پہنچی ہے مثلاً "عن" کا لفظ ہے ایک شخص آج بھی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ سکتا ہے کیونکہ "عن" کے مفہوم میں اس کی گنجائش ہے (یعنی رسول اللہ سے فلاں بات نقل کی گئی ہے) بہرحال عن کا لفظ بذات خود یہ نہیں بتاتا کہ براہ راست رسول کریم سے کہنے والے نے سنا ہے یا نہیں بہرحال "عن" یا اس کے قائم مقام الفاظ جب سند میں استعمال کئے جاتے ہیں تو محدثین اس کو عنعنہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی سے مشتقات بھی پیدا کر لئے ہیں جیسے معنعن وغیرہ

واقعہ یہ ہے کہ ترتیب و تدوین احادیث کے ابتدائی دور میں جیسا کہ بعد میں تنقیح و جانچ سے معلوم ہوا وضع و اختلاق سے بھی لوگ کام لینے لگے تھے۔ یعنی اپنی اپنی مرضی و شخصی عقائد و خیالات کی موافقت کرنے والی جھوٹی حدیثیں گھڑ رہے تھے اسی طرح تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ اپنی روایتوں کو جن کے راویوں کے متعلق وہ جانتے تھے کہ ان کا نام کسی نہ کسی وجہ سے ایسے لوگوں کی فہرست میں ہے جن پر کلام کیا گیا ہے تو ان کے نام اس خوف سے کہ کہیں خود کی بیان کردہ روایت کی قیمت گر نہ جائے ظاہر نہیں کرتے تھے اور اس اخفاء کے لئے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتے تھے مثلاً ایسے موقعہ پر متکلم فیہ راوی کا نام چھوڑ کر اوپر والے غیر متکلم فیہ راوی کا نام لے دیتے تھے اور اس کو مبہم کرنے کے لئے کہ درمیان میں کوئی راوی چھوٹا ہے یا نہیں ایسے الفاظ استعمال کر دیتے تھے جو قطعی طور پر اتصال پر دلالت نہ کرتے ہوں جیسے یہی "عن" کا لفظ ہے اب اگر کبھی ان کی گرفت کی جاتی کہ اس راوی سے براہ راست کیسے روایت کر سکتے ہو تو جواب میں بلا جھجک کہہ دیتے کہ میں نے اتصال کا دعوی ہی کب کیا ہے میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ فلاں شخص سے یہ روایت مروی ہے۔

اسی طرح کبھی متکلم فیہ راوی کا جو مشہور نام ہوتا اس کو ترک کر کے غیر مشہور نام مثلاً اس کی کنیت یا لقب وغیرہ استعمال کرتے جس سے عموماً لوگ ناواقف ہوتے اور یہ سب محض اس

لئے کرتے تھے کہ لوگوں کا اعتماد روایت پر سے جاتا نہ رہے اس سلسلہ میں تحقیق و تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ بعض بعض راویوں کے سو سو تک نام رکھے گئے مثال کے طور پر محمد ابن سعید المصلوب کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے متعلق ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ سو سے بھی زیادہ ناموں سے ان کی روایتوں کو چلتا کرنے کے لئے لوگوں نے ان کو موسوم کیا ہے۔

بہر حال یہی وہ طریقہ ہے جس کو اصطلاح محدثین میں تدلیس کہتے ہیں یعنی تاریکی پھیلانا تحقیق سے پتہ چل چکنے کے بعد کہ بعض لوگ اس کے مرتکب ہوتے ہیں یہ ضروری معلوم ہوا کہ رجال کے رجسٹر میں ان کی اس عادت بد کا ذکر کر دیا جائے اور ایسے تمام حضرات کے نام آپ کو رجال میں مل جائیں گے تاکہ جب کبھی ان تدلیس پیشہ راویوں کی روایتیں لوگوں کے سامنے آئیں تو ان سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اور الیسوں کے متعلق تو ایک کلیہ ہی بنا دیا گیا یعنی مدلس جب عنعنہ سے کام لے تو بے کھٹکے اس کے روایات اس وقت تک منقطع سمجھے جائیں گے جب تک کہ بیرونی قرائن سے اتصال کا پتہ نہ چل جائے اس کلیہ کی حد تک شیخین (بخاری و مسلم) متفق ہیں۔

لیکن سوال ایسے راویوں کے متعلق پیدا ہوتا ہے جو تدلیس کے عیب سے پاک ہیں اور وہ "عن" کے ذریعہ روایت کرتے ہیں اس میں بھی ایک صورت تو یہ ہے کہ دونوں کے سن ولادت و وفات کے دیکھنے سے پتہ چل جائے کہ معاصرت دونوں میں ممکن نہیں اس صورت میں تو بالاتفاق یہ روایت منقطع سمجھی جائے گی اور اگر سنین ولادت و وفات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ معاصرت ممکن ہے یعنی ایک ہی زمانے میں دونوں پائے جا سکتے ہیں تو غیر مدلس راویوں کی روایتیں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک متصل سمجھی جائیں گی وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجماع بھی یہی ہے کہ ایسی روایتوں میں اتصال کے لئے صرف معاصرت کافی ہے۔ یعنی ان دونوں میں باہمی ملاقات کسی دلیل سے نہ بھی ثابت ہو جب بھی یہی سمجھا

جائے گا کہ راوی اور مروی عنہ میں کوئی دوسرا شخص حائل نہیں ہے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مدلس نہیں تھے تو بلاوجہ درمیان کے راوی کو حذف کرنے کی آخران کو ضرورت ہی کیا تھی۔

امام مسلم نے اس اجماع کے نقل کرنے کے بعد نام کی تصریح کئے بغیر لکھا ہے کہ اس اجماعی مسئلہ سے اختلاف کرکے بعض لوگوں نے اتصال کے لئے علاوہ معاصرت زمانی کے راوی اور مروی عنہ کی باہمی ملاقات کے ثبوت کو بھی لازمی و ضروری قرار دیا ہے خواہ یہ ملاقات ایک ہی دفعہ کیوں نہ ثابت ہو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ امام مسلم نے اگرچہ نام کی صراحت نہیں کی ہے لیکن ان کا اشارہ امام بخاری کی طرف ہے امام مسلم نے ایک نہایت طویل گفتگو کرکے اس کو رد کیا ہے۔ اس میں ان کی سب سے بڑی گرفت یہ ہے کہ صرف لقا خواہ وہ ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو جب اس کو اتصال کے لئے کافی سمجھا جا سکتا ہے تو صرف معاصرت زمانی کو بھی کافی سمجھنا چاہیئے کیونکہ اگر کسی ایک شخص کی ملاقات دوسرے سے ایک دفعہ ثابت بھی ہو تو کیا ضروری ہے کہ تمام روایات جو براہ راست ایسے شخص سے کی جائیں متصل سمجھی جائیں ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ کی ملاقات میں ایک ہی روایت سُنی ہو اور باقی روایات بالواسطہ سنی ہوں اور یہ ضروری نہیں کہ ایک دفعہ کی ملاقات میں ایک شخص ان تمام روایتوں کو سُن لے جو اس کے شیخ سے مروی ہیں۔ نتیجہ اس بحث سے یہ نکلتا ہے کہ ایک دفعہ کے لقا کی وجہ سے تمام روایات کو متصل قرار دے لینا محض راوی کے ساتھ حسن ظن ہی پر مبنی ہو سکتا ہے ورنہ عقلی طور پر تو یہی ہونا چاہیئے کہ جب تک ہر ہر روایت میں لقا ثابت نہ ہو اس کو متصل نہ سمجھا جائے اور جب بنیاد حسن ظن پر ہی ٹھیری تو معاصرت ثابت ہو جانے کے بعد بھی حسن ظن سے ہی کیوں نہ کام لیا جائے خلاصہ یہ ہے کہ اس لقا کی شرط کے اضافہ سے کچھ زیادہ قوت اتصال کے مسئلہ میں پیدا نہیں ہوتی۔ بہرحال حسن ظن ہی پر بات ٹھہر جاتی ہے اسی لئے لوگوں نے امام مسلم ہی کے

مسلک کو ترجیح دی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو یہ بحث اس قدر اہم ہے جتنی کہ اہمیت امام مسلم نے اس کو دی ہے اور نہ ان کی گرفت کوئی گرفت ہے کیونکہ جیسا کہ ارباب تحقیق نے بیان کیا ہے کہ امام بخاری کا مسلک بھی یہی ہے کہ وہ روایت کی صحت کے لئے صرف معاصرت زمانی کو کافی سمجھتے ہیں۔ البتہ اپنی خاص کتاب صحیح بخاری میں انہوں نے لقا کی شرط لگا کر گویا ایک فنی التزام کر رکھا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ خود امام بخاری نے "صحیح بخاری" کے سوا اپنی تمام دوسری کتابوں میں ایسی معنعن حدیثوں کو داخل کر لیا ہے جن میں صرف معاصرت کا ثبوت بہم پہنچا ہے اور لقا کا ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض شعراء اپنے اشعار کے ردیف و قافیہ وغیرہ میں کسی خاص صنعت کا التزام کر لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ جن اشعار میں ان کے التزامی شرائط مفقود ہوں گے وہ شعر باقی نہیں رہیں گے زیادہ سے زیادہ اگر کبھی ایسے التزامات پر اعتراضات کی گنجائش نکلتی ہے وہ صرف اسی وقت جب کوئی شخص پورے طور سے خود اپنے ہی عائد کردہ التزامات کو نباہ سکے اور ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری اپنے اس التزام میں کامیاب ہوئے ہیں۔

معنعن روایات کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے۔ امام بخاری کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وہ راوی کی کسی ایسی سند کو پیش کر دیتے ہیں جس میں اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہوں جو قطعی طور پر اتصال پر دلالت کرتے ہوں مثلاً "حدثنا" یا "اخبرنا" جیسے اتصالی الفاظ سے اسی راوی سے روایت کی ہو جس سے معنعن روایت کر رہے ہوں۔

بخاری کے رجال پر تنقید جیسا کہ پہلے بھی اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے یعنی بہت سے لوگوں نے بخاری اور مسلم کے راویوں پر سنداً تنقید بھی کی ہے جس میں دارقطنی ابو علی غسانی اور ابو مسعود دمشقی

کی تنقیدیں بہت مشہور ہیں حتیٰ کہ ابن جوزی نے تو بعض روایتوں پر موضوع ہونے تک کا الزام لگایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ رواۃ کے حالات کب قابل قبول ہوتے ہیں اور کب نہیں ہوتے۔ اس کا فیصلہ کرنا ہر عامی آدمی کا کام نہیں بلکہ فن تنقید میں انتہائی کمال جب تک حاصل نہ ہو اس وقت تک رائے قایم کرنے کا استحقاق پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر کمال کا درجہ حاصل کئے بغیر رائے قایم کر دی جائے تو اس کا صحیح ہونا قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس کا حال بالکل وہی ہے جو فقہ کا ہے فقہی مسائل میں صرف ائمہ مجتہدین ہی صحیح رائے قایم کرنے اور اپنی رائے کی بناء پر فتویٰ دینے کا حق رکھتے ہیں اور جیسے فقہ میں ترجیح ائمہ کے کمال کو پیش نظر رکھ کر دی جاتی ہے یہی حال رجال کے تنقیدی نتائج کا بھی ہے گویا اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ ان اعتراضات کی نوعیت ایسی ہے جیسے کسی فن کے ماہرین کا کسی مسئلہ پر اختلاف ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت عام قاعدہ یہی ہے کہ فن میں جس کی مہارت سب سے زیادہ مسلم ہوتی ہے اسی کی رائے پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جان و مال کے معاملہ میں بھی لوگ یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ بیمار کے مرض کی تشخیص میں اطباء و ڈاکٹروں میں جب اختلاف ہوتا ہے تو لازماً مریض کی جان اسی طبیب یا ڈاکٹر کے سپرد کر دی جاتی ہے جو ان میں سب سے بڑا سب سے زیادہ قابل و ماہر فن مانا جاتا ہے۔

اب کھلی ہوئی بات ہے کہ اس فن یعنی فن حدیث رجال و تنقید میں بخاری اور مسلم ہی (HIGHER AUTHORITY) ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا جب ان دونوں بزرگوں نے اپنی اپنی کتابوں کا نام "صحیح" رکھا اور خصوصاً صاحب بخاری سے اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں مثلاً

ما ادخلت فی الصحیح حدیثا الا بعد ان استخرت الله تعالیٰ وتیقنت صحته	میں نے اپنی اس کتاب "الصحیح" میں کوئی روایت اس وقت تک داخل نہیں کی جب تک خداوند تعالیٰ سے استخارہ نہ کر لیا اور اس کے بعد اس

روایت کی صحت کا مجھے یقین نہ حاصل ہوگیا۔

تو کیا وجہ ہے کہ ان کے قول پر بہ نسبت ان لوگوں کے جن کا درجہ فن تنقید میں ان اماموں سے فروتر ہے زیادہ اعتماد نہ کیا جائے یہی مطلب ہے امام مقدسی کے اس مشہور فقرہ کا یعنی جب کبھی کسی راوی کا نام آتا اور وہ یہ دیکھ لیتے کہ بخاری یا مسلم نے ان کی روایت قبول کی ہے تو فرماتے

هذا جاز القنطرة یعنی بذلک انه لایلتفت الی ما قیل

یہ شخص یعنی راوی پل کے پار ہوگیا مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ بخاری و مسلم نے جن راویوں کی روایت قبول کرلی ہے اس کے بعد دوسروں نے اگر ان راویوں پر کلام بھی کیا ہو تو اس کی طرف توجہ نہ کرنی چاہیئے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اجماع امت اگر ان دلائل میں سے ہے جن کے نتائج پر یقین کیا جا سکتا ہے تو اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ صحیحین کی روایتوں کی صحت پر بھی مسلمانوں کا اجماع قائم ہوچکا ہے اور غالباً اسی دلیل کی روشنی اور اسی سبب کی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صحیحین کی روایتوں کے مسترد کرنے والوں پر گمراہی کا فتویٰ دیا ہے اور "یتبع غیر سبیل المؤمنین" کے ذیل میں ان لوگوں کو داخل کیا ہے جو صحیحین کی روایتوں کے متعلق بدگمانیاں پھیلاتے پھرتے ہیں۔

آخر میں اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ بخاری کی روایتوں کی صحت پر غیر معمولی اعتماد جو کیا جاتا ہے اس کا تعلق صرف ان ہی روایتوں سے ہے جنھیں مسندات کہا جاتا ہے یعنی وہ روایتیں جو سند کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں باقی امام بخاری نے تراجم ابواب کے بیچ بیچ میں جن معلقات یعنی بغیر سند کے روایتوں کا تذکرہ کیا ہے وہ الگ چیز ہے بقول حافظ ابن حجر کے۔

فانها لیست من موضوع الکتاب "معلقات" کا تعلق کتاب کے اصل موضوع سے

وانماذکرت استیناساً واستشهاداً | سے نہیں ہے بلکہ (صحیح حدیثوں کے مقاصد سے) مانوس کرنے اور ان کی تائید میں معلقات کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

بخاری شریف کے معنوی خصوصیات

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں بخاری کی کتاب کے اس پہلو پر بہت کم توجہ کی گئی ہے جن حضرات نے تھوڑی بہت توجہ کی بھی ہے انھوں نے صرف اجمالی اشاروں سے کام لیا ہے۔ نووی اور اور اسماعیلی کے اقوال کا ذکر آچکا ہے اگر کسی نے سب سے پہلے ذرا زیادہ تفصیلی حیثیت سے بخاری کے اس معنوی پہلو کی طرف توجہ کی ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ذات بابرکات ہے اپنی کتاب ''شرح تراجم ابواب بخاری'' کے دیباچہ میں وہ ارقام فرماتے ہیں۔

اول ما صنف اهل الحدیث فی علم الحدیث جعلوه مدونا فی اربعة فنون السنة اعنی الذی یقال له الفقه مثل موطا مالك وجامع سفیان وفن التفسیر مثل کتاب ابن جریج وفن السیر مثل کتاب محمد بن اسحق وفن الزهد والرقاق مثل کتاب ابن المبارك فاراد البخاری	حدیث والوں نے علم حدیث میں پہلی دفعہ جو کتابیں تصنیف کیں تو عموماً یہ کتابیں چار فنون میں سے کسی ایک فن پر مشتمل ہوتی تھیں یعنی ''السنۃ'' یہ ان کی کتاب مشتمل ہوتی تھی دوسرے الفاظ میں اس کی تعبیر فقہ سے کرتے ہیں امام مالک کی موطا اور سفیان ثوری کے جامع کا یہی حال ہے اور دوسرا فن جس پر اس زمانے میں لوگوں نے کتابیں لکھیں فن تفسیر ہے مثلاً ابن جریج کی کتاب اسی نوعیت کی تھی تیسرا فن سیر کا ہے مثلاً محمد

رحمۃ اللہ ان یجمع الفنون الاربعۃ فی کتاب۔[۱]

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی اور چوتھا فن جس پر اس زمانے میں کتابیں لکھتے تھے زہد، بِرّ (نیکی) رقاق (دلوں میں رقت پیدا کرنے والی حدیثیں) ان امور پر مشتمل ہوتی تھیں مثلاً ابن المبارک کی کتاب کا یہی حال تھا پس بخاری نے یہ ارادہ کیا کہ ان چاروں فنون کو اپنی اس کتاب میں جمع کر دیں

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دوسری صدی ہجری کی ابتدار میں ان چار الگ الگ عنوانات پر لوگوں نے جو کتابیں لکھی تھیں امام بخاری نے چاروں کو اپنی کتاب میں سمیٹ لیا۔ اگرچہ بہ نسبت دوسروں کے شاہ صاحب نے امام بخاری کی خدمات کا ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن سچ پوچھئے تو امام کا کام اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جس کی طرف شاہ صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے جن جن پہلوؤں کو اپنے دائرۂ بحث میں لیا ہے امام بخاری نے اپنی کتاب میں ان سب ہی کا استیعاب کیا ہے اور ہر پہلو کے متعلق علاوہ صحیح حدیث کے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے انہوں نے قرآنی آیات جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکتی ہے تلاش کر کر کے اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور فقط یہی نہیں بلکہ اس مسئلہ کی تشریح میں صحابہ کرام کے آثار و تابعین و تبع تابعین کے اقوال یا افعال سے بھی اگر مدد مل سکتی ہے تو حتی الوسع امام بخاری نے ان سے استفادہ میں کمی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بخاری کی یہ کتاب معنوی خصوصیتوں کے لحاظ سے گویا ایک کامل (دیوان الاسلام) ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] شرح تراجم ابواب بخاری ص۳ مطبوعہ دائرہ المعارف حیدرآباد

سنہ ۱۹۴۳ء:- مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول لغت قرآن پر بے مثل کتاب عمہ/ مجلد للعہ/

سرمایہ:- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ/ ۱۲

اسلام کا نظام حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث قیمت ۶؎ مجلد بعہ/

خلافت بنی امیہ:- تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت ۳؎ مجلد ۳؎ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ/ ۱۲

سنہ ۱۹۴۴ء:- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت للعہ/ مجلد صہ/ ۵

نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے۔ قیمت للعہ/ مجلد صہ/ ۵

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعہ/ مجلد صہ/ ۵

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی قیمت ۲؎ مجلد للعہ/

سنہ ۱۹۴۵ء:- قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت عہ/ مجلد ۲؎

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان قیمت صہ/ مجلد بہ/

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی کتاب قیمت ۲؎

سنہ ۱۹۴۶ء:- ترجمان السنۃ:- ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹ جلد اول للعہ/ مجلد صہ/

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم قیمت للعہ/ مجلد صہ/

مسلمانوں کا نظم مملکت: مصر کے مشہور ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی کی محققانہ کتاب "النظم الاسلامیۃ" کا ترجمہ۔ قیمت للعہ/ مجلد صہ/ ۵

تحفۃ النظار:- یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تحقیق و تنقید از مترجم قیمت عاہ/ قسم اعلیٰ ۲؎

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز اور دلچسپ تاریخی کتاب قیمت عاہ/

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے۔ اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسنِ خاص** ۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** :۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ **معاونین** :۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **احبا**:۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا انکو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبا کیلئے ہے

قواعد

۱۔ برہان ہر انگریزی مہینے کی یکم تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۵ ار تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں انکی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

۴۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے۔ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

۶۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء:- اسلام میں غلامی کی حقیقت:- جدید اڈیشن جسمیں نظرثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت سے؎ مجلد للعہ؎

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عہ؎ مجلد سے؎

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:- اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم۔ قیمت سے؎ مجلد للعہ؎

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸ر

۱۹۴۰ء:- نبی عربی صلعم:- تاریخ ملت کا حصہ اول جسمیں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے جدید اڈیشن جسمیں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت عہ؎ مجلد عہ؎

فہم قرآن جدید اڈیشن جسمیں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے قیمت عہ؎ مجلد سے؎

غلامان اسلام:- اسی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات وفضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت ہے؎ مجلد سعہ؎ زیر طبع

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جسمیں حک وفک کے بعد غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے قیمت سے؎ مجلد سعہ؎

۱۹۴۱ء:- قصص القرآن جلد اول:- جدید اڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ وہارونؑ کے حالات واقعات تک۔ قیمت صہ؎ مجلد ہے؎

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب عہ؎ مجلد سے؎

بین الاقوامی سیاسی معلومات:- یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت عہ؎

تاریخ انقلاب روس ٹراٹسکی کی کتاب ارتاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن دو روپے (زیر طبع)

۱۹۴۲ء:- قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک دوسرا اڈیشن سے؎ مجلد للعہ؎

اسلام کا اقتصادی نظام:- وقت کی اہم ترین کتاب جسمیں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن للعہ؎ مجلد صہ؎

مسلمانوں کا عروج اور زوال:- صفحات ۳۵۰ جدید اڈیشن قیمت للعہ؎ مجلد صہ؎۔

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن قیمت ہے؎ مجلد سے؎ مضبوط اور عمدہ جلد قیمت للعہ؎

برہان

جلد بست و یکم شمارہ (۴)

اپریل سنہ ۱۹۴۸ء مطابق جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پچھلے دنوں مارچ کی ۲۰؍ اور ۲۱؍ کو جمعیۃ علمائے ہند کی کونسل کا دہلی میں اجلاس ہوا اور اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لیکر یہ فیصلہ کیا کہ اب آئندہ جمعیۃ سیاسیات میں براہِ راست حصہ نہیں لے گی اور جہاں تک جمعیۃ کے آرگنائزیشن کا تعلق ہے اس کی تمام سرگرمیاں مسلمانوں کے تمدنی۔ مذہبی اور تعلیمی و اقتصادی معاملات وحقوق کی اصلاح اور ان کے تحفظ تک محدود رہینگی"۔ ممکن ہے بعض عجلت پسند مسلمانوں کو اس سے یک گونہ بددلی ہو لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دانشمندانِ روزگار کا مشہور مقولہ "دُر کما دار الزمان" کے مطابق یہی فیصلہ حق بجانب ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

گذشتہ بارہ پندرہ برس میں مسلمانوں کی جو لادینی اور غیر فطری و غیر عقلی سیاست رہی ہے اس کے المناک نتائج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ اگر اس سیاست کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان کیا جاسکے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے "جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے"۔

اس قدر عظیم تباہی و بربادی کے باوجود اب بھی بعض لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو مسلمانوں پر یہ آفت پھر بھی آتی اور اس وقت ان کے لئے سر چھپانے کو کوئی بھی جگہ نہ ہوتی"۔ گذارش یہ ہے کہ ہندوستان کے تقسیم نہ ہونے کی حالت میں جو تباہی آتی وہ تو صرف محتمل اور غیر یقینی ہی ہے ممکن ہے کہ آتی اور اس سے کم ہوتی یا سرے سے آتی ہی نہیں لیکن تقسیم کی وجہ سے جو تباہی آئی ہے وہ تو ہر ایک کے سامنے ہے۔ دوپہر کے سورج کی طرح ایک بالکل واضح حقیقت ہے۔ کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ تقسیم کا مطالبہ کرنیوالے کہتے تھے اور بڑے بلند بانگ دعاوی سے کہتے تھے کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا واحد حل بھی ہے کہ دو مملکتیں بنجائیں ایک خودمختار مسلمان ریاست ہو، اور دوسری خودمختار

ہندو ریاست" ایک میں مسلمان اپنے کلچر اور اپنے مذہبی صوابدید کے مطابق جو چاہیں کریں اور دوسری ریاست میں ہندوؤں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حق ہو... لیکن تقسیم کے ایک ماہ بعد ہی صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ جو کچھ کہا گیا تھا سراسر جھوٹ اور فریب تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں مسلمانوں نے کبھی اتنی عظیم غلطی نہیں کی جتنی کہ اس لادینی سیاست و قیادت کی تائید کر کے کی ہے، ایک عربی شاعر نے بالکل سچ کہا ہے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم　　سیھدیھم طریق الھالکینا

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلام کے "سب سے بڑے محافظ" کچھ تو جان بچا کر ہندوستان سے فرار ہو گئے ہیں اور جو باقی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ دم بخود ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ناشدنی باتیں شدنی ہو رہی ہیں اور وہ دم نہیں مار سکتے اور احتجاج میں کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ گھروں میں دبکے ہوئے جان و مال کی اور عزت و آبرو کی خیر منا رہے ہیں اور بس، ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر رہا ہے اور ان لوگوں میں یہ جرأت نہیں ہے کہ کوئی جنبش بھی کر سکیں اور یہ جرأت ہو بھی تو کیونکر! یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی اپنی سیاست کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ ان کی طلب کے مطابق جب پاکستان بن گیا تو وہاں جو چاہیں کریں۔ اب یہاں ان کو کسی مطالبہ کا حق ہی کیا رہا ہے؟ یہ تو ہے ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن! اب رہی یہ بات کہ "تقسیم کے باعث مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ تو مل گئی! تو اس کی جو حقیقت ہے وہ پاکستان کے موجودہ حالات پر نظر ڈالنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ وہاں لاکھوں مسلمان ہیں جو "ازیں سو رانده وزاں سو درمانده" کے مطابق خانماں خراب پھر رہے ہیں۔ پاکستان کے پناہ گزینوں کے وزیر کے بیان کے مطابق گورنمنٹ اب تک پناہ گزینوں پر دو کروڑ روپیہ سے زائد خرچ کر چکی ہے لیکن اس کے باوجود عالم یہ ہے کہ پناہ گزین "ضاقت علیھم الارض بما رحبت" کا مکمل مصداق نہیں یہاں اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں گئے۔ اور وہاں سر چھپانے تک کے لئے اُن کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور یہ تو وہ حالات ہیں جو اب پیش آ رہے ہیں۔ آئندہ وہاں جو کچھ ہونے والا ہے اُس کا علم خدا کو ہی ہے۔ بہرحال آثار اچھے نہیں ہیں اور کوئی

نہیں کہہ سکتا کہ اس ملت بیضا کا خود اس کی بد اعمالیوں اور پیہم غلط کاریوں کے باعث کس درجہ عبرت انگیز اور المناک انجام ہونے والا ہے۔

پھر یہاں تو مسلمانوں کا جو حشر ہوا وہ تو ہوا ہی! کہا جاتا تھا کہ پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی۔ قرآن کا قانون نافذ ہوگا۔ اسلامی کلچر اور مسلمانوں کی زبان پھلے پھولے گی اور مسلمان اپنے مذہبی آئین کے مطابق زندگی بسر کرینگے۔ کہنے والے کہتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ سب ایک سیاسی چال ہے۔ اسلام اور قرآن کو اغراض کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔ جہاں پہلے سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہے وہیں کیا ہو رہا ہے جو اس نئی مملکت میں ہوگا۔ کیونکہ بقول ذوقؔ مرحوم کے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے ؛ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے"

لیکن مسلمان نہ مانے۔ انھوں نے جناح اور لیاقت علی خاں کو اسلام کا محافظ، قرآن کا محافظ، اور مسلمانوں کا سب سے بڑا کہا اور ان کے مقابلہ میں حسین احمد مدنی۔ کفایت اللہ۔ ابوالکلام آزاد کو غدار۔ ملت فروش۔ اور ہندوؤں کے زرخرید غلام کے لقب سے پکارا۔ قدرت کے انصاف سے یہ بالکل بعید تھا کہ وہ ایک قوم کی اتنی عظیم الشان غلطی اور گمراہی کو اس کی سزا دیئے بغیر یوں ہی نظر انداز کر دیتی۔ کل تک جو فریب تھا وہ آج ایک حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے اور اب کسی کی مجال نہیں کہ اس سے انکار کر سکے۔ آج اسلام کا اور قرآن کا وہ کونسا قانون ہے جس کی بے حرمتی مسلمانوں کی اس مملکت میں علی الاعلان نہیں ہو رہی ہے۔ شراب خواری، زناکاری۔ رشوت ستانی۔ ظلم و جور۔ عیاشی و فحاشی۔ مغرب زدگی وغیرہ وہ کونسا اخلاقی اور مذہبی گناہ ہے وہاں جس کا بازار گرم نہیں ہے۔ اب کوئی بتائے کہ کیا سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا ؛ دنیا میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں ؛ مسلمانوں کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی کو پہلے شہید ہونے دیا گیا۔ اور پھر اس کا ماتم تمام عالم اسلام میں ہوا۔ جگر گوشۂ رسول کو پہلے بے کسی و کس مپرسی کے عالم میں جام شہادت پینے کے لئے تنہا چھوڑا گیا۔ پھر ساری دنیا آج تک یزید پر لعنت بھیجتی ہے آخری خلیفہ

بغداد مستعصم باللہ ابن علقمی کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنا کھیلتا رہا۔ لیکن جب تاتاریوں نے خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بغداد کے در و دیوار پر مسلمانوں نے لکھا "لعن اللہ من لا یلعن ابن العلقمی" عبداللہ نے فرڈیننڈ کے ہاتھوں اندلس کا بیعنامہ کر دیا تو آج تاریخ کا ہر طالب علم اس کو ملامت کر رہا ہے جعفر و صادق نے بنگال و دکن کی مسلمان ریاستوں پر تباہی و بربادی کی مہر لگادی تو آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ... ننگ ملت، ننگ دین، ننگ وطن

پس اسی طرح آج مسلمانوں پر جو بربادی آئی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ کی عدالت اس پر جب محاکمہ کرے گی تو وہ مسلمانوں کی گذشتہ دس بارہ سال کی سیاست کے قائدین کو نہایت برے الفاظ میں یاد کریگی۔ اور آئندہ نسلیں ان لوگوں کو کبھی کسی اچھے لقب سے یاد نہ کر سکیں گے۔

گذشتہ سیاست کا سب سے زیادہ تاریک اور اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض پہلو یہ ہے کہ اسلام اور قرآن جیسی مقدس چیزوں کے نام پر ایسے لوگوں کے لئے ووٹ مانگے گئے جن کو سیرت و اعمال کے لحاظ سے اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان لوگوں کی حمایت میں حاملین شریعت پر تبرا پڑھا گیا۔ ان کو سب و شتم کیا گیا اور ان پر دنیا جہاں کی غلاظت اچھالی گئی۔ سونے کو تانبہ اور تانبہ کو سونا بتایا گیا۔ دن کو رات۔ اور رات کو دن کے لقب سے پکارا گیا۔ اور یہ سب کچھ اغراض فاسدہ کی خاطر کتاب الہی کا نام لیکر ہوا۔ بہ قول حضرت حافظ شیرازی کے یہ آسان ہے کہ ایک شخص شراب پئے۔ رندی اور بدمستی کرے۔ لیکن اگر وہ قرآن کو دام تزویر بناتا ہے تو پھر اس کے جرم کا کوئی حد و حساب ہی نہیں ہے۔ پاکستان سے اگر تھوڑا بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا تو پنجاب سندھ، اور سرحد کے مسلمانوں کو پہنچ سکتا تھا۔ یوپی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور سی پی وغیرہ کے مسلمانوں کے لئے تو اس میں کوئی منفعت ہو ہی نہیں سکتی تھی اس کے باوجود ان کا پاکستان کی حمایت میں سرگرم ہونا۔ اور یہاں کے حقوق سے صرف نظر کر لینا۔ "برائے شگون اپنی ناک کٹا لینا" یا خود کشی کر لینا نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ جو قوم عقل و خرد کے تمام تقاضوں سے اندھی ہو کر خود اپنی موت کو دعوت دے وہ قدرت کے قانون مکافات کی گرفت سے کیونکر بچ سکتی ہے۔ بد قسمتی سے مسلمان حکومت خود اختیاری "یا مسلم اسٹیٹ" کے پُر فریب لفظ سے اتنے مسحور ہوئے کہ انھوں نے ہر واضح حقیقت کو جھٹلانے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ محض حکومت کوئی چیز نہیں ہے، یہ ایک طاقت اور قوت ہے جو مفید بھی ہو سکتی ہے اور مضر بھی۔ طاقت اگر کسی عیاش طبع اور آوارہ مزاج نوجوان کے جسم میں ہوگی تو وہ اُس کا غلط

غلط استعمال کرکے خود اپنے آپ کو ہلاک کریگا۔ اور اپنی اولاد میں بھی بیماری کے جراثیم چھوڑ جائے گا اور یہ ہی طاقت اگر صالح جسم میں ہوگی تو وہ اس کا صحیح استعمال کرکے اس سے مفید کام انجام دیگا "مسجد تو شب بھر میں بن جا کرتیار ہوگئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ من کا پرانا پاپی کتنے عرصے میں نمازی بنتا ہے" جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کے سیاسی مسلک کا تعلق ہے۔ ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جمعیۃ شروع سے اب تک برابر متحدہ قومیت کی زبردست حامی رہی۔ اور اس کی تمام سیاست اسی ایک محور پر گردش کرتی رہی ہے۔ اسی بنا پر وہ تقسیم ہند کی شدید مخالف تھی اپنے مخصوص نظریہ کے ماتحت جمعیت نے تیس سال تک مسلمانوں کی رہنمائی کی، اگرچہ گذشتہ دس برسوں میں مسلمانوں کی اکثریت نے اس کی بات نہیں مانی لیکن واقعات وحقائق نے بالکل واضح طور پر ثابت کردیا گیا ہے کہ پالیسی دراصل جمعیت کی ہی ٹھیک اور درست تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر آج ہند کے مسلمان اپنے برادران وطن سے مساوات وبرابری کے سلوک کا مطالبہ کرسکتے ہیں تو محض جمعیۃ کے پچھلے کارناموں کی ہی وجہ سے کرسکتے ہیں اور آج ان کے مصائب وآفات ہیں اگر کوئی انجمن موثر اور مفید کام کرسکتی اور کر رہی ہے تو وہ صرف یہ ہی ایک جماعت ہے اور یہی وہ ایک جماعت ہے جس کی وجہ سے کانگرس اور حکومت سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کریگی" اگر یہ جماعت نہ ہوتی تو کون بتاسکتا ہے کہ آج ہند میں مسلمانوں کا کیا مقام ہوتا" متحدہ قومیت کی قائل ہونے کے باوجود۔ اب جبکہ دو مملکتیں بن گئی ہیں جمعیۃ نے پاکستان کی اپنی شاخوں سے تعلق منقطع کرلیا ہے اور ان کو ہدایت کی ہے کہ وہ پاکستان کے پرامن اور وفادار شہری کی حیثیت سے اسلام کے جمہوری اصول اور تعلیمات کی روشنی میں وہاں کے لوگوں کی خدمت کریں اور اپنے لئے ایک الگ اور جداگانہ لائحۂ عمل بنائیں۔ رہا ہندوستان کا معاملہ! تو یہاں اب جمعیۃ کوئی براہ راست سیاسی کام نہیں کریگی کیونکہ مخلوط انتخاب کے رائج ہوجانے کے بعد اب کسی فرقہ وار جماعت کیلئے خواہ وہ اپنے نظام فکر وعمل کے اعتبار سے کیسی ہی جمہوری اور ہمہ گیر ہو۔ سیاسی کام کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ اب جمعیۃ کا کام مسلمانوں کے تمدنی۔ مذہبی۔ تعلیمی اور اقتصادی معاملات کی اصلاح تک محدود رہیگا اور درحقیقت یہ ہی اصلی کام ہیں جن کو بہت پہلے سے کرنا چاہئے تھا۔ یہ کام کیا کیا ہیں اور ان کو کس طرح کرنا چاہئے اس پر ہم آئندہ اپنے خیالات کا اظہار کریں گے سطور بالا میں مسلمانوں کی گذشتہ سیاسی غلطیوں کی نسبت ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ حاشا وکلا اس سے مقصد کسی پر حملہ کرنا۔ یا کسی کی دلآزاری کرنا ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ وقت ابتلائے عام کا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کا ہے۔ نہ کہ ملامت کرنے اور بُرا بھلا کہنے کا مصیبت سب پر ہی آکر پڑی ہے اور نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ہندوؤں اور سکھوں پر بھی اور "وعند اللہ ایدی تذھب الاحقاد" بلکہ مقصد ان باتوں کے ذکر سے یہ ہے کہ جمعیۃ کی رہنمائی میں آگے بڑھنے اور اپنے مستقبل کی فکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی گذشتہ غلطیوں کا ایک مرتبہ پوری وسعت قلب ونظر سے جائزہ لے لیں اور آئندہ کے سفر میں اس کا خیال رکھیں کہ پھر اس کا اعادہ نہ ہو ہر حال ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہر حال سے مستقبل پیدا ہوتا ہے ماضی کی غلط اندیشیوں نے یہ حال بد دکھایا اگر ہم اس کو اس وقت

۶

[illegible]

تدوین حدیث

(۳)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات
جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن

کچھ بھی ہو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سارے محدثین اسی قسم کی غیر معمولی قوتیں حفظ اور یادداشت کی رکھتے تھی بلکہ انسانی کمالات کی جو عام حالت ہے یعنی ان میں اعلیٰ اوسط ادنیٰ ہر درجے کے لوگ ہوتے ہیں، یہی حال یادداشت کی اس قوت میں محدثین کا بھی تھا، آخر جہاں غیر معمولی حافظوں کی ان مثالوں کا کتابوں میں تذکرہ پایا جاتا ہے، وہیں ان ہی کتابوں میں محدثین ہی کے متعلق ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں، مثلاً الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن یمان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے "کہ ایک ایک نشست میں پان پان سو حدیثیں ان کو یاد ہو جاتی تھیں مگر ان کو بھول بھی جاتے تھے محمد بن عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ وہ زود حفظ اور زود فراموش تھے (یعنی ان کو یاد بھی جلد ہو جاتا تھا اور فوراً بھول بھی جاتے تھے" اور یہ تو خیر یاد کرنے کے بعد فوراً ہی بھول جاتے تھے علی بن الحسن بن شقیق جو صحاح کے راویوں میں ہیں ان بے چارے کے حافظہ کا آخری انجام عجیب ہوا ایک زمانہ تھا کہ عبداللہ بن المبارک کی کتابیں فر فر زبانی سناتے تھے لیکن آخر عمر میں جو ستر سے متجاوز تھی ان ہی کا یہ حال ہو گیا تھا

صار لا یمکنہ ان یقرأ فیتعی بحدیث	کہ پڑھنے کی ہی سکت باقی نہیں رہی تھی بمشکل
بالحدیثین والثلاثۃ	دو تین حدیثوں کے سنانے تک ان کی پرواز

ص ۳۳۷ تذکرہ محدود ہو کر رہ گئی تھی،

اس قسم کے واقعات اگر اسماء الرجال کی کتابوں سے ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو جیسا کہ میں نے کہا بنی آدم کی قوت یادداشت کی مختلف النوعیت والاثار کا ایک عجیب وغریب مرقع سامنے آجائے گا میرے مقصد کے لیے مندرجہ بالا چند مثالیں کافی ہیں ضمناً ان چند مثالوں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حفظ و یادداشت کی بعض غیر معمولی قوتوں کا ہماری کتابوں میں جو ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً امام بخاری یا حافظ ابوزرعہ یا زہری وغیرہ کے حافظوں کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں بعض بدگمانوں کو ان پر شاعری کا جو دھوکہ لگا ہے وہ کتنا بے بنیاد ہے ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ محض حدیث کے راوی ہونے کی وجہ سے بطور خوش اعتقادی کے خصوصاً اسماء الرجال کی کتابوں میں قطعاً کسی کی تعریف نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعتاً جن لوگوں میں جن کمالات کا پتہ چلا ہے ان کے متعلق کمالات کا اعتراف کیا گیا ہے، اور جن میں نقائص کا سراغ ملا ہے ان کی طرف نقائص کا انتساب کیا گیا ہے۔ آخر بخاری یا زہری کے حافظہ کی تعریف ائمہ رجال نے اگر اسی لیے کی ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے وہ راوی ہیں تو راوی ہونے کا شرف کیا یحییٰ بن یمان اور علی بن الحسن بن شقیق کو حاصل نہیں ہے آئندہ ان مسائل کے تفصیلی ذکر کا موقعہ جب آئے گا تو وہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ حدیث کے ان راویوں کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر جن سے روایت کی صحت وعدم صحت کا تعلق ہے ائمہ نقد نے کتنی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں جس کا جی چاہے ان کتابوں میں پڑھ سکتا ہے۔

اور انشاء اللہ اپنے مقام پر خود اس کتاب میں کافی سرمایہ اس کا آپ کو ملے گا، خیر گفتگو اس مسئلہ میں ہو رہی تھی کہ گو حدیث کے راویوں میں حفظ ویادداشت کی غیر معمولی قوت رکھنے والوں کے اس فطری ملکہ سے بھی مدد ملی ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ حدیث کا سارا دار ومدار حفظ کی ان ہی غیر معمولی قوتوں پر تھا قطعاً ایک خلاف واقعہ دعویٰ ہوگا بلکہ یاد کرنے والے جیسے قرآن کو اس وقت تک یاد کرتے چلے آرہے ہیں

یہی طریقہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی تھا یعنی ایک ایک دو دو آیتوں کو یاد کرتے ہوئے سورہ پارہ اور آخر میں پورے قرآن کے لوگ جیسے حافظ ہو جاتے ہیں آپ نے دیکھا کہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی یہی قاعدہ تھا۔ یاد کرنے کے بعد جیسے لوگ قرآن کا بار بار دور کرتے رہتے ہیں اسی طرح اپنی اپنی محفوظ حدیثوں کا محدثین بھی دور کیا کرتے تھے اور تدریجی طور پر یاد کرنے کا یہ ایسا عام طریقہ ہے کہ بالفرض اگر غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں سے استفادہ کا موقعہ حدیث کی روایت میں نہ بھی ملتا جب بھی باطمینان تمام معمولی حافظہ رکھنے والوں کی یاد پر بغیر کسی دغدغہ کے اسی طرح ہم کو بھروسہ کرنا چاہیے جیسے معمولی حافظہ رکھنے والے حفاظ قرآن کے حفظ پر ہم بھروسہ کرتے ہیں،

اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج جب دین اور اخروی ثواب کے سوا قرآن کے حفظ پر آمادہ کرنے والی کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہی ہے بلکہ دین باختوں کا ایک گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو حفظ قرآن کے رواج کے متعلق اس قسم کی باتیں صراحتًا یا کنایتًا پھیلاتا رہتا ہے کہ مسلمان بچوں کے وقت کی بربادی کا ذریعہ بنا ہوا ہے، لیکن ہمت شکنی کی ان تمام کوششوں اور حوصلہ گسلی کے اس انتہائی مخالفانہ یاس انگیز ماحول میں بھی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانوں کا ایک طبقہ اس وقت تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کو حفظ قرآن کی راہ میں نذر گذران رہا ہے۔ آئندہ اس بچے کے سامنے مستقبل کن حالات کو پیش کرے گا ان سے قطعًا بے پروا ہو کر یاد کرانے والے اپنے بچوں سے قرآن یاد کرا رہے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ لاکھوں لاکھ حفاظِ قرآن ہر سال اسلامی دنیا میں تیار ہوتے رہتے ہیں۔

اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دینی بلندیاں ہی نہیں بلکہ اسی قرآن اور حدیث کے جاننے اور ان کے یاد کرنے پر دنیا کی ترقیاں بھی جب مبنی تھیں اس وقت کا کیا حال ہوگا، دور کیوں جائیے ابن شہاب زہری جن کا مختلف حیثیتوں سے اب تک ذکر آچکا ہے ابونعیم نے حلیۃ الاولیا میں ان سے

حالات کو درج کرتے ہوئے خود ان ہی کی زبانی اس قصہ کو درج کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مروانیوں کے پہلے خلیفہ عبد الملک بن مروان کا عہدِ حکومت جیسا کہ لوگوں کو معلوم ہے خصوصًا اس کی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں مدینہ منورہ کے لیے انتہائی فقر و فاقہ آلام و مصائب کا زمانہ تھا واقعہ حرہ کے جرم میں مدینہ منورہ والوں کو مجرم ٹھیرایا گیا تھا اور اس جرم کی شدت میں دوسرے اسباب کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہوا تھا سب کا نتیجہ یہ تھا کہ مدینہ والوں پر حکومت نے زندگی کی سہولتوں کی ساری راہیں بند کر دی تھیں۔ زہری کے والد مسلم بن شہاب کا شمار بھی ممتاز مجرموں کی فہرست میں تھا اس لیے نسبتًا ان کے گھرانے کی حالت اور بھی زیادہ زبوں تھی۔ لکھا ہے کہ آخر میں معاشی مشکلات سے تنگ آکر زہری نے سفر کا ارادہ کیا چاہا کہ گھر سے باہر نکل کر قسمت آزمائی کریں۔

مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر سیدھے دار السلطنت دمشق پہونچے لیکن یہاں بھی کوئی جاننے پہچاننے والا نہ تھا کسی جگہ سفر کے ساز و سامان کو رکھ کر کہتے ہیں کہ میں جامع مسجد آیا۔ مسجد میں مختلف حلقے قائم تھے نسبتًا جو حلقہ سب سے بڑا تھا اسی میں میں بھی شریک ہو کر بیٹھ گیا اتنے میں ایک شخص جو دیکھنے میں بڑا ابھاری بھرکم غیر معمولی طور پر پُر رعب وجیہہ معلوم ہوتا تھا مسجد میں داخل ہوا اور جس حلقہ میں میں بیٹھا ہوا تھا اسی طرف اس نے رخ کیا میں نے دیکھا کہ اس کو دیکھ کر لوگوں میں جنبش پیدا ہوئی خوش آمدید کہتے ہوئے لوگوں نے اس کو جگہ دی، بیٹھنے کے بعد اس شخص نے کہنا شروع کیا کہ آج امیر المومنین (عبد الملک) کے پاس ایک خط آیا ہے اور اس میں ایک ایسے مسئلہ کا ذکر ہے جس کی وجہ سے وہ اتنے متردد ہیں کہ شاید خلافت کے بعد اس قسم کی علمی الجھن میں وہ کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ یہ دراصل ام الولد کے متعلق ایک مسئلہ تھا آل زبیر میں ایک جھگڑا پیدا ہوا تھا جس میں فیصلہ کی ضرورت تھی عبد الملک جس کی زندگی کا کافی حصہ طلب علم میں گذرا تھا اس قسم کے مسائل میں اپنے معلومات سے کافی مدد لیا کرتا تھا مگر اس مسئلہ میں

پوری بات اسے یاد نہیں رہی تھی کچھ یاد تھی اور کچھ نہ تھی چاہتا تھا کہ کسی کے پاس مسئلہ کا صحیح علم ہو تو اس سے استفادہ کیا جائے اور اسی چیز نے اس کو سخت دماغی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اس کے دربار میں اہل علم کا جو گروہ تھا کوئی اس کی تشفی نہ کر سکا مسجد میں اس وقت جو صاحب آئے تھے یہ عبد الملک کے معتمد خاص قبیصہ بن ذویب تھے مسجد اسی لیے آئے تھے کہ شاید خلیفہ کی اس حدیث کا کسی کے پاس پتہ چلے زہری نے سننے کے ساتھ کہا کہ اس حدیث کے متعلق میرے پاس کافی معلومات ہیں قبیصہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت زہری کو حلقہ سے اٹھا کر ساتھ لیے ہوئے شاہی دربار میں پہونچے خلیفہ کو بشارت سنائی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ مل گئی۔ پھر زہری کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان سے پوچھیے حدیث اور اس کے متعلقہ معلومات آپ کے سامنے عرض کریں گے عبد الملک نے سعید بن المسیب سے اپنی طالب العلمی کے زمانے میں حدیث سنی تھی زہری نے کہا کہ ان ہی سے میں اس حدیث کو روایت کرتا ہوں پھر پوری حدیث اور اس کے تفصیلات کو عبد الملک کے سامنے زہری نے پیش کیا۔

اپنی بھولی ہوئی باتیں عبد الملک کو یاد آتی چلی جاتی تھیں اور جن جن چیزوں میں شک تھا زہری کے بیان سے اس کا ازالہ ہو رہا تھا عبد الملک کا دماغ ہلکا ہوا اور اب اس نے زہری کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو تمہارا نام کیا ہے نام اور پتہ زہری نے اپنا بتایا ان کے والد جو حکومت کے سربرآوردہ مخالفین میں تھے ان کے نام کو سنتے ہی عبد الملک کا چہرہ بدل گیا اور شکایت کے الفاظ اس کی زبان سے نکلنے لگے زہری نے سورہ یوسف کی آیت یاد دلائی جو اپنے بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام نے فرمائی تھی، یعنی (لَا تَثْرِیبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ) بہرحال زہری کے علم سے عبد الملک کچھ اس درجہ متاثر ہو چکا تھا کہ ناراضی اس کی دیر تک باقی نہ رہ سکی اور معافی کا اعلان کرتے ہوئے حال پوچھا جو گذر رہی تھی زہری کو اس کے اظہار کا موقعہ ملا اس وقت کی ضرورتیں تو خیر

پوری ہوگئیں جن کی ایک طویل فہرست ابونعیم نے نقل کی ہے درحقیقت دربار میں ان کی یہی رسائی آئندہ فراغ بالیوں کا ذریعہ بنی ان کو بنی امیہ کی حکومت سے جاگیر بھی ملی تھی نقد تنخواہ کے سوا جب تک زندہ رہے بنی امیہ کے خلفار یہ یقین رکھتے ہوئے کہ طبعًا اس شخص کا میلان بنی ہاشم کی طرف ہے اور اپنے اس جذبہ کو زہری نے کبھی چھپایا بھی نہیں جب کبھی ایسا موقعہ آتا علانیہ وہ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے بنی ہاشم کے ساتھ ان کی ہمدردیاں نمایاں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے علم وفضل سے خلیفہ اور خلیفہ کا دربار اتنا متاثر تھا کہ مسلک کا یہ اختلاف حکومت کی قدر افزائیوں کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا، بنی امیہ کے چھ حکمرانوں کا دور زہری کے سامنے گذرا ہر ایک کے زمانے میں وہ معزز اور محترم رہے بلکہ ہشام جس کا قیام زیادہ تر بجائے دمشق کے رصافہ میں رہتا تھا ایک مدت تک اس نے اپنے ساتھ رکھ کر رصافہ کے شاہی کیمپ میں ان سے علم حاصل کیا۔

اور خود یہ قبیصہ بن ذویب جو مسجد سے زہری کو دربار خلافت میں لے گئے تھے اور خلیفہ کی معتمدی خاص کے عہدہ تک پہونچے تھے ان کی ترقیوں میں من جملہ دوسری خصوصیتوں کے اس خصوصیت کو بھی دخل تھا کہ ان کا شمار بھی وقت کے ممتاز محدثین میں تھا ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

کان ثقة مامونا کثیر الحدیث ۔ صفحہ ۱۳۱ ج ۵

امام بخاری نے ان ہی کے متعلق اپنی تاریخ میں یہ فقرہ نقل کیا ہے :۔

کان قبیصة اعلم الناس بقضاء زید بن ثابت ۔ صفحہ ۱۷۵ تاریخ کبیر۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانہ کے حکمرانوں کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہو جیسا کہ ابن سعد نے نافع کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہوئے کہ جوانی کے زمانہ میں عبدالملک سے زیادہ مستعد چست وچالاک جوان مدینہ میں میں نے نہیں دیکھا اور نہ اس سے زیادہ کوئی اطلب للعلم منہ ۔

ابن سعد ج ۴ ص ۱۷۴) انتہا یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں ابن ذکوان کے اس قول کو عبدالملک کے متعلق درج کیا ہے:-

کان عبد الملک بن مروان رابع اربعۃ فی الفقہ، النسک فذکر سعید بن المسیب وعروۃ بن الزبیر وقبیصہ بن ذویب وعبد الملک بن مروان۔ ص ۱۷۵ ج ۴۔

گویا علمی حیثیت سے ذکوان کے نزدیک عبد الملک سعید بن المسیب اور عروہ بن زبیر جیسے مسلم تابعی علما کی صف میں اس وقت تک داخل تھا، جب تک مدینہ منورہ میں طلب علم کی زندگی بسر کر رہا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس عہد میں "معلم العلماء" جسے مانا گیا تھا یعنی عمر بن عبد العزیز ظاہر ہے کہ مروانی حکمرانوں ہی میں ایک تھے۔

اور بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ تو خیر عہد صحابہ و تابعین کا زمانہ تھا اس کے بعد عباسیوں کا جو دور آیا ہے گو اس میں شک نہیں کہ عباسیوں کے عہد میں عقلی علوم و فنون کا بھی زور ہوا اور کیسا زور؟ لیکن قرآن اور حدیث سے عباسی خلفاء کے تعلقات بھی کافی گہرے تھے عباسی حکومت کا معمار صادق یعنی ابوجعفر منصور دوانیقی کے متعلق تو الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں یہ دلچسپ لطیفہ بھی نقل کیا ہے کہ " ابوجعفر منصور خلیفہ ہونے سے پہلے طلب علم میں سفر کیا کرتا تھا" اس زمانہ میں کسی محدث کے مکان میں ابوجعفر داخل ہونے لگا ان کے دروازہ پر جو دربان تھا اس نے کہا کہ میں یوں اندر نہ جانے دوں گا جب تک کہ دو درم میرے حوالہ نہ کرو گے۔ ابوجعفر جیسے جزرس فطرۃ ممسک و بخیل آدمی کے لیے اور وہ بھی طالب العلمی کے دنوں میں دو درم کا ادا کرنا آسان نہ تھا لیکن علم کا شوق بھی غالب تھا دربان سے خوشامد کرتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے بھائی چھوڑ دے میں بنی ہاشم کے خاندان کا آدمی ہوں مگر دربان نے نہ مانا اور درم کا تقاضا جاری رکھا

ابوجعفر نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا (عباس) کے خاندان کا آدمی ہوں اس پر بھی نہ مانا تب ابوجعفر نے کہا کہ میں قرآن کا عالم ہوں مگر دربان کا اصرار اس پر بھی نہ مانا تب ابوجعفر نے کہا کہ میں فقہ اور فرائض کا بھی عالم ہوں لیکن دربان کم بخت پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا مجبوراً ابوجعفر کو مطلوبہ درم ادا کرنے پڑے قصہ گذرنے کو تو گذر گیا لیکن ابوجعفر کے ساتھیوں کو اس ردوکد کا جب علم ہوا اور معلوم ہوا کہ دو درم کے واسطے اس شخص نے بنی ہاشم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور فرائض وفقہ ساری چیزوں کی آڑ لینے اور واسطہ اور وسیلہ بنانے کی کوشش کی تو اسی دن سے لوگوں نے اس کو دوانق (پیسہ) جس کی جمع دوانیق ہے اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے ابوالدوانیق کہنا شروع کر دیا۔

اور اسی دوانیق کی نسبت سے کبھی "الدوانیقی" بھی کہتے تھے بعض موقعوں پر اپنی اس نسبت سے وہ خوش بھی ہو اٹھے۔

اسی ابوجعفر کے زمانے میں حجاج بن ارطاۃ جو محدث اور فقیہ تھے خطیب نے نقل کیا ہے کہ "حجاج بن ارطاۃ کا گذارہ سالہاسال تک ان کی اپنی چھوکری پر تھا جو کات کر ان کے لیے سامان معیشت مہیا کرتی تھی"

لیکن یہی حدیث اور آثار کا علم تھا جس کی بدولت ان ہی حجاج بن ارطاۃ کے متعلق یہ بھی دیکھا گیا جیسا کہ خطیب ہی راوی ہیں :-

---

[1] کہتے ہیں کہ بغداد کا شہر جس قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے کچھ غیر آباد سا مقام تھا۔ دجلہ کے ساحل پر بعض تارک الدنیا عیسائی فقیروں کی دیر (خانقاہیں) اپنی بنی ہوئی تھیں شروع شروع میں اس مقام کے محل وقوع کو پسند کر کے شہر بسانے کا ارادہ جعفر نے جب کیا تو علاقے کے بعض ان ہی عیسائی درویشوں سے بھی اس نے رائے لی اس پر ایک راہب نے کہا کہ ہماری بعض کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ "دوانیقی" نامی کوئی بادشاہ اس کو بسائیگا یہ سن کر ابوجعفر بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا کہ یہ نام تو میرا ہی ہے، تاریخ بغداد اور دوسری تاریخوں میں ابوجعفر کی کنجوسیوں کے بیسیوں قصے منقول ہیں

ثم اخرجہا ابو جعفر مع ابنہ المھدی الی خراسان نقل مربسبعین مملوکا، ص ۲۳۱	پھر ابوجعفر (عباسی خلیفہ) نے حجاج بن ارطاۃ کو اپنے بیٹے مہدی کے ساتھ خراسان روانہ کیا، خراسان سے جب حجاج واپس آئے تو اس وقت ستر غلاموں کے وہ مالک تھے۔

خیال کیا جاسکتا ہے کہ دیکھنے والے جس زمانے میں اس تماشے کو دیکھ رہے تھے قطع نظر دین کے دنیا ہی کے لیے انسان کی فطرت ان حالات میں جو کچھ کرسکتی ہے کیا اس سے باز آسکتی تھی دیکھا جارہا تھا کہ ایک غریب اندھا آدمی ہے لیکن کرۂ زمین کا اپنے وقت میں جو سب سے بڑا مطلق العنان فرماں روا تھا وہ اسی نابینا کے ہاتھ دھلا رہا ہے۔ میرا اشارہ مشہور محدث ابومعاویہ الضریر کے اس قصے کی طرف ہے جس کا ذکر خود ابومعاویہ براہ راست علی مدینی سے کیا کرتے تھے کہ ہارون الرشید کے ساتھ ایک دن میں نے کھانا کھایا کھانے سے جب فارغ ہوا تو محسوس ہوا کہ دھلانے کے لیے کوئی میرے ہاتھ پر پانی ڈال رہا ہے لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ کون ہے کہ خود ہی پانی ڈالنے والے نے پوچھا کہ ابومعاویہ! تمہارے ہاتھ پر پانی کون ڈال رہا ہے میں نے عرض کیا کہ میں پہچان نہ سکا کہ کون ہے جواب میں میرے کانوں میں یہ آواز آئی کہ "میں ہی پانی ڈال رہا ہوں" ابومعاویہ کہتے ہیں کہ میں سناٹے میں آگیا اور بے ساختہ بولا آپ یا امیر المومنین؟ ہارون نے جواب میں کہا

اجلالا للعلم	(ہاں میں ہی ہوں) علم کا احترام
تاریخ بغداد ص ۸ ج ۱۴	مقصود ہے۔

یہی ابومعاویہ کہتے ہیں کہ ہارون کے سامنے میں حدیث بیان کرنے لگتا تو ادب سے ساتھ بیٹھ جاتا اور جتنی دفعہ بھی میرے منہ سے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نکلتے ہارون "صلی اللہ علی سیدی" کہتا جاتا۔ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۹۔

ان قصوں کو کہاں تک کوئی بیان کرسکتا ہے۔ یہی ہارون ہے عاصم بن علی جو بخاری کے راویوں میں ہیں ذہبی نے نقل کیا ہے کہ حدیث کے املا کی مجلس بغداد میں ان کی کبھی اتنی بڑی ہو جاتی تھی کہ جس میدان میں وہ املا کراتے تھے اس کی پیمائش سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمی اس میں شریک ہوتے تھے، عوام کی اس مجلس میں ہارون الرشید کو بھی دیکھا جاتا تھا کہ کھجور کے ایک ٹیڑھے درخت کے تنے پر بیٹھا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے لکھنے کا ثواب حاصل کر رہا ہے (دیکھو تذکرۃ الحفاظ ص ۳۵۹ ج ۱) یہی حال مامون الرشید کا تھا بلکہ جو حالات مامون الرشید کے لوگوں نے لکھے ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی کا نہیں بلکہ حدیث کا بھی حافظ تھا نو عمری ہی میں اس کا حال یہ تھا کہ عبداللہ بن ادریس محدث کے گھر باپ کے حکم سے وہ اور امین الرشید دونوں پہنچے ابن ادریس نے سو حدیثیں ان کو سنائیں مامون نے ابن ادریس کو حدیثوں کے سن لینے کے بعد مخاطب کیا اور کہا:۔

یا عم اتاذن لی ان اعیدھا من حفظی	چچا! کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں اپنی یاد
تذکرہ ص ۲۵۹ ج ۱	سے ان کل سنائی ہوئی حدیثوں کو دہرا دوں،

ابن ادریس نے سنانے کی اجازت دی۔ مامون نے اسی وقت کل حدیثیں ان کو سنا دیں واللہ اعلم مامون الرشید کا حافظہ آیا اتنا قوی تھا کہ ایک دفعہ سن لینا یاد رہ جانے کے لیے کافی ہوگیا یا پہلے سے یہ حدیثیں اسے زبانی یاد تھیں اور اس قسم کی بیسیوں باتیں مامون الرشید کے متعلق کتابوں میں منقول ہیں۔

بہرحال یہ چند مثالیں تو اس زمانے کے ان بدگمانوں کے لیے میں نے درج کی ہیں جو اپنے زمانے کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ انسانی اعمال واشغال اور اس کی ساری کوششوں کے آخری محرکات حب مال وجاہ ہی ہیں بلکہ آج کل تو اور بھی مختصر کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں کہنے

والے کہہ رہے ہیں کہ شکمی یا زیادہ سے زیادہ جنسی مطالبوں کے سوا آدمی کے ارادے اور عمل میں حرکت اور جنبش کسی اور ذریعے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

لیکن ظاہر ہے کہ ناپاکوں کو پاکوں پر اور شیر کو شبیر پر قیاس کرنے کے قدیم مغالطہ کے سوا یہ اور کیا ہے سچ تو یہ ہے کہ پیغمبروں سے روٹھے ہوئے، ان کی تعلیمات سے ٹوٹے ہوئے مسکینوں کا وہ گروہ جو رنگ و بو یا اسی قسم کے چند گنے چنے محسوسات کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہا ہے اور ان میں کروٹیں بدلتے ہوئے دم توڑ دیتا ہے، ان کو یہ واقعہ ہے کہ ان بلند احساسات اور ان احساسات کے قدوسی و لاہوتی محرکات کا قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا جو انبیاء علیہم السلام کو علم کے ایک جدید مستقل ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، اب وہ پیغمبروں ہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں، اس طرح دیکھتے ہیں، اور اس طور پر سنتے ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد پھر کسی کے دیکھنے کا ان میں انتظار باقی نہیں رہتا، پیغمبر سے سن لینے کے بعد پھر کسی سے وہ کچھ سننا نہیں چاہتے، صحیح مسلم ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بصرہ کی چھاؤنی کے معلم بنا کر عہد فاروقی میں بھیجے گئے تھے اور وہیں پر قیام فرما لیا تھا کہتے ہیں کہ بصرہ ہی کی کسی مجلس میں انسانی فطرت کے جذبہ شرم و حیا کا ذکر ہو رہا تھا حضرت عمران... لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث :-

الحیاء لا یأتی الا بخیر — نہیں حاصل ہوتا ہے حیا سے مگر صرف خیر اور بھلائی۔

اسی سلسلہ میں سنا رہے تھے کہ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب جن کا نام بشیر بن کعب تھا یمن کے رہنے والے تھے اور حمیری خانوادے سے ان کا نسلی تعلق تھا جس میں اسلام سے پہلے بھی لکھنے پڑھنے کا کافی رواج تھا بشیر کی نظر سے حکمت و اخلاق کی بعض کتابیں گذری تھیں چونکہ اخلاقی بحث

چھڑی ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سن لینے کے بعد ان سے اتنی سی غلطی ہوئی کہ بعض پرانی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے بولے کہ جی ہاں ان کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اس جذبہ کی پرورش آدمی میں سکون ووقار کی کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن کبھی کبھی ضعف اور کمزوری کا سبب بھی حیا کا جذبہ بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں حضرت عمران کو اس کے بعد دیکھا گیا کہ چہرہ ان کا سرخ ہے اور کہہ رہے تھے کہ "میں تو تجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہوں اور تو مقابلہ کرتے ہوئے اپنے صحیفوں اور کتابوں کی باتیں بیان کرتا ہے"

بات شاید بہت زیادہ بڑھ جاتی لیکن مجلس والوں نے کہنا شروع کیا "کوئی مضائقہ اور اندیشہ کا مقام نہیں یہ تو ہم ہی میں سے ہیں اے ابا نجید" (ابو نجید حضرت عمران کی کنیت تھی) تب قصہ رفت وگذشت ہوا۔ قریب قریب اسی کے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس واقعہ کی نوعیت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن عمر کے صاحبزادے بلال بن عبداللہ بیٹھے ہوئے تھے اسی مجلس میں ابن عمر نے یہ کہتے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے :-

لا تمنعوا النساء حظوظهن من المساجد	مسجدوں میں عورتوں کا جو حصہ ہے اس سے ان کو نہ روکو۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت کی نمازیں شریک ہونے کے لیے عورتیں اگر مسجد میں آنا چاہیں تو ان کو ثواب سے محروم نہ کرو اور مسجد آنے سے نہ روکو۔ بلال ابھی جوان تھے اور ان کے عہد تک حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی وجہ سے ان کی رائے اس کے خلاف تھی یہ ممکن تھا کہ اپنی رائے کو کسی اور طریقہ سے پیش کرتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن لینے کے بعد کہنے لگے کہ

"مگر میں تو اپنی بیوی کو مسجد آنے سے روکوں گا پھر جس کا جی چاہے اپنی بیوی کو آزاد چھوڑ دے"

ابن عمر کا یہ سننا تھا کہ خود بلال راوی ہیں، میری طرف متوجہ ہوئے اور تین دفعہ لعنک اللہ (خدا کی تجھ پر لعنت ہو) کہتے ہوئے فرمانے لگے :۔

"مجھ سے تو سن رہا ہے کہ میں کہہ رہا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو مساجد میں آنے سے نہ روکا جائے اور تو کہتا ہے کہ میں ان کو روکوں گا"

بلال کا بیان ہے کہ یہ فرما کر ابن عمر رونے لگے اور غصہ میں اٹھ کر چلے گئے (معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۸۳) بعض روایتوں میں ہے کہ جب تک بلال زندہ رہے ابن عمر نے ان سے گفتگو نہ کی (دیکھو فتح الباری) [1]

اور یہ قصہ تو خیر عہد صحابہ کا ہے۔ ہارون الرشید جس کے زمانے میں علوم الاوائل (یعنی اسلام سے پہلے دنیا میں جن فکری و عقلی علوم و فنون کا رواج تھا) ان سے مسلمانوں میں کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی خود اسی عباسی خلیفہ کے زمانے میں بیت الحکمت قائم ہو چکا تھا جس میں ان ہی علوم الاوائل کے تراجم و تالیف کا کام جاری تھا لیکن بایں ہمہ پیغمبر کی حدیث کے ساتھ خود ہارون کے قلب کا کیا تعلق تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ وہی ابو معاویہ ضریر یعنی نابینا محدث ہارون جن کے ہاتھ دھلاتا تھا وہی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن ہارون کی مجلس میں میں ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں خواتین اسلام کو مسجدوں میں آنے کی اجازت تھی سب سے آگے بالغ مردوں کی صف پھر بچوں کی پھر عورتوں کی رہتی تھی عورتیں جب اٹھ جاتی تھیں تب مرد صف سے باہر نکلتے تھے گو اسی کے ساتھ جب کوئی عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتیں کہ سب سے بہتر نماز ہماری کہاں ہوتی ہے تو آپ فرماتے کہ گھر کے اندرونی کمرے کی نماز دالان کی نماز سے اور دالان کی نماز برآمدے کی نماز سے اور برآمدے کی نماز تمہارے صحن کی نماز سے بہتر ہے مطلب یہ ہے کہ جہاں تک پردے میں ہو اس میں ثواب زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے عہد نبوت میں عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہیں کیا گیا لیکن اچانک مسلمانوں میں دولت و ثروت کی جو ریل پیل ہوئی تو نئی نسلوں کے اخلاق و عادات کا وہ معیار باقی نہ رہا جو عہد نبوت میں فیض نبوت سے قائم ہو گیا تھا، صدیقہ عائشہؓ جو عورتوں کے حقوق کی اسلام میں سب سے بڑی وکیلہ ہیں ان تک کا فتویٰ ہوا کہ جو حال لوگوں کا ہو گیا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہوتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے، بہر حال بتدریج یہ قصہ ختم ہو گیا اور فقہاء اسلام نے حالات کے لحاظ سے اسی کو بہتر قرار دیا۔

کر رہا تھا مجلس میں ایک قریشی امیر بھی بیٹھا تھا اس نے حدیث پر ایک عقلی اعتراض کیا، ابو معاویہ تو بے چارے نابینا تھے آنکھوں سے تو ان کو کچھ نظر نہ آیا لیکن ان کے ہوش اڑ گئے جب کان میں بار بار ہارون کی یہ آواز گونجنے لگی:۔

النطع والسیف۔ زندیق واللہ	تلوار اور نطع لاؤ (یعنی چرمی فرش جس پر بٹھا کر
یطعن فی حدیث رسول اللہ	مقتول کی گردن ماری جاتی تھی) خدا کی قسم یہ
صلی اللہ علیہ وسلم۔	زندیق (دین سے باغی ہے) رسول اللہ صلی اللہ
(ص ۸ خطیب بغدادی ج ۱۴)	علیہ وسلم کی حدیث پر اعتراض کرتا ہے۔

ابو معاویہ کہتے ہیں کہ آخر میں نے پیش قدمی کی، ہارون کو سمجھانے لگا" کہ امیر المومنین کوئی ایسی بات نہیں ہے بے چارے کی زبان سے بات بے ساختہ اور بلا ارادہ نکل پڑی ہے۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی" آخر سمجھاتے بجھاتے ٹھنڈا کرتے کرتے اس ناگہانی مصیبت کے ٹالنے میں کامیاب ہوئے۔

کسی قوم اور امت میں جس علم نے اتنا وزن حاصل کر لیا ہو جس کا تھوڑا بہت اندازہ مذکورہ بالا چند واقعات سے ہو سکتا ہے بلکہ جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں مطلق "علم" کا لفظ جب بولا جاتا تھا تو اس سے مقصود وہی جدید علم ہوتا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پہنچا تھا۔ ابن سعد نے عطا بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہتے تھے:۔

کان عطاء اذا حدث بشیٔ قلت	عطا جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا
علم او رای فان کان اثرا قال	کہ علم ہے یا رائے (ہے)، اگر حدیث ہوتی تو
علم وان کان رایا قال	کہتے کہ علم ہے اور رائے ہوتی یعنی علماء کے

ی ای ۔ ص ۳۴۵ ج ۵ پیدا کیے ہوئے استنباطی نتائج سے اگر اس کا تعلق ہوتا تو کہتے کہ رائے ہے ۔

دراصل اس "علم جدید" کے مقابلہ میں سارے افکار و آرار جو اس سے پہلے دنیا میں پائے جاتے تھے ان کا نام علوم الاوائل رکھ دیا گیا تھا اور علم بھی کیسا؟ میں تو نہیں سمجھتا کہ دنیا میں ایسا علم یا فن اس وقت تک پایا گیا ہے جس کے ایک ایک معمولی مسئلہ کا علم ایک ایک اشرفی خرچ کرکے حاصل کیا گیا ہو، مگر سنیے علم حدیث کا حال سنیے ۔ امام بخاری اور مسلم کے ایک استاد یعقوب بن ابراہیم الدورقی، بھی ہیں ان کے حال میں لکھا ہے کہ ابوہریرہؓ کی مشہور حدیث جس میں ہے کہ ماء راکد (بند پانی) میں پیشاب کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے یہی حدیث یعقوب بن ابراہیم کے پاس ایک ایسی خاص سند سے پہنچی تھی جو ارباب فن میں خاص امتیاز کی نظر سے دیکھی جاتی تھی محض اس امتیاز کا یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خطیب نے النسائی سے نقل کیا ہے کہ :۔

کان یعقوب لایحدث بھذا	یعقوب اس حدیث کو اس وقت تک بیان
الحدیث الابدینار	نہیں کرتے تھے جب تک کہ ایک دینار
ص ۱۵۶ کفایہ	ان کے سامنے نہ رکھ دیا جاتا ۔

گویا "ایک دینار" شاید کم از کم تھا جو یعقوب کو اس حدیث کے سننے والے پیش کیا کرتے تھے بہرحال میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ جس زمانہ میں اس فن کے "معلومات" کی مانگ کی یہ حالت تھی لوگوں نے دنیاوی منافع اس کے ذریعہ سے نہیں حاصل کیے ۔ جب دنیا بھی اسی راہ سے مل رہی تھی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین کے ایک طبقہ نے اس سے ضرور نفع اٹھایا ہے اگرچہ ان کے اس طرز عمل کو عموماً اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن وہ بے چارے

اپنا جو عذر بیان کرتے تھے دنیا کے ضرورت مندوں کو اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان کے عذر کو سننا چاہیے مثلاً اس معاملہ میں سب سے زیادہ بدنام اس طبقہ میں دو آدمی ہیں ایک تو مکہ معظمہ کے مجاور اور حافظ حدیث علی بن عبدالعزیز مکّی ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میرے طرزِ عمل کے لوگ شاکی ہیں تو لکھا ہے کہ بیچارے نے شاگردوں کو مخاطب کرکے ایک دن کہا کہ :۔

یاقوم انا بین الاخشبین	بھائیو! میں دو پہاڑوں کے درمیان زندگی گذار رہا
اذا خرج الحاج نادی	ہوں (یعنی مکہ میں رہتا ہوں جس کا حال یہ ہے کہ)
ابوقبیس قعیقعان من	جب حج کرنے والے اس شہر سے چلے جاتے ہیں
بقی فیقول بقی المجاورون	تو مکہ کی پہاڑی ابوقبیس اپنے مقابل والی پہاڑی
فیقول اطبق	قعیقعان کو پکارتی ہے کہ اس شہر میں اب کون باقی
ص ۱۵۶	رہ گئے جواب ملتا ہے کہ صرف وہی لوگ جو حرم
کفایۃ	کے مجاور ہیں پس ایک پہاڑی دوسری سے
	کہتی ہے کہ منطبق ہو جاؤ (یعنی ایک دوسرے
	سے مل جاتی ہے گویا پیٹ بند ہو جاتا ہے،
	اب نہ کوئی آسکتا ہے نہ جاسکتا ہے۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ حج کے موسم کے بعد مکہ معظمہ خالی ہو جاتا ہے اور بیرونی دنیا سے اس شہر کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے ایسی صورت میں حجاج جو ان سے علم حاصل کرتے تھے اگر کچھ سرمایہ ان سے لے کر اپنے پاس میں نہ رکھ لیا کروں تو مکہ جیسے شہر میں ان کی گذر اوقات کی کیا شکل ہو سکتی تھی خصوصاً اس زمانے میں جب دنیا آمد و رفت کی ان سہولتوں سے ناآشنا تھی جن سے اس

زمانے میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے جلیل محدث حافظ فضل بن دکین ابونعیم ہیں بخاری و مسلم اور صحاح کی کتابیں ان کی حدیثوں سے معمور ہیں لیکن ان سے بھی لوگوں کو اسی کی شکایت تھی کہ حدیث پر معاوضہ لیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے بھی ایک دن لوگوں سے کہا:۔

یلومونني علی الاجر وفي بیتي	معاوضہ لینے پر لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں۔
ثلاثة عشر ومافي بیتي رغیف	ان کو معلوم ہونا چاہیے آج تیرھواں دن ہے
ص ۲۷۵ ج ۸	کہ میرے گھر میں روٹی نہیں ہو پہنچ سکی۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسی حالت میں اگر دینے والوں سے یہ لوگ کچھ لے لیا کرتے تھے تو خود ہی سوچنا چاہیے کہ آخر وہ کیا کرتے[1]۔ خصوصاً جس زمانہ سے ہم گذر رہے ہیں اُس کے لحاظ سے میں تو

---

[1] واقعہ یہ ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ایک زمانہ تک اگرچہ قرآن و حدیث کی تعلیم ہی نہیں بلکہ قضا تک کے معاوضہ کو مسلمان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے لیکن بااین ہمہ حکومت یا عام مسلمانوں میں جو اصحاب ثروت و دولت تھے وہ دینی خدمات کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک اپنا فرض خیال کرتے تھے اور لینے والوں پر لوگ اعتراض نہیں کرتے تھے جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے اپنا اپنا لوگوں کا مذاق تھا بعض لوگ نہ سلطان سے لیتے تھے نہ اخوان سے۔ سلطان سے مراد حکومت اور عام مسلمانوں میں جو ان کے عقیدت مند ہوتے تھے ان کو اخوان کہتے تھے بعض لوگ دونوں سے لیتے تھے اور بعض لوگ کسی ایک سے لینا پسند کرتے تھے، جہاں تک میرا خیال ہے ان دو بزرگوں نے یعنی ابونعیم اور علی بن عبدالعزیز سے لوگوں کو جو شکایت پیدا ہوئی اس کی وجہ دوسری تھی، مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو داد و ستد کے مسئلہ میں ایک ایسی حد پر پہنچ جاتے ہیں جس سے لوگوں کا شاکی ہو جانا ایک طبعی امر ہے کہنے کو اپنے آپ کو اس قسم کے حضرات یہی کہتے ہیں کہ ہم لین دین میں بڑے کھرے ہیں اس موقعہ پر یہ جملہ کہ حساب جو جو بخشش سو سو انکی زبانوں پر جاری ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کی جبلی کمزوری اور تنگ دلی ہوتی ہے اچھی تعبیروں سے اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالتے ہیں (بقیہ صفحہ ۵۲ اپر)

نہیں سمجھتا کہ یہ بھی کوئی تعجب کی بات ہو سکتی ہے آج جب دنیا سے مفت پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہی ختم ہو چکا ہے من جملہ دوسری مزدوریوں کے تعلیمی مزدوری بھی ایک مستقل پیشہ اور روزگار کی حیثیت حاصل کر چکی ہے معلّمی کرنے والے گروہ میں صد فی صد معاوضہ اور مبادلہ ہی پر جب کام کر رہے ہیں تو اُس زمانہ میں ہزار ہا ہزار آدمیوں میں ایک دو صاحب اور وہ بھی انتہائی مجبوریوں میں مبتلا ہونے کے بعد اگر پڑھنے والوں سے کچھ اجرت لے لیا کرتے تھے تو از کم از کم عصر حاضر کے عام دستور کے لحاظ سے خود ہی سوچیے کہ اعتراض یا تنقید کی گنجایش ہی کیا پیدا ہوتی ہے بلاشبہ ہماری کتابوں میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان بزرگوں کے طرز عمل کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا ہے لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت خال خال معدودے چند افراد اگر اس قسم کے پائے جاتے تھے یعنی پڑھنے والوں سے کچھ اجرت بھی بقدر ضرورت لے لیا کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں صرف وہی

(بقیہ صفحہ ۱۵۱) یہی فضل بن دکین ہیں خطیب نے نقل کیا ہے کہ معاوضہ تو خیر لیتے ہی تھے حد یہ کرتے تھے کہ ایک ایک درم کو پرکھتے ذرا سا بھی کوئی کھوٹا ہوتا تو اسے واپس کر دیتے اور جب تک کھرا سکہ اس کی جگہ وصول نہ کر لیتے دم نہ لیتے یہی حال علی بن عبد العزیز مکی کا تھا امام نسائی نے ایک دفعہ نہایت سخت لہجہ میں ان کا ذکر کیا لوگوں نے پوچھا کہ کیا ان کی راستبازی پر آپ کو کوئی شبہ ہے بولے نہیں آدمی تو سچے ہیں عالم ہیں اور ہر طرح سے اچھے ہیں لیکن میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ پڑھنے کے لیے ان کے پاس آئے ان ہی میں بے چارا ایک غریب آدمی بھی تھا وہ کچھ حاضر نہ کر سکا ایک تو علی نے پڑھانے سے انکار کر دیا بے چارے نے کہا کہ میرے پاس صرف ایک پیالہ ہے بولے کہ بھائی میرا تو یہی روزگار ہے لاؤ اسی پیالہ کو لاؤ غریب نے لا کر حاضر کر دیا اس شخص نے تب درس شروع کیا در اصل یہی تنگ نظری تھی لوگ در اصل اسی کے شاکی تھے کیا کیا جائے آدمی میں بسا اوقات ہر طرح کی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض فطری کمزوریاں بھی ہوتی ہیں بڑے بڑے فضل و کمال والوں کو اس قسم کی کمزوریوں میں مبتلا پایا گیا ہے۔

نہیں جو کچھ نہیں لیتے تھے بلکہ کافی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی پائی جاتی تھی جو بجائے لینے کے پڑھنے والوں کو دیا کرتے تھے، اور اعتراض کرنے والے معاوضہ لینے والوں پر اگر اعتراض کرتے بھی تھے تو درحقیقت ان ہی بزرگوں کے مقابلہ میں کرتے تھے صحاح کے مشہور کئی ہزار حدیثوں کے راوی جو فقہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں یعنی حفص بن غیاث، الذہبی نے ان کے حالات میں لکھا ہے۔

کان یقول من لم یاکل من طعامی	جو میرا کھانا نہ کھائے میں اس کے سامنے
لا احدثہ۔ ص ۲۷۴ ج ۱	حدیث بھی بیان نہیں کروں گا۔

تذکرۃ الحفاظ

گویا ان کے یہاں حدیث پڑھنے کی شرط ہی یہ تھی کہ پڑھنے والوں کو ان کے دسترخوان پر کھانا بھی کھانا پڑے گا۔ اسی طرح خطیب نے ایک دوسرے محدث ہیاج بن بسطام کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ:۔

کان الهیاج بن بسطام لا یمکن	ہیاج بن بسطام سے حدیث اس وقت تک
احدا من حدیثہ حتی یطعم	لوگ نہیں سن سکتے تھے جب تک کہ ان کے
من طعامہ۔ کان لہ مائدۃ	یہاں کھانا نہ کھالیتے۔ ہیاج کا دسترخوان
مبسوطۃ لاصحاب الحدیث	بہت وسیع تھا حدیث والوں کے لیے عام
کل من یاتیہ لا یحدثہ الا من	تھا، جو ان کے پاس آتا اس کو حدیث نہیں
یاکل من طعامہ۔ ص ۸۳	سناتے جب تک ان کے یہاں کھانا نہ کھالیتا

تاریخ بغداد ج ۱۴

اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک طبقہ ہی پیدا ہو گیا تھا جو خود تو پیغمبر کی حدیثوں کی نشرو

اشاعت میں مصروف ہی تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ ان لوگوں کی بھی مالی دست گیری اپنے فرائض میں شامل کیے ہوئے تھا جن کو ان کے علمی مشاغل معاشی کاروبار میں حصہ لینے سے مانع ہوتے تھے مصر کے مشہور امام جلیل لیث بن سعد جو علم میں امام مالکؒ کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ امام شافعی تو باوجود شاگرد ہونے کے اپنے استاد مالک پران کو ترجیح دیتے تھے بالاتفاق مورخین نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنی ساری جاگیر کی آمدنی جو تقریباً سالانہ پچیس تیس ہزار اشرفی تھی اس کا ایک بڑا حصہ محدثین اور حدیث و فقہ کے طلبا پر خرچ کر دیا کرتے تھے، صرف امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سالانہ ایک ہزار دینار (اشرفی) التزاماً بھیجا کرتے تھے وقتاً فوقتاً اور بھی امداد کرتے کبھی کبھی پانچ پانچ ہزار اشرفیاں امام مالک کے قرض کی ادائگی کے لیے ان کو بھیجنی پڑی ہیں مصر کے محدث ابن لہیعہ جو اپنے خاص حالات کے لحاظ سے تدوین حدیث کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں کسی موقعہ پر انشاء اللہ ان کا تذکرہ آئے گا ان بے چارے کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں مکان کے ساتھ کاغذوں کا وہ ذخیرہ بھی جل گیا جس میں ان کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں خطیب ہی کی روایت ہے کہ مکان کی تعمیر کی امداد کے سوا صرف

بعث الیہ اللیث بن سعد کاغذا بالف دینار ص ۱۰ ج ۱۳ — لیث بن سعد نے ایک ہزار دینار کا کاغذ ابن لہیعہ کو بھیجا۔

ان کے دسترخوان پر کھانا کھانے والے طلبہ اور اہل علم کو جو کھانا ملتا تھا سننے کے قابل ہے خطیب ہی راوی ہیں۔

کان یطعم الناس فی الشتاء الھرایس بعسل النحل وسمن البقر وفی الصیف سویق اللوز — سردیوں میں لوگوں کو ہریس کھلاتے تھے جو شہد اور گائے کے گھی میں تیار کیا جاتا تھا اور گرمیوں میں بادام کا ستو شکر کے ساتھ

بالسکر ص ۹ لوگوں کو کھلاتے تھے۔

ان ہی بزرگوں میں موصل کے حافظ معافی بن عمران تھے باوجود حافظ حدیث ہونے کے لکھا ہے کہ بڑے جاگیر دار تھے ذہبی کا بیان ہے کہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب جاگیر سے آمدنی آتی تو اپنے اصحاب اور تلامذہ کے پاس اس سے اتنی رقم نکال کر بھیج دیا کرتے تھے جو ان کے لیے کافی ہوتی۔ ص ۲۶۵ تذکرہ ج ۱۔

اور اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کے قصوں سے تو شاید ہی رجال کی کوئی کتاب خالی ہوگی یعنی علاوہ محدث وفقیہ ہونے کے یہ اپنے وقت کے بڑے الوالعزم تاجر بھی تھے لکھا ہے کہ چار مہینے طلب حدیث میں چار مہینے میدان جہاد میں اور چار مہینے تجارت میں صرف کرکے اپنا سال پورا کرتے تھے برسوں اسی قاعدے کے وہ پابند رہے تجارت سے کافی آمدنی ہوتی تھی ان ہی مصارف پر یہ آمدنی صرف ہوتی تھی گو ان کے بذل ونوال کا دروازہ ہر مستحق کے لیے کھلا ہوا تھا لیکن زیادہ تر ان کے حسن سلوک کا تعلق چونکہ حدیث ہی کی خدمت کرنے والوں سے تھا اس لیے ایک دفعہ کسی نے اس تخصیص کی وجہ پوچھی تو فرمایا:۔

توم لهم فضل وصدق	ان لوگوں کو برتری بھی حاصل ہے اور
طلبو الحديث فاحسنوا	سچائی بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے
الطلب للحديث لحاجة	حدیث کے طلب میں بہت حسن سلیقہ
الناس اليهم احتاجوا فان	سے کام لیا ہے، اور یہ سب انہوں نے
تركناهم ضاع علمهم	اس لیے کیا کہ لوگوں کو ان کے علم کی
وان اغناهم سوى العلم	ضرورت تھی اور لوگ ان کے محتاج ہوگئے
لامة محمد صلى الله عليه وسلم	اب اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو ان کا علم

ولا اعلم بعد النبوۃ افضل من العلم
ص ۱۶۰ ج ۱
تاریخ بغداد

ضائع ہو جائے گا، لیکن اگر ان کو آسودہ حال بنا کر رکھا گیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے علم درست ہو جائے گا اور نبوت کے بعد اس علم سے بہتر شے اور کچھ نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں خطیب ہی نے نقل کیا ہے کہ رقہ میں ایک نوجوان رہتا تھا جب رومیوں کے مقابلہ میں جہاد کے لیے مصیصہ کی سرحدی چوکی کو جاتے ہوئے ابن المبارک رقہ سے گذرتے تو یہی نوجوان ان سے حدیث پڑھ لیتا تھا ایک دفعہ ابن المبارک جب رقہ پہونچے تو حسب دستور وہ نوجوان ملنے بھی نہ آیا لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا معلوم ہوا کہ کسی کا قرض اس پر چڑھ گیا تھا قرض خواہ نے نوجوان کو جیل بھجوا دیا۔ ابن المبارک یہ سن کر خاموش ہو گئے دوسرے دن اس قرض خواہ کے پاس پہونچے اور پوچھا کہ تمہارا کتنا قرض فلاں پر رہ گیا ہے بولا دس ہزار درم، اسی وقت ابن مبارک نے یہ رقم ادا کر دی اور اسی دن رقہ سے باہر نکل گئے جوان جیل سے چھوٹ کر جب شہر آیا تو معلوم ہوا کہ ابن مبارک آئے تھے اور تجھے پوچھتے تھے لیکن کل ہی روانہ ہو گئے جوان اسی وقت ان کے پیچھے چل پڑا دوسری یا تیسری منزل پر حضرت سے ملاقات ہوئی بھائی کہاں تھے قرض کی وجہ سے قید ہو گیا تھا دونوں میں سوال و جواب ہوا ابن مبارک نے تب پوچھا کہ پھر رہائی کیسے میسر ہوئی بولا کہ خدا جانے میری طرف سے رقم قرض خواہ کو کس نے ادا کر دی ابن مبارک نے سن کر کہا کہ بس خدا کا شکر کرو کسی سے بھی اللہ میاں نے ادا کرا دیا ہوگا۔ جوان بے چارے کو ابن مبارک کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت ہی نے قرض ادا کر دیا تھا اور اس قسم کے بیسیوں پوشیدہ

حسنِ سلوک کے قصے کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ مشہور صوفی حضرت فُضَیل بن عیاض جو ابن مبارک کے مخلص دوستوں میں تھے تقریباً ان کے مصارف کے ابن مبارک ہی متکفل تھے۔ ایک دن حضرت فضیل نے ابن مبارک کے تجارتی مشاغل اور ان میں حضرت کا جو انہماک تھا اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ:۔

لولاك واصحابك ما اتجرت　　　اگر تم اور تمہارے اصحاب (محدثین وصوفیہ) نہ ہوتے تو میں ہرگز تجارت نہ کرتا۔

جس سے معلوم ہوا کہ کسی سے لینا تو خیر بڑی بات ہے صرف اس لیے کہ حدیث کی خدمت کرنے والے علماء اور طلبہ کو دوسروں سے لینا نہ پڑے، حضرت عبداللہ بن المبارک کی تجارتی کاروبار کی اصل غرض یہی تھی۔ الخطیب نے ابراہیم الحربی کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے ایک اونٹ نظر آیا اونٹ والا پوچھ رہا ہے کہ ابراہیم الحربی کا مکان کون سا ہے ابراہیم نے کہا کہ میں ابراہیم ہوں اور اس کا مکان یہی ہے یہ سن کر شتربان اونٹ سے اترا اور دونوں طرف جو بوجھ اونٹ پر لدے ہوئے تھے اس کو اتار ابولا کہ یہ کاغذ ہے خراسان کے ایک آدمی نے میرے حوالہ کیا ہے کہ آپ تک پہنچادوں ابراہیم نے پوچھا کہ اس شخص کا کیا نام ہے شتربان نے کہا اس نے مجھے قسم دی ہے نام بتا نہیں سکتا اور کاغذ کے اس طومار کو ان کے حوالہ کرکے روانہ ہوگیا[1] خود

---

[1] ابراہیم الحربی تیسری صدی کے جلیل محدثین میں ہیں، بے نیازی اور اسباب دنیا سے لاپروائی ان کی زندگی کی بڑی خصوصیت تھی خود اپنے ہاتھ سے جو کتابیں انہوں نے لکھیں اور تصنیف کی تھیں بجائے خود وہ کتب خانہ تھا جب مرنے لگے تو ان کی لڑکی نے شکایت کی کہ آپ ہمیشہ خلیفۂ وقت اور دوسرے امراء کی امداد کو واپس کرتے رہے لیکن اب کیا ہوگا بولے کہ اس کمرے کے گوشے میں دیکھو کیا ہے بیٹی نے کہا کہ کتابیں ہیں (بقیہ صفحہ ۱۵۸ پر)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ابن مبارک فقہ میں شاگرد خاص ہیں ان کا طریقہ عمل بھی یہی تھا امام صاحب کی تجارت بھی لاکھوں لاکھ روپیہ کی تھی لیکن مقصد ان کا بھی وہی تھا کہ جو اپنی تجارت کا مقصد ابن مبارک بتاتے تھے (تفصیل کے لیے دیکھو "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" مصنفہ مناظر احسن گیلانی)

اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں انتہائی بلند نظری اور علو ہمتی کی یہ مثالیں ہیں قدرتاً اس قسم کے افراد کم ہی تھے مگر ایسے لوگ جو پیغمبر کی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ بغیر کسی اجر و مزد کے زندگی بھر کرتے رہے بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاوضہ اور اجرت لینے والوں کی مذکورہ بالا چند مثالوں کے سوا تقریباً اس زمانہ کے سارے محدثین اور حفاظِ حدیث کا یہ عام رویہ تھا ان ہی بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ان چند لوگوں کو بدنام ہونا پڑا ورنہ تعلیم و تعلم کا موجودہ مستاجرانہ طریقہ اگر اس زمانہ میں بھی اسی طرح عام ہوتا جیسے آج کل ہے تو شاید ان بے چاروں کا کوئی نام بھی نہ لیتا مشہور ہے کہ حمام میں بھی کیا کسی کے ننگے ہونے کی شکایت کبھی کی گئی ہے؟ اس سلسلہ میں بزرگوں نے جو نمونے چھوڑے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے کوئی ان قصوں کو صحیح باور کر سکتا ہے خیال تو کیجیے ذوق کی اس صفائی کا خطیب نے کفایہ میں نقل کیا ہے کہ مشہور حافظ حدیث حماد بن سلمہ کا ایک شاگرد بحر چین کی تجارتی مہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷) ابراہیم نے کہا کہ بارہ ہزار جز کی ایک کتاب جو حدیث کے لغات اور نوادر کی تحقیق میں ہے جسے میں نے خود لکھا ہے میرے مرنے کے بعد روزانہ ایک ایک جز بھی بازار بھیجو گی تو ایک درم قیمت اس کی ضرور مل جائے گی تم کو سوچنا چاہیے کہ بارہ ہزار درم جس کے گھر میں موجود ہوں کیا اس کو محتاج سمجھا جاسکتا ہے ان کے استغناء، سیرچشمی کے بیسیوں واقعات خطیب وغیرہ نے نقل کیے ہیں ایک صاحب دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے آخر ابراہیم نے کہا کہ بھائی اب آپ اپنے کھانے کا کچھ نظم کیجیے بندے کے پاس تو ایک مولی تھی اس کے پتوں سے ناشتہ کا کام لیا گیا تھا اور اب کھانے میں وہی مولی کام آئے گی۔ ص ۳۳ ج ۵۔

پر روانہ ہوا اور وہاں سے کافی روپیہ کما کر واپس ہوا حماد استاد تھے بطور تحفہ کے بعض چیزیں ان کی خدمت میں لے کر وہ حاضر ہوا اس کا خیال تھا کہ اس تحفہ سے خوش ہو کر آئندہ استاد کی توجہ میری طرف زیادہ ہو جائے گی لیکن سنتے ہیں وہ بے چارا اپنے تحائف کو لیے کھڑا تھا اور سن رہا تھا حماد فرما رہے ہیں :-

اختر ان شئت قبلتہا ولم	ان دو باتوں میں سے کسی ایک شق کو قبول
احدثک ابدا وان شئت	کر لو چاہو تو تمہارے تحائف قبول کر لیتا ہوں
حدثتک ولم اقبل الھدیہ	لیکن پھر حدیث تمہیں کبھی نہیں پڑھاؤں گا ،
کفایہ ص ۱۵۳	اور چاہتے ہو کہ حدیث تمہیں پڑھاؤں تو پھر تحفہ قبول نہیں کروں گا۔

لکھا ہے کہ اس بے چارے نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میں حدیث ہی سنوں گا اور اپنے تحفوں کو واپس لیتا ہوں اور اس قسم کے قصے کہ مثلاً عیسیٰ بن یونس جو روا ۃ حدیث میں بڑے ممتاز مقام کے مالک ہیں ذہبی نے الامام کے لفظ کے ساتھ ان کو ملقب کیا ہے تین پشتوں سے مسلسل ان کے خاندان میں حفاظ حدیث پیدا ہوتے چلے آرہے تھے ہارون الرشید کے مشہور وزیر جعفر برمکی خود بیان کرتا تھا کہ میں نے ایک لاکھ درم اس شخص کی خدمت میں پیش کیے لیکن قطعی طور پر اس نے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں یہ مشہور ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی قیمت میں نے کمائی (ص ۲۵۸ ج ۱ تذکرۃ الحفاظ) ان ہی عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں مامون نے حدیث سننے کے بعد کافی رقم پیش کی لیکن صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا :-

ولا شربۃ ماء ص ۲۵۹ تذکرہ ج ۱	ہرگز نہیں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں

الذہبی نے زکریا بن عدی جو صحاح کے راویوں میں ہیں ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کی آنکھیں دکھنے آئیں ایک شخص سرمہ لے کر حاضر ہوا پوچھا کہ کیا تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مجھ سے حدیث سنتے ہیں اس نے کہا جی ہاں زکریا نے کہا کہ تب میں تم سے سرمہ کیسے لے سکتا ہوں کیونکہ حدیث سنانے کا معاوضہ ہو جائے گا دیکھو تذکرۃ الحفاظ ص ۳۵۸ ج ۱

ابراہیم الحربی جن کا ابھی ذکر گذرا باوجودیکہ فقر فاقے میں زندگی بسر ہوتی تھی معتضد باللہ خلیفۂ وقت نے متعدد بار ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں بھیجیں ہمیشہ شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے ایک دفعہ خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ خود اگر نہیں لیتے ہیں تو اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کر دیجیے ابراہیم نے کہا کہ خلیفہ سے عرض کرنا کہ جس چیز کے جمع کرنے کی مصیبت میں نے برداشت نہیں کی تو اس کے خرچ کرنے کی مصیبت میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کروں اور آخر میں خلیفہ کے قاصد کو کہا کہ بار بار امیر المومنین بھیجنے کی زحمت برداشت کر رہے ہیں اور مجھے ہر دفعہ واپس کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے ان سے کہہ دیجیو کہ :-

ان ترکتنا و الا تحولنا من جوارک ص ۳۲ یا تو اس طریقہ کو وہ ترک فرمائیں، ورنہ آپ کے پڑوس سے میں منتقل ہو جاؤں گا۔

اس سلسلہ میں ابراہیم ایک بخیل کا ایک پر لطف قصہ بیان کیا کرتے تھے یعنی یہ کہتے ہوئے کہ علم کے معاوضہ میں بحمد اللہ میں نے کبھی کوئی چیز آج تک نہیں لی صرف ایک دفعہ مجھے لینا پڑا پھر اس قصہ کو بیان کرتے جو کافی طویل ہے حاصل یہ ہے کہ کسی بنیے سے ابراہیم نے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت کچھ آنے اور ایک پیسہ طے ہوئی ابراہیم نے آنے تو ادا کر دیے پیسہ باقی تھا اتنے میں بنیے کو کچھ خیال آیا بولا کہ ابراہیم بزرگوں کا کوئی ایسا قصہ سناؤ جس سے میرا دل کچھ نرم پڑے ابراہیم نے ایک دلچسپ قصہ سنایا[۱] بنیا سن کر بہت متاثر ہوا اور اپنے آدمی

---

[۱] حاشیہ بر صفحہ ۱۶۱ ملاحظہ ہو

کہا کہ ابراہیم سے اب ایک پیسہ جو باقی ہے وہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کم کرنا ابراہیم فرماتے تھے کہ بس ابھی دن ایک پیسہ کی یہ آمدنی علم کے معاوضہ میں مجھے ہوئی۔

ان بزرگوں کی سیرچشمی اور بے نیازی کے قصے کتابوں میں اتنے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے ایوب سختیانی جن کا بکثرت حدیث کی سندوں میں ذکر آتا ہے اور حفّاظِ حدیث کے مشاہیر میں ہے ذہبی نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کا خلیفہ یزید بن الولید جس زمانہ میں خلیفہ نہ تھا ایوب میں اور اس میں گہرے دوستانہ مراسم تھے جس دن خلافت کے لیے اس کا انتخاب ہوا تو لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہے تھے:۔

اللھم انسہ ذکری	پروردگار! اس شخص کی یاد میرے دل سے
ص ۱۲۳	نکال دیجیے۔

ذرا وارستہ مزاجیوں کا اس گروہ کے اندازہ تو کیجیے دوست اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت و سلطنت کا بادشاہ منتخب ہوتا ہے بجائے اس کے کہ اس کی دوستی سے

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶۰)

خطیب نے اس قصہ کو بھی بیان کیا ہے امام حسن علیہ السلام کی سخاوت سے اس کا تعلق تھا حاصل یہ ہے کہ حضرت امام ایک دن کسی باغ میں پہنچے جس کا محافظ ایک سیاہ حبشی تھا ہاتھ میں اس کے ایک روٹی تھی سامنے کتا بیٹھا تھا حبشی کو حضرت نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا ہے خود کھاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا کتے کو دیتا ہے مسلسل وہ یہی کر رہا ہے آپ نے پوچھا کہ تم اس التزام کے ساتھ جو کتے کے سامنے ٹکڑے ڈالتے جاتے ہو گویا برابر کا حصہ دار بنا لیا ہے اس کی وجہ کیا ہے حبشی نے کہا کہ حضرت کتے کی آنکھ لقمے پر لگی ہوئی ہے دل گوارا نہیں کرتا کہ اس پر اپنے کو ترجیح دوں حضرت امام حسنؓ کو اس غلام کی یہ ادا ایسی بھا گئی کہ اسی وقت آپ نے اس کا نام اُس کے آقا کا نام دریافت کیا اور غلام کے ساتھ باغ کو بھی آپ نے خرید لیا پھر اس حبشی کے آئے اور فرمایا کہ میں نے تجھے بھی خرید لیا ہے اور اس باغ کو بھی حبشی خوش ہوا آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اور باغ بھی تجھے بخش دیا حبشی نے سن کر کہا تو حضرت آپ نے جس کی راہ میں یہ باغ مجھے عطا فرمایا اسی کی راہ میں اس باغ کو میں نے بھی دے دیا یعنی خیرات کر دیا بخیل بنیا اس قصے کو سن کر اچھل پڑا اور احسنت یا ابا اسحٰق کہتے ہوئے اپنے آدمی سے وہی بات کہی کہ اب ابراہیم سے مزید ایک پیسہ نہ لینا اور نہ اس کی چیز کو کم کرنا ص ۴۴ ج ۵ تاریخ بغداد۔ شاید اس بخیل کی نجالت پر اس پیسے کی بھی کافی چوٹ پڑی ہو گی اس لیے ابراہیم نے اس پیسے کا واپس کرنا مناسب نہ خیال کیا۔

استفادے کی توقعات قائم کرتے دعا کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ پروردگار مجھ سے اس شخص کی یاد بھلا دیجے اسی قسم کا ایک واقعہ نصر بن علی محدث کے تذکرے میں ذہبی نے ذکر کیا ہے یہ سفیان بن عیینہ وغیرہ کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ کے رُوات میں ہیں لکھا ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ نے ان کے پاس آدمی بھیجا تاکہ قاضی بنانے کے لیے ان کو مستعین کے پاس حاضر کرے ان کو خبر ہوئی بولے استخارہ کرلوں تب جواب دوں گا گھر آئے دو رکعت نماز پڑھی سنا گیا کہ دعا کر رہے ہیں کہ :-

"پروردگار! خیر اور بھلائی اگر تیرے ہی پاس ہے تو مجھے اٹھالے"

دعا کرکے سو گئے جگانے والے جب جگانے کے لیے آئے تو دیکھا کہ واقعی اٹھا لیے گئے یعنی وفات ہو چکی تھی، ص ۹۲ ج ۲ تذکرۃ الحفاظ۔

غور کرنے کا مقام ہے ہمتوں کی بلندیاں جن لوگوں میں عروج وارتقاء کے اس مقام تک پہونچ چکی تھیں کیا کوئی دشواری ایسوں کے لیے بھی دشواری باقی رہتی ہے جن کی رات بھی اپنی رات ہو اور دن بھی اپنا دن ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہ کے تلامذۂ حدیث میں ایک بزرگ قبیصہ بن عقبہ بھی ہیں ذہبی نے" الحافظ الثقة المکثر"کے الفاظ سے ان کی خصوصیات کا اظہار کیا ہے ان ہی کے حال میں لکھا ہے کہ عباسیوں کے عہد کے امراء میں ابودلف نامی جو بڑے امیر کبیر تھے ان ہی ابودلف کے صاحبزادے دلف اپنے خدم حشم کے ساتھ ایک دن قبیصہ کے مکان پر حاضر ہوئے اندر تھے اطلاع دی گئی کہ فلاں امیر آپ سے ملنے آیا ہے خیال لوگوں کا یہ تھا کہ دلف کے نام کو سنتے ہی گھر سے نکل پڑیں

سے گئے[1] لیکن خلاف توقع دیر تک انتظار کیا گیا وہ باہر نہ آئے آخر لوگوں نے قریب جا کر کہنا شروع کیا:۔

ابن ملک الجبل علی الباب	جبل (نام صوبہ) کے بادشاہ کا بیٹا دروازہ
وانت لا تخرج	پر کھڑا ہے اور تم باہر نہیں نکل رہے ہو۔

بہرحال جب لوگوں نے زیادہ ہنگامہ مچایا تو دیکھا گیا کہ گھر سے بایں شان نکل رہے ہیں کہ "چادر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا ہے" دلف سامنے کھڑا تھا اور ارد گرد حواشی کے لوگ تھے سن رہے تھے کہ قبیصہ کہہ رہے ہیں:۔

من رضی من الدنیا بھذہ اما یصنع	جو اس دنیا میں اس ٹکڑے کی طرف اشارہ
بابن ملک الجبل واللہ لا احدث	تھا) اس سے راضی ہو گیا جبل کے بادشاہ
ص ۳۴۰ ج ۱	کے بیٹے کی اسے کیا پروا خدا کی قسم میں اس

---

[1] تشیر کو شیر پر قیاس کرنے والے عموماً اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سمجھنے والے جسے بسا اوقات کا رخ سمجھتے ہیں ان ہی کو اس دنیا میں خاک بلکہ خاک سے بھی بدتر سمجھنے والا ایک گروہ موجود تھا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔

عہد نبوت کے قریب سے جو متاثر تھے وہ تو خیر لیکن جو اس شرف سے محروم تھے ان میں بھی ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، ہندستان ہی میں اورنگ زیب کے عہد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کے مشہور بزرگ میاں میرؒ سے ملنے کے لیے اورنگ زیب حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوا میاں میرؒ اپنے مریدوں کے ساتھ خانقاہ کے اندر دھوپ میں بیٹھے ہوئے کپڑوں سے جوں نکال رہے تھے اچانک کسی نے اندر خبر پہونچائی کہ شہنشاہ عالمگیر تشریف لا رہے ہیں۔ لوگوں نے خبر دی کہ شہنشاہ آرہے ہیں۔ مسکرا کر فرمانے لگے لاحول ولا قوۃ میں سمجھا کہ شاید کوئی فربہ جوں دھری گئی اس پر گڑبڑی مچی ہے۔ عالمگیر کے آنے پر اس ہنگامہ کی کیا ضرورت تھی ملنے کے بعد عالمگیر جب واپس ہوا تو کسی نے میاں میر کے اس لطیفہ کا بادشاہ سے ذکر کیا سن کر کہا کہ ہاں بھائی! ان لوگوں کی نظر میں ایک موٹی جوں بھی عالمگیر سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

شخص کے آگے حدیث نہیں بیان کروں گا۔

اور یہی واقعہ بھی ہے مسعر بن کدام بھی کہا کرتے تھے :۔

من صبر علی الخل و البقل لم | سرکہ اور بھاجی پر جس نے صبر کرلیا وہ
یستعبد ص ۱۸۷ ج ۱ - | کبھی غلام بنایا نہیں جاسکتا

تذکرۃ الحفاظ

جب روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ یاد کرنے والے چند سال میں قرآن مجید حفظ کرلیتے ہیں توجنھوں نے اپنے سارے وقت کو صرف اپنے ہی قبضہ میں رکھا تھا ان کے متعلق کیوں تعجب کیا جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ ان کو اتنی حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ افسوس ہے کہ سننے والے صرف یہ سن لیتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کے اتنے بڑے بڑے حافظ پائے جاتے تھے۔ سنانے والے بھی بس اسی پر کفایت کرتے ہیں حالانکہ واقعہ کے ساتھ ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس ماحول سے بھی واقف بنایا جائے جن میں حدیث کے یہ حفاظ پیدا ہوئے تھے۔ (تتبعھا الکرادفہ)

صحیح بخاری کی فنی خصوصیات

(از جناب مولوی محمد سلیم صاحب صدیقی ایم۔ اے)

(۲)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علاوہ ان چار شعبوں کے جن کا ذکر شاہ صاحب نے فرمایا ہے اس کتاب میں ایک بڑا حصہ کلامی مباحث کا بھی پایا جاتا ہے لوگوں نے لکھا بھی ہے کرابیسی اور ابن الکلاب جو اس زمانہ کے متکلمین تھے امام بخاری نے ان کی کتابوں سے کافی استفادہ کیا ہے اور یوں بھی امام بخاری کا زمانہ علم کلام کے انتہائی شباب کا زمانہ تھا خلیفہ ہارون رشید کی وفات کے ایک سال بعد امام کی ولادت ہوئی اور مامون الرشید کی جب وفات ہوئی تو اس وقت امام بخاری اپنی عمر کی چوبیسویں منزل میں تھے اور ۲۵۶ھ میں نصر اول حاکم بخارا کے زمانہ میں ان کی وفات ہوئی اور کون نہیں جانتا کہ ہارون رشید کے عہد سے نصر اول کے زمانہ تک اسلام کی تاریخ کا وہ عہد ہے جس میں مشرق و مغرب کے سارے علوم کا سنگم بغداد بنا ہوا تھا اور ہر قسم کے علوم و فنون کے تراجم عربی زبان میں منتقل ہو چکے تھے امام بخاری نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اس زمانہ میں جو مباحث چھڑے ہوئے تھے ان سے وہ الگ رہ سکتے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد بخاری شریف میں جن کلامی مباحث کا تذکرہ کیا گیا ہے بڑی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ بعض باتیں تو اس کتاب میں ایسی بھی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے "الجنۃ والنار" کے متعلق روحانی یا جسمانی ہونے کا عقیدہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس زمانہ کا کوئی نیا مسئلہ ہے یا فلسفہ اور مذہب کی جنگ سے پیدا ہوا ہے مگر امام بخاری نے یہ لکھ کر کہ

اما النصاریٰ فکفروا بالجنۃ وقالوا لا طعام فیہ ولا شراب [۱]

لیکن نصاریٰ (عیسائی لوگ) جنت کے منکر ہیں بایں معنے کہ ان کا خیال ہے کہ جنت میں جنتیوں کو نہ کھانا ملے گا اور نہ پینا "

---

[۱] ھدی ص ۶۰۱

انھوں نے اس راز سے آج سے ہزار سال پیش تر پردہ اٹھا دیا تھا کہ یہ خالص عیسائیت کے عقاید کا جز ہے فلسفیانہ تعبیروں میں عیسائیوں کے اس عقیدے کو پیش کر کے دھوکہ دیتے ہیں کہ شاید اس مسئلہ کا تعلق فلسفہ سے ہے اس طرح حور کے متعلق یہ نظریہ کہ جمال وحسن کے ایسے مظاہر کی یہ تعبیر ہے جس کے نظارہ کی تاب آدمی نہ لا سکے میرے خیال میں بخاری ہی نے

یحار فیہا الطرف[1] حور کو حور اس لئے کہتے ہیں کہ نظران کو دیکھ کر حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتی ہے۔

کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ کر کے مسئلہ میں کتنی عمیق گہرائی پیدا کر دی ہے۔

اور یہ زمانہ صرف کلامی مباحث وعلم کلام ہی کی ایجاد و ارتقار کا نہ تھا بلکہ یہی وہ زمانہ ہے جب علم تصوف نے مسلمانوں میں ایک خاص مکتب خیال کی حیثیت حاصل کر لی تھی بڑے بڑے لوگ صوفیانہ حقایق پر بحث کرنے والے پیدا ہو چکے تھے اور ہم بخاری شریف پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں امام صاحب کو موقع مل سکا ہے ان چیزوں کی طرف بھی کسی نہ کسی شکل میں اشارہ کرتے ہوئے گذر گئے ہیں جن کا حقیقی تعلق علم تصوف سے ہے۔

مثلاً میں ایک ہی چیز کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ قرآن مجید میں نفخ صور کی اصطلاح کا استعمال ایک سے زائد جگہ پر ہوا ہے جو نشاۃ ثانیہ کی دوسری تعبیر ہے الصور کی شرح میں ایک بات تو وہ ہے جو عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے۔ لیکن بخاری کا تے

الصور جمع صورۃ کقولہ سورۃ سورا صور صورۃ کی جمع ہے جیسے سورہ کی جمع سور ہے

چند الفاظ ہی لکھے ہیں لیکن صوفیہ کے نظریہ اعیان ثابتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر بخاری کے اس

---

[1] ھدی صلا۱۷

اشارہ پر غور کیا جائے اور سمجھا جائے کہ علم الٰہی میں حقایق ممکنہ کی جو صورتیں ہیں جنہیں صور علمیہ اور صوفیہ اعیان ثابتہ کہتے ہیں ان ہی کی طرف تکوینی توجہ جب کی گئی تو کائنات موجود ہوگئی پھر اپنی اس تخلیقی و تکوینی توجہ کو جب خالق قیوم ان سے ہٹا لے گا تو وہ معلوم ہو جائینگی اسی طرح نشاۃ ثانیہ کے وقت پھر ان ہی صور علمیہ کی طرف توجہ ان کی ایجاد کے لئے کافی ہوگی اس قسم کی اور دوسری بہت چیزیں جن کا تعلق تصوف سے ہے ان کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔

علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری کی اس کتاب میں بعض ابواب یا کتابیں ایسی ہیں جن کی ابتدا ارشاد بخاری سے پہلے نہیں ہوئی تھی مثلاً کتاب الوحی کتاب العلم اخبار الجاہلیہ کتاب بدء الخلق کتاب الاعتصام وغیرہ یہ ایسے ابواب ہیں جن کو بخاری کی کتاب سے پہلے کی کسی کتاب میں مستقل حیثیت نہیں دی گئی تھی اور ان کے بعد بھی بہت کم لوگوں کی توجہ ان ابواب کی اہمیت کی طرف ہوئی اگر حدیث کی بعض کتابوں میں ان کا تذکرہ کیا بھی گیا ہے تو امام بخاری ہی کی پیروی سے تاہم جن نزاکتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام بخاری نے حدیثیں درج کی ہیں ان نزاکتوں کو دوسرے پیش نہ کر سکے۔

مختصر یہ کہ اس امر میں انکار کی گنجائش نہیں کہ بخاری کی کتاب صرف چار ہی ابواب پر نہیں بلکہ تفسیر فقہ مغازی کلام تصوف مواعظ آداب وغیرہ کے علاوہ ہم ان کی کتاب کو ایسے بیسیوں ابواب و علوم پر مشتمل پاتے ہیں جو آج تک کسی ایک کتاب میں جمع نہیں کئے گئے ان میں ہر علم خاص توجہ کا مستحق ہے زندگی کی سینکڑوں مشکلات ان سے حل ہو سکتی ہیں

مطالب کی نزاکتیں | جہاں تک حدیثوں سے نتایج اخذ کرنے کا تعلق ہے وہاں امام بخاری سے پہلے کے محدثین اور بعد کے محدثین میں سے کوئی بھی ان کے پایہ کو نہ پہنچ سکا۔ عوام تو عوام بخاری کے شارحین بھی بسا اوقات امام کے مطلب کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے

توبخاری کی حدیثوں کی ترتیب وتہذیب میں بھی ایک خاص ربط پایا جاتا ہے اگرچہ بعضوں نے تعریضاً کہا ہے کہ بعض مقامات پر ان کا استنباط اجتہاد کے عام قاعدوں سے ہٹ کر بہت دور ہوگیا ہے یہاں تک کہ اس میں شاعری کی جھلک پائی جانے لگی ہے لیکن اس میں امام بخاری کے کام سے زیادہ ان دماغوں کو دخل ہے جن میں بخاری کی گہرائیوں تک پہنچنے کی صلاحیت نہ تھی۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بخاری کے ابتدائی باب "کتاب الوحی" ہی کو لیجئے۔ اس میں امام صاحب نے اپنی تمام پیش کردہ حدیثوں کے ذریعہ ان تمام سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں جو گہری سے گہری تنقیدی عقل پیدا کرسکتی ہے۔ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے البتہ اجمالی اشاروں سے ہم "کتاب الوحی" کی کچھ اہمیت مثالاً واضح کرنا چاہتے ہیں۔

شاید وحی کے متعلق جو سوالات ذہن انسانی میں آسکتے ہیں وہ یہی ہو سکتے ہیں۔

(۱) وحی کس کو کہتے ہیں۔

(۲) وحی کے نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۳) وحی کس طرح نازل ہوئی ہے۔

(۴) وحی محمدی کے نزول کی ابتدا کیسی ہوئی۔

(۵) وحی کے صادق اور کاذب مدعیوں میں امتیاز کا کیا معیار ہو سکتا ہے۔

(۶) وحی محمدی کی حفاظت کے متعلق کیا انتظام کیا گیا یعنی ایسا انتظام کہ غیر متزلزل اعتماد اس پر قایم ہو جائے۔

اب آپ ان چیزوں پر غور کیجئے جنہیں امام بخاری نے کتاب الوحی میں درج فرمایا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں امام بخاری نے پہلے سوال کا جواب قرآن کی آیت پاک

اِنَّا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ — ہم نے (اے محمد) تم پر اسی طرح وحی کی ہے

نوح والنبیین من بعدہ کا جیسے نوح اور ان کے بعد پیغمبروں پر کی گئی

پیش کرکے دیا ہے مطلب ان کا یہ ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام پر وحی نازل کی گئی تھی اسی طرح رسول کریم پر بھی نازل کی گئی۔ خاص کر کے وحی کی متعلقہ آیتوں میں سے اسی خاص آیت کا انتخاب امام نے غالبًا اسی لئے کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ذات نسلِ انسانی کے لئے گویا مرکزی وجود کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہی موجودہ نسل انسانی کے ابوالاباء ہیں وحی جب ایک ایسی چیز ہے جو نسلِ انسانی کے ابوالآبا پر نازل ہوئی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساری نسلیں جو نوح علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہیں وہ وحی سے واقف ہیں اور یہی واقعہ بھی ہے امام بخاری گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس چیز سے سارے انسانی گھرانے واقف ہیں لہذا کسی تعریف کی وہ محتاج نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب "انما الاعمال بالنیات" والی حدیث سے دیا جا سکتا ہے بظاہر تو اس حدیث کا تعلق باب سے بھی نہیں معلوم ہوتا مگر درحقیقت خود یہ ایک مستقل سوال کا جواب ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اعمال کی قدر و قیمت نیتوں پر منحصر ہے اور ظاہر ہے کہ نسلِ انسانی کا نصب العین بھلا اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی مرضی کے موافق کام کیا جائے اور خدا کی مرضی معلوم کرنے کا انسان کے پاس سوائے وحی کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہر شخص فردًا فردًا خدا کی مرضی سے واقف ہونے سے رہا اس طرح امام بخاری نے وحی کی ضرورت ثابت کر دی یعنی انسانی وجود کا یہ نصب العین کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گذاری جائے وحی کے بغیر نہ متعین ہی ہو سکتا ہے اور نہ معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب تو خیر حدیث سے صاف اور صریح طور سے ظاہر ہے اس میں حضرت عائشہ کا بیان پیش کرکے بتلا دیا ہے کہ وحی نازل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ ہے پیغمبر خود عالم شہادت سے عالمِ غیب کی طرف جاتا ہے اور یہ شکل پیغمبر پر ذرا سخت ہوتی ہے اور

دوسری شکل یہ ہے کہ غیبی وجود یعنی فرشتہ عالم غیب سے عالم شہادت کی طرف آتا ہے اس میں پیغمبر پر کسی قسم کی سختی نہیں ہوتی، تغیر وانقلاب، جدوجہد کی محنت سب فرشتہ پر پڑتی ہے۔

وحی کی ابتدا، والے سوال کا جواب غارِ حرا والی حدیث میں پیش کرکے دیا ہے چوتھا سوال یعنی صادق اور کاذب مدعی کے فرق کا معیار بظاہر اس کا صراحۃً جواب گو بخاری نے نہیں دیا ہے لیکن اگر اس تمام مواد کو جو امام نے اس باب میں پیش کیا ہے سامنے رکھا جائے تو اس کا جواب نہایت آسانی سے مل جاتا ہے انھوں نے جہاں تک میرا خیال ہے، معیار مدعیِ وحی کے اخلاق وکردار کو بنایا ہے اور رسولِ پاک کے صادق مدعی ہونے کی دو شہادتیں پیش کی ہیں۔ اندرونی وبیرونی، بیرونی تو ورقہ ابن نوفل، ہرقل اور ہرقل کے رومی دوست کا وہ بیان ہے جو انھوں نے علم نجوم کی بنا پر دئے ہیں اور اندرونی شہادتوں میں ایک ایسی ذات کا بیان آپ کے اخلاق وکردار وغیرہ کے بارے میں پیش کیا گیا ہے جو آپ کی خلوت وجلوت ہر جگہ کی ساتھی تھیں میرا اشارہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف ہے یعنی غار حرا سے پہلی وحی کے مشاہدے کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ... گھر لوٹے اُس وقت خدیجۃ الکبریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اس کے مشاغل کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا کہ آپ غریبوں کی مدد کرتے ہیں، بے کاروں کو کام سے لگا دیتے ہیں، دوسروں کا بار خود اٹھا لیتے ہیں، ان کی مہمان نوازی کرتے ہیں وغیرہ دوسری شہادت آپ کے کردار کے متعلق ایک دشمن یعنی ابوسفیان کا بیان ہے جنہوں نے غلط بیانی سے کام لینے کی سعی کرنی چاہی تھی لیکن بلوجود اس کے اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے اور پیغمبر کی زندگی کے چالیس سال کے تجربات کا اظہار ہرقل کے دربار میں کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ صدق اور سچائی کے سوا کسی دوسری چیز کا ہم لوگوں کو اب تک تجربہ نہیں ہوا ہے یہ ساری چیزیں آپ کو کتاب الوحی کے پیش کردہ روایتوں سے

معلوم ہوسکتی ہیں۔

آخری سوال کا جواب امام بخاری نے دو طرح سے دیا ہے ایک تو قرآن کی آیت شریفہ

ان علینا جمعہ وقرانہ ثمان — ہم ہی پر قرآن کا جمع کرنا ہے اور پڑھانا ہے۔

علینا بیانہ — پھر ہم ہی اس کے بیان کے بھی ذمہ دار ہیں

پیش کرکے دیا ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف مسلمانوں کی ذات سے ہے یعنی جو قرآن کو خدا کا کلام مانتا ہے کافر ہوجائے گا اگر وہ یہ مانے کہ قرآن میں خدا جن چیزوں کو جمع کرنا چاہتا تھا ان میں بعض چیزیں گم ہوگئیں۔ دوسری چیز تاریخی ہے۔ مسلم غیر مسلم سب پر حجت ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کا آخری دفعہ آپ کو دوبارہ قرآن سنانا اور جس کی پیروی میں مسلمان آج ساڑھے تیرہ سو سال سے ہر سال تراویح میں دنیا کے ہر حصہ میں قرآن کو سنتے ہیں جس کتاب کے ساتھ یہ طرزِ عمل مسلسل جاری ہو کیا اس کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اس میں کچھ ردو بدل یا کمی بیشی رہ سکے۔

یہ مختصر خاکہ تھا امام کی دقت نظری اور استنباطِ معانی کا مگر میں نہیں جانتا کہ کسی نے اس طرح اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اسی طرح کتاب العلم میں امام صاحب نے تعلیم اور تعلیم کے تمام متعلقہ مسائل معلّم کے فرائض، متعلّم کے فرائض، تعلیم کا طریقہ، امتحان، تعطیل وقفہ، تناوب (یعنی باری باری سے درس میں حاضری) مردوں کی تعلیم، عورتوں کی تعلیم ان سارے مسائل کے جواب صحیح حدیث کی روشنی میں دئے ہیں بخاری اٹھا کر دیکھئے آپ کو اس سلسلہ میں تقریباً ساٹھ سوالوں کا جواب مل جائے گا لیکن شارحین بخاری نے ان نکات کی طرف نہ خود زیادہ دلچسپی لی ہے اور نہ دوسروں کو ان خصوصیات کی طرف متوجہ کیا ہے۔

بخاری کے تراجم ابواب | تراجم ابواب یعنی حدیث سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو باب لکھ کر درج کرنا اور اس نتیجہ کے ثبوت میں متصل سند کے ساتھ حدیث کو پیش کرنا یہ امام بخاری کی ایجاد تو نہیں

ہے بلکہ ان سے بیشتر کے مصنفین حدیث اس طریقہ کو اختیار کر چکے تھے خصوصاً امام مالک نے موطا کو اسی طریقہ پر مدون کیا ہے جس کو ہم پچھلے باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں لیکن جن خاص خصوصیتوں کو ہم بخاری کے تراجم الواب میں پاتے ہیں ان کو دیکھ کر آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ لوگوں کو حیرت ہوئی حافظ ابن حجر نے ان تراجم کا ذکر کرکے لکھا ہے۔

هي التي حيرت الافكار وادهشت العقول والابصار

تراجم نے فکروں کو حیرت میں ڈال دیا لوگوں کے عقول وبصیرتیں ، دہشت زدہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس حیرت و دہشت میں علاوہ دوسری باتوں کے بڑا دخل اس قصہ کو بھی ہے جو عام طور پر مشہور ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی بعض محدثین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے ہر ترجمہ کو اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر اور منبر اقدس کے درمیان دو رکعتیں نفل پڑھ پڑھ کر درج کیا ہے اس نے تراجم کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے لوگ کہتے ہیں کہ امام بخاری ہر دو رکعت کے بعد دعا کرتے تھے اور کچھ واقعی بھی ہے کہ شاید ان کی ان ہی دعاؤں کے اثر کا صدیوں سے یہ تجربہ مسلمانوں کو ہو رہا ہے کہ مشکل سے مشکل اور بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بخاری شریف کے ختم کو ایک کارگر نسخہ پایا گیا ہے [1]

---

[1] انفرادی طور پر لوگوں نے اپنی مصیبت کے وقت میں بخاری کے ختم سے جو راحت پائی ایسے واقعے تو سینکڑوں ہیں لیکن تاریخ اسلام کا ایک واقعہ شاہد ہے کہ مملکت و سلطنت کے آڑے وقت میں بھی یہ نسخہ کارگر ہوا مسلمانوں پر تاتاریوں کا حملہ کون نہیں جانتا کہ قیامت نہیں تو قیامت سے غالباً کم بھی نہ تھا نہ جانے کتنے شہر جلا دیے گئے اور دریاؤں کے بہاؤ کا رُخ بدل کر جو بہائے گئے ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے اس زمانہ میں مصر و شام ایک ہی امیر محمد قلاؤن نامی بادشاہ کے زیر مملکت تھا جب تاتاریوں کا سیلاب حدودِ شام پر پہنچا تو وہاں کے ایک بزرگ شیخ تقی الدین ابن دقیق العید نامی نے علماء کو جمع کرکے بخاری شریف ختم کرنے کی ہدایت دی سب کو ایک ایک پارہ تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن بخاری کے ختم سے پہلے حضرت

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو

ماسوا اس کے جو ایک بڑی اہمیت جو ان تراجم کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ بسا اوقات ترجمہ اور حدیث میں کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اور اگر معلوم ہوتا بھی ہے تو بہت دور کا یہ ایسی خصوصیت ہے کہ پڑھنے والے کو کتاب شروع کرتے ہی اس عجیب وغریب چیز سے دوچار ہونا پڑتا ہے یعنی باب تو وحی کا ہے لیکن پہلی حدیث اس باب میں بخاری نے درج کی ہے وہ

انما الاعمال بالنیات - الحدیث

والی حدیث ہے مگر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ اس حدیث اور باب میں نہایت قریبی تعلق ہے یعنی اس کو بیش کر کے وحی کے متعلق جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان ہی میں سے ایک سوال کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شیخ تقی الدین تشریف لائے اور اپنے کشف کی بنا پر خوشخبری سنائی کہ مسلمان فتحیاب ہو گئے اور تاتاری منہ موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں ڈاک کے آنے پر معلوم ہوا کہ واقعی تاتاریوں کو سخت شکست فاش ہوئی ہے اور مسلمان کامران رہے -

خیر اس واقعہ کو بھلا دیا جائے تو بھلایا بھی جا سکتا ہے داستان کہن ہو گیا ہے مگر ابھی دنیا کے ذہنوں سے یونانیوں کا حملہ ترکی پر تو نہ نکلا ہوگا کتاب الحاضر الاسلامی میں لکھا ہے کہ جس وقت تمام ترکوں پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے، ان کی مرکزیت درہم برہم ہو گئی تھی دنیا یہی سمجھے ہوئے بیٹھی تھی کہ ترکوں کا نشان صفحہ ہستی سے اب مٹا اور اب مٹا اس وقت میدان جنگ سے مصطفٰے کمال پاشا کا تار شیخ سنوسی کو ملتا ہے جو کمال اتاترک ہی کی جماعت میں شامل تھے اور اس زمانہ میں ہنوز اس ان کا مستقر تھا کہ بخاری شریف کا ختم کروایا جائے حکم کی تعمیل کی گئی ختم سے پہلے ہی پہلے شیخ سنوسی کے پاس اطلاعات پہنچتی ہیں کہ ترک فتحیاب ہو گئے غالباً اس واقعہ کا یہ اثر ہے کہ جس قدر خوبصورتی اور اہتمام کے ساتھ الگ الگ پاروں میں بخاری شریف ترکی میں چھپی ہوئی ملتی ہے دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں ملتی ترکوں نے مختلف نازک مواقع پر بخاری سے اس سلسلہ میں کام لیا ہے -

جواب دینا مقصود تھا۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو مصنف کا کیا قصور اسی طرح کتاب العلم میں ایک باب مناولہ کا قائم کیا ہے اور حدیث بخاری نے اس باب میں قرآن کے جمع کرنے کے متعلق پیش کی ہے۔ مناولہ سے مراد یہ ہے کہ محدث کسی شخص کو اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ اس کی بیان کردہ روایتوں کو روایت کر سکتا ہے اگرچہ راوی نے ان حدیثوں کو نہ تو خود محدث کے سامنے پڑھا اور نہ محدث نے پڑھ کر سنایا ان کو بخاری نے جمع قرآن کی روایت پیش کر کے اس طریقہ کے جواز کو ثابت کیا ہے وہ اس طرح کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام صوبوں میں قرآن کی نقل بھجوا کر لوگوں کو اجازت دیدی تھی کہ نقل کریں اور پڑھ کر سنائیں ظاہر ہے کہ یہ ایک مناولہ کی شکل ہے امام بخاری کا مطلب یقیناً پورا ہو گیا۔ یہ کام ہے پڑھنے والوں کا اور شرح کرنے والوں کا کہ سمجھیں اور سمجھائیں امام بخاری کی کتاب کا یہ حصہ کافی توجہ اور مستحق محنت ہے۔

علاوہ اس کے بعضوں نے اس چیز کو بھی بے ربطی اور بخاری شریف کا ایک نقص بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض وقت امام صاحب باب کا ذکر بلا ترجمہ کرتے ہیں یعنی "باب" لکھ کر اس پر عنوان قایم کئے بغیر حدیث پیش کر دیتے ہیں اسی کے برعکس باب میں ترجمہ تو درج کرتے ہیں لیکن حدیث نہیں پیش کرتے اس قسم کی ندرتوں نے اہل علم میں بڑی ہلچل پیدا کر رکھی ہے خام عقلوں کے ایک طبقہ نے اس طرز عمل پر جو اعتراض کیا ہے۔ ان کی نوعیت بقول حافظ ابن حجر کے۔

اعتراض شاب غر علی شیخ　　　　زریب خوردہ نوسکھ نوجوان کا اعتراض ایک
مجرب مکتہل　　　　کہنہ مشق سال خوردہ تجربہ کار بزرگ پر ہے

کی ہے۔ اگر بادی النظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک قسم کا نقص ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ارباب تحقیق نے اس طرز عمل کے وجوہ بھی بیان کر دیئے ہیں ——————— اس میں بھی اہل فکر

کے دو طبقہ ہوگئے ہیں ان میں سے ایک کا خیال ہے کہ یہ نقص بخاری کی کتاب میں اس وجہ سے رہ گیا کہ آخری ترتیب دینے کا جو ارادہ امام کے پیش نظر تھا اس کا موقعہ نہ ملا اور وفات ہوگئی مگر واقعات کی روشنی میں یہ کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے طبقہ کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے اور واقعہ سے قریب بھی، ان کا کہنا یہ ہے کہ بخاری نے امتحاناً یہ طریقہ اختیار کیا ہے جہاں حدیث بلا ترجمہ کے ہے وہاں ان کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث سے پہلے بیان کردہ باب کے متعلق کوئی اہم مسئلہ پیدا ہوتا ہے غور کرنے والوں کو چاہئے کہ اس کی طرف توجہ کریں اور جہاں ترجمہ بلا حدیث کے ہے وہاں سابق یا لاحق حدیث سے اس کا ترجمۂ ثبوت پیدا ہوتا ہے اب یہ پڑھنے والے کا کام ہے کہ اس کو ڈھونڈھ کر نکالے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر واقعی اس استدلال کی روشنی میں ایسے ابواب واحادیث کو دیکھا جائے تو مشکل رفع ہو جاتی ہے غرض کہ امام بخاری کے اس قسم کے طرز عمل کے متعلق عارف شیراز کا وہ مشہور شعر صادق آتا ہے یعنی ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جاست   سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

ارباب فکر و بصیرت نے اسی بنار پر فرمایا ہے کہ

فقہ البخاری فی تراجمہ   امام کی فقہی قابلیت کا پتہ ان کے تراجم سے چلتا ہے۔

تراجم ابواب واحادیث کے تعلق پر بہت سے علماء نے کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں اسکندریہ کے دو عالم ناصر الدین احمد بن منیر اور زین الدین علی ابن منیر خاص شہرت رکھتے ہیں اول الذکر نے چار سو تراجم پر بحث کی ہے اور قاضی بدر الدین جماعۃ نے ان کی اس کتاب کا خلاصہ بھی کیا ہے اسی طرح مغربی افریقہ کے ایک عالم ابن رشید السبتی کا بھی ایک رسالہ اس باب میں ہے جس کا نام "ترجمان التراجم" ہے، پچھلے زمانہ میں ہندوستان کو بھی اس کا فخر حاصل ہوا ہے کہ محدث ہند

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خاص خاص تراجم بخاری پر ایک رسالہ مدوّن فرمایا اور اپنے خاص حکیمانہ غور و فکر سے لوگوں پر ان تراجم کی قیمت واضح کی یہ رسالہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ آخر میں سب سے بڑا کام جو غالباً اس سلسلے میں بے نظیر ہے وہ ہمارے شیخ کے شیخ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی تقریریں ہیں جنہیں ان کے بعض تلامذہ نے جمع کیا ہے اور وہ چھپ بھی چکی ہیں۔ ان تقریروں کے دیکھنے سے آدمی کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے مولانا مرحوم کو بخاری کے تراجم کی شرح ہی کے لئے پیدا کیا تھا جن نتائج اور حقایق کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوا ہے اگلوں کی کتابوں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں نہ پچھلوں کی کتابوں میں ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء[1]

بخاری شریف کی شرح و خلاصے بیان تشنہ اور ادھورا رہ جائیگا اگر کچھ مختصر ذکر ان شروح و مختصرات کے کام کا نہ کر دیا جائے جو بخاری شریف کے متعلق اس وقت تک علمائے انجام دیا ہے علوم دینیہ کی کتب کی عموماً و کتب علم حدیث کی خصوصاً اہمیّت کا پتہ زیادہ تر ان کتابوں کے حواشی و شروح ہی کی بنا پر کیا جاتا ہے کیونکہ کسی کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح آج کل کسی کتاب کی مقبولیت و اہمیت کا اندازہ مختلف زبانوں میں تراجم کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے امام بخاری کو ایک ایسی عظیم دینی مہم سر کرنے میں کامیابی عطا کی کہ بہت جلد ان کی کتاب نے مسلمانوں میں اتنا بلند مقام حاصل کر لیا کہ مسلمانوں کی اکثریت میں اس وقت تک اس کتاب کا مقام قرآن کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی خاص توجہ کا مرکز یہ کتاب بنی رہی۔ اپنے اپنے زمانہ میں مختلف پہلوؤں سے لوگ

---

[1] میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا سید مناظر احسن الگیلانی صدر الشعبۃ الدینیہ فی جامعۃ العثمانیہ کی ذات گرامی کی طرف ہے ۱۲

اس کتاب پر کام کرتے رہے آسانی کے لئے ہم ان خدمات کو چند حصوں میں تقسیم کر کے بیان کرتے ہیں۔

بخاری کے خلاصے | جیسا کہ معلوم ہے بخاری میں بکثرت حدیثوں کی تکرار و اعادہ سے کام لیا گیا ہے نتائج کے استنباط میں امام بخاری نے جن دقیقہ سنجیوں کو پیش نظر رکھا ہے ان کی وجہ سے صحیح بخاری میں کسی حدیث کو تلاش کرنا ذرا دشوار ہے۔ یعنی یہ کہ تلاش کرنے والے کو اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں کہ امام نے اس حدیث کا تذکرہ کس باب میں کیا ہوگا علامہ نووی نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے

قد رأیت جماعة من الحفاظ	حدیث کے حفاظ کے ایک گروہ کو میں پاتا ہوں
المتاخرین غلطوا فی مثل هذا	کہ بسا اوقات وہ انکار کر دیتے ہیں کہ بخاری
فنفوا روایة البخاری احادیث	میں فلاں روایت نہیں پائی جاتی حالانکہ اس
وهی موجودة فی الصحیح ۔	میں وہ موجود ہوتی ہے۔

دراصل اسی ضرورت کو محسوس کر کے لوگوں نے اس کتاب کے خلاصے تیار کرنے کی طرف توجہ مبذول کی سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری میں علامہ جمال الدین ابو العباس احمد بن الانصاری القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ نے اسکندریہ میں بخاری کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ ان کے بعد حلب کے ایک عالم بدرالدین حسن بن عمر بن حبیب الحلبی المتوفی ۷۷۹ھ نے "ارشاد السامع والقاری المنتقی من صحیح البخاری" کے نام سے ایک دوسرا خلاصہ مرتب کیا اس سلسلہ میں سب سے اچھا کام آخر میں نویں صدی ہجری کے ایک عالم زین الدین ابو العباس احمد بن احمد بن عبداللطیف الشرجی الزبیدی نے انجام دیا اسی کا نام "التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح" ہے ۸۸۹ھ میں زبیدی اس کام سے فارغ ہوئے اور ۸۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا

علاوہ ان خلاصوں کے حاجی خلیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے مشہور شارح مہلب ابن ابی صفرہ الازدی نے بھی کوئی خلاصہ تیار کیا تھا کشف الظنون میں ہے

وھو ممن اختصر الصحیح[1]	مہلب بن ابی صفرہ بھی ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے بخاری کا خلاصہ تیار کیا

مہلب کے اس خلاصہ کی شرح بھی ابو عبداللہ محمد بن خلف بن المرابط نے کی تھی۔ اس طرح مشہور صوفی مزاج محدث عبداللہ بن سعد بن ابی حمزہ الاندلسی نے صحیح بخاری سے تین سو حدیثوں کا انتخاب کر کے ایک مجموعہ تیار کیا اور خود ہی اس کی شرح لکھی جو چھپ چکی ہے۔ "بھجۃ النفوس" ان کی اس کتاب کا نام ہے زیادہ تر صوفیانہ معارف اور حقایق پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ نیز علاء الدین عبدالرحیم بن عبدالرحمن بن احمد العباسی الشافعی المتوفی ۹۶۳ھ نے بخاری کی حدیثوں کا ابن اثیر کی جامع الاصول کی طرز پر ایک خلاصہ لکھا تھا جس میں سندیں حذف کر دی گئی تھیں۔ انھوں نے اسی کے ساتھ ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے جیسا کہ حاجی خلیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔

واتما علی ھا مشہ بازاء کل حدیث حرفاً او حروفاً یعلم بھا من وافق البخاری علی اخراج ذلك لحدیث من اصحاب الکتب الخمسۃ	ہر حدیث کے سامنے انھوں نے ایک حرف یا چند حروف بطور رمز کے درج کئے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے اس حدیث کو صحاح ستہ کے باقی پانچ مصنفین میں سے کن کن کی کتابوں میں بخاری کی یہ حدیث پائی جاتی ہے۔

---

[1] کشف الظنون ج ۱۔ ص ۳۶۵

گویا اس سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ بخاری کے سوا صحاح کی دوسری اور کن کن کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے انھوں نے ہر ہر کتاب کے اختتام پر اس کا بھی التزام کیا ہے۔

جاعلا علی اثر کل کتاب منہ بابا لشرح غرائبہ | کہ مشکل اور نادر الفاظ کا حل بھی ہر کتاب کے آخر میں کر دیا ہے جو اس کتاب کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں۔

ان خلاصوں کے سوا بعض لوگوں نے امام بخاری کے "معلقات" یعنی مقطوع السند روایتوں کے متعلق یہ کام کیا ہے کہ جن جن کتابوں میں وہی معلق حدیث سند کے ساتھ مذکور ہے اس سے نقل کر کے ایک جگہ جمع کر دیا ہے اس باب میں سب سے اچھا کام حافظ ابن حجر کا ہے اپنی اس کتاب کا نام انھوں نے "تعلیق التعلیق" رکھا ہے جس کے متعلق مصنف کشف الظنون کی رائے ہے۔

ھو کتاب حافل عظیم النفع فی بابہ | یہ بڑی جامع حاوی اور نفع بخش کتاب ہے۔

بخاری کی شروح | اس گیارہ ساڑھے گیارہ سو سال کے عرصہ میں امام بخاری کی اس کتاب کی کامل و ناقص طویل، متوسط و مختصر شرحیں جتنی لکھی گئی ہیں ان کی حالت گویا جنود اللہ کی ہے کہ لا یعلم الا ھو۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ان شرحوں کی تھوڑی بہت تفصیل بھی کی ہے لیکن ان کا بیان کسی حد تک ناکافی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بخاری کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور مختلف زمانوں میں ترجمہ ہوئے ان میں کسی ایک شرح کا بھی بجز حسن صنعانی کی شرح کے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ جیسے ہندوستان کے شارحین کا ذکر نہیں کیا گیا اور کن کن ممالک کی شروح کو حاجی خلیفہ نے چھوڑ دیا ہے۔

بہر حال اس وقت تک جو کچھ سرسری مواد بخاری کی شروح کے متعلق ملتا ہے سہولت

کے لئے ہم ان کو چند عنوانات کے تحت درج کریں گے ۔

ناقص شروح | کامل کتاب کی شرح جن سے نہ ہو سکی بلکہ کسی خاص حصہ پر پہنچ کر ان کا کام ختم ہو گیا ہے ان ناقص شرحوں میں سب سے بڑی شرح ایک حنفی عالم قطب الدین عبدالکریم بن عبدالنور الحلبی الحنفی کی ہے یہ آٹھویں صدی ہجری کے عالم ہیں نصف بخاری تک ان کی شرح پہنچی ہے حاجی خلیفہ کا بیان ہے ۔

وھو فی عشر مجلدات ان کی یہ ناقص شرح دس جلدوں میں ہے ۔

اس کے سوا ایک ناقص شرح شرف الدین النووی شارح مسلم کی ہے جو صرف کتاب الایمان تک ہے نیز حافظ عماد الدین ابن کثیر کی بھی ایک ناقص شرح پائی جاتی ہے حافظ ابن کثیر کے بعد حافظ ابن رجب الحنبلی المتوفی ۹۹۵ھ نے چاہا تو تھا کسی بڑی شرح کو تیار کرنا لیکن کتاب الجنایات پر پہنچ کر ان کا کام آگے نہ بڑھ سکا انھوں نے بھی اپنی شرح کا نام فتح الباری رکھا تھا ۔ اسی طرح سراج الدین بلقینی کی شرح بھی کتاب الایمان تک پہنچ کر رہ گئی ہے لیکن یہ حصہ بھی (۵۰۰) کراسہ میں ہے اس کا نام انھوں نے فیض الجاری رکھا تھا ۔

صاحب قاموس مجد الدین فیروز آبادی نے "منح الباری بالسیح الفسیح الجاری" کے نام سے ایک شرح بخاری کی لکھنی شروع کی تھی لیکن ربع عبادات تک پہنچ کر کام رُک گیا تاہم یہ حصہ بھی دس جلدوں میں آیا ہے ۔ دیباچہ میں مصنف نے اپنے ارادے کو ظاہر کیا ہے کہ جس پیمانہ پر میں یہ شرح لکھ رہا ہوں ۔ کم از کم چالیس جلدوں میں وہ مکمل ہو گی مگر یہ عجیب بات ہے کہ امجد فیروز آبادی کے اس محدثانہ کام کو لوگوں نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا سخاوی نے النقی الفاسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ان المجد لم یکن بالماھر فی الصنعۃ مجد فیروز آبادی حدیث کی صناعت کے

الحدیثہ ۔ ماہر نہ تھے

اسی اسانید کے اسماء میں اس شخص سے بہت سی لغزشیں جو ہوئی ہیں اس کی وجہ یہی ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی اس شرح کو فیروزآبادی نے جیسا کہ الفاسی نے بیان کیا ہے زیادہ تر شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فتوحات مکیہ کی عبارتوں سے اپنی کتاب کو بھر دیا ہے ۔ حافظ ابن حجر کی کتاب " انباء الغمر " کے حوالہ سے لکھا ہے کہ صاحب قاموس کے زمانہ کے مشہور عارف شیخ اسماعیل الجبرتی ۔ کا اثر لوگوں پر بہت زیادہ تھا اور وہ شیخ ابن عربی کے بہت بڑے حامی تھے اس رنگ کو دیکھ کر فیروزآبادی فتوحات مکیہ کی عبارتیں نقل کرتے چلے گئے ہیں ۔ ابن حجر کا بیان ہے کہ ایک طرف تو اس شخص کا یہ حال تھا لیکن

" لما اجتمعت بالمجد اظهر انکار مقالات ابن عربی ودرایہ

مجدالدین فیروزآبادی سے میری جب ملاقات ہوئی تو ابن عربی کے نظریات اور مقالات کا مرے سامنے انکار کیا یعنی ان کو پسند نہیں کرتے تھے ۔

اسی طرز کی ایک دوسری شرح ابوالفضل محمد الکمال بن محمد بن احمد النویری خطیب مکہ المتوفی سنہ ۸۷۳ھ کی بھی ہے ۔ کشف الظنون میں ہے

ھو اشرح مواضع فیہ

بخاری کے چیدہ چیدہ مقامات کی شرح . اس شخص نے کی ہے ۔

اسی طرح (مغرب اقصٰی) کے مشہور عارف ابن مسدد وابن مرزوق مشہور شارح قصیدہ بردہ نے بھی المتجر الربیح والمسعی الرجیح کے نام سے ایک شرح شروع کی تھی جو نامکمل رہ گئی ناقص شروح کے سلسلہ میں شیخ ابی البقار محمد بن علی بن خلد الاحمدی المصری نزیل مدینہ

وغیرہ بزرگوں کی شروح کا تذکرہ بھی کتابوں میں ملتا ہے۔

شروح کے ساتھ حواشی جو گویا اہم مقامات کی غیر مکمل شروح کی تعبیر ہے متعدد بزرگوں کی طرح ان کو منسوب کیا گیا ہے مثلاً ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی الحافظ المتوفی ۵۲۵ھ میں بخاری کے بعض مقامات پر حواشی لکھے ہیں نیز سلاطین آل عثمان کے عہد کے علماء ابن کمال پاشا ترکی فضل بن علی الجمال اور مصلح الدین مصطفےٰ ابن شعبان مولانا محمد بن الکفوی مصنف طبقات الحنفیہ وغیرہ نے بخاری کی جستہ جستہ مقامات پر حواشی اور نوٹ لکھے ہیں۔

کامل مختصر شروح | اس سلسلہ میں سب سے اچھا ٹھوس اور مستند کام ابوسلیمان احمد ابن محمد بن ابراہیم کا ہے جو عام طور سے علامہ خطابی کے نام سے مشہور ہیں۔ شارحین بخاری میں شاید یہی سب سے پہلے آدمی ہیں، یہ تیسری صدی ہجری کے عالم ہیں سنہ ۳۰۸ھ میں ان کی وفات ہوئی حاجی خلیفہ نے ان کی شرح کے متعلق لکھا ہے۔

هو شرح لطیف فیه نکت لطیفة	یہ ایک پاکیزہ لطیف شرح ہے جس میں لطیف
و لطائف شریفة	نکتے اور شریف وقیمتی حقائق ملتے ہیں۔

اسی کا نام "اعلام السنن" ہے کتاب کے دیباچہ میں خطابی نے لکھا ہے کہ "معالم السنن" کی تصنیف سے بلخ میں جب فارغ ہوا تو اس شہر کے رہنے والوں کا مطالبہ ہونے لگا کہ بخاری کی بھی ایک شرح لکھ دوں اور یہ کتاب انہی کی مطالبہ کی تکمیل ہے۔ خطابی کی اس شرح پر امام محمد تیمی نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے جس میں خطابی کی لغزشوں پر تنبیہ کرتے ہوئے صحیح بخاری کی ان مشکلات کا جو خطابی سے رہ گئے تھے حل پیش کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

برما

(از جناب مظفر شاہ خاں صاحب یوسفی - ایم - اے)

گذشتہ جنگ عظیم میں مشرق بعید کے قریب قریب سب ہی ملک تباہی اور بربادی کا شکار ہوئے اور ناقابل برداشت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں اپنی گری ہوئی حالت کا شدید احساس ہوا اور وہ برسوں کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ شہنشاہیت کی قدیم بنیادیں یک دم ہل گئیں، اور سارے مشرق بعید میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک آزادی اور خود مختاری کی لہر دوڑ گئی، نیند کے ماتے جاگ اُٹھے اور اپنا پیدائشی حق حاصل کرنے کے لئے بڑے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

آزادی کی اس دوڑ میں برما بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنگ سے پہلے وہاں کی زندگی میں موت کا سکوت تھا۔ عام لوگوں میں کوئی سیاسی بیداری نہ تھی صرف چند بڑے لوگ اپنی ذاتی منفعت کے لئے سیاسی چالیں چلتے رہتے تھے اور برما کی سیاست کا دائرہ بس انہی تک محدود تھا، عوام کو کچھ خبر نہ تھی، وہ بھوک اور افلاس کے شکار تھے، لیکن اپنی حالت سے مطمئن۔ ان میں کوئی بے چینی نہ تھی۔ یوں دونوں سرحدوں کے پار ہندوستان اور چین میں بڑے بڑے انقلاب آرہے تھے، لیکن برما کی فضا میں مکمل سکوت تھا۔ البتہ کبھی کبھی زندگی کی ایک معمولی سی لہر دوڑتی دکھائی دیتی تھی، مگر وہ بھی ہنگامی بجلی کی طرح چمکی اور ختم ہو گئی۔

لیکن جنگ نے برما کی ساری حالت بدل کر رکھ دی، سچ پوچھئے تو جنگ کے شعلوں میں برما نے ایک نئی زندگی پائی، اور اس نے اپنا پرانا چولا اُتار کے پھینک دیا۔ نئے برما کو پرانے برما

سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ اب وہ آسان پسندوں اور کاہلوں کا ملک نہیں رہا بلکہ آزادی کے متوالے جوانمردوں کا وطن کہلانے لگا۔ جنھیں اپنا مستقبل خود اپنے ہاتھوں سنوارنے کی لو لگی ہوئی تھی۔ جنگ کے بعد سارے مشرق بعید میں بیرونی طاقتوں کے پنجے سے آزاد ہونے کی ایک عام تحریک اٹھی اور جاوا اور ہندچینی کی طرح برما نے بھی اس تحریک کو لبیک کہا۔

برما ہندوستان کا پڑوسی ہے، اور ان دونوں ملکوں کے ثقافتی اور سماجی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ مشرق بعید میں یورپی طاقتوں کے اقتدار سے پہلے ہندوستان اور چین ہی دو ایسے ملک تھے، جن کا تمدن سب پر حاوی تھا۔ آس پاس کے سارے ممالک ان دونوں کے رسم ورواج، اور تہذیب وتمدن سے متاثر تھے،

پنڈت جواہرلال نہرو کے قول کے مطابق، اصولی طور پر نظام حکومت اور فلسفہ تو چین سے آیا اور مذہب اور آرٹ ہندوستان نے دیا۔

برما اور ہندوستان کا تعلق اشوکِ اعظم کے وقت سے چلا آرہا ہے، ہندوستان کی قدیم کتابوں میں برما کو "سورن دیش" یعنی "سونے کا ملک" کہا گیا ہے، دوہزار سال پہلے "گوتم بدھ" کا روحانی پیغام اس سرزمین سے برما پہنچا، جس نے دونوں ملکوں کو ایک روحانی رشتہ میں منسلک کردیا۔ جب تک ہندوستان کی اقتصادی برتری اور اس کی تہذیب کا آفتاب نصف النّہار پر رہا۔ ہندوستان اور برما کے درمیان اقتصادی اور مذہبی رشتہ برابر قائم رہا۔ لیکن جب مغربی تہذیب کا دور دورہ ہوا تو یہ مقناطیسی قوّت سرد پڑگئی اور دونوں طرف سکون چھانے لگا۔

مشرقِ بعید کے یہ ممالک مغربی قوموں کی ٹکر نہیں سنبھال سکے اور بالآخر کسی نہ کسی صورت میں ان کے پنجۂ غلامی میں آگئے، ۱۸۲۳ء سے لے کر ۱۸۸۵ء تک برطانیہ نے برما میں

تین جنگیں لڑیں، ہر مرتبہ برمیوں نے جی توڑ مقابلہ کیا، برما والے بہادر تو تھے، لیکن ان کے پاس فوجی ساز و سامان نہ تھا، پھر کوئی ایسی مضبوط قومی حکومت بھی نہ تھی، جو متحدہ طور پر بیرونی حملہ کا مقابلہ کر سکتی۔ آخر ۱۸۸۵ء میں برما فتح ہو گیا۔ اور سارے برما پر برطانیہ کا تسلط ہو گیا۔

برطانوی تسلط کے بعد برما کی ساری صنعت و حرفت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی، اور برما صرف کاشتکاروں کا ملک ہو کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ کا تجارتی مفاد اسی میں تھا کہ ایشیا کے دوسرے غلام ملکوں کی طرح برما میں بھی اس کے صنعتی مال کی کھپت ہو اور برما کی خام پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے، اور وہ اپنی ضرورتوں کے لئے دوسروں کا محتاج رہے چنانچہ تیل کے چشموں کی دریافت سے پہلے برما میں کوئی معمولی کارخانہ بھی نہیں کھولا گیا۔

چاول، لکڑی اور تیل برما کی خاص پیداوار تھی۔ اور جس پر برطانوی کمپنیوں کی اجارہ داری تھی، یہ کمپنیاں ان چیزوں کی برآمد سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھیں ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء میں ایک کروڑ تہتر لاکھ ستاسی ہزار دو سو اکتالیس ایکڑ میں چاول پیدا ہوتا تھا، اور کل پیداوار ساٹھ لاکھ ٹن تھی۔ جس کا بیشتر حصہ برطانوی کمپنیاں اپنے نفع کی خاطر باہر بھیج دیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر سال دو لاکھ ٹن عمارتی لکڑی باہر جاتی تھی، اور لاکھوں گیلن پیٹرول دوسرے ملکوں کو بھیجنے کے لئے برما کے کارخانوں میں تیار کیا جاتا تھا۔ غرض برطانوی سرمایہ دار ایک طرف تو برما کی خام پیداوار سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور دوسری طرف وہاں برطانیہ کے صنعتی مال کی کھپت ہو رہی تھی، اگرچہ بعد میں جاپان بھی صنعتی میدان میں آگے بڑھا۔ اور اس کا مال بھی برما پہنچنے لگا لیکن برطانیہ کی اجارہ داری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ کیونکہ حکومت کی باگ ڈور تو اسی کے ہاتھ میں تھی۔

برطانیہ نے پہلے تو اپنے مفاد کی خاطر برما کو ہندوستان میں شامل رکھا، لیکن جب ہندوستان میں انقلابی تحریکوں نے زور پکڑا اور برطانوی شہنشاہیت کو پے در پے جھٹکے لگنے لگے تو پھر ۱۹۳۷ء میں برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا، مقصد یہی تھا کہ اس طرح برما ہندوستان کی انقلابی فضا سے متاثر نہ ہونے پائے اور وہاں برطانوی اقتدار کو کوئی آنچ نہ پہنچے۔ مگر اس وقت تک برما میں انقلابی رجحان پیدا ہو چکا تھا، اور قومی جدوجہد کے لئے میدان تیار ہوتا جا رہا تھا۔ طلبار اور کسانوں کے مظاہروں سے پتہ چلتا تھا کہ انقلاب کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے، پھر اسی انقلاب کے اثرات اچھی طرح سرایت کر چکے تھے، اور تھاکن پارٹی کے نام سے ایک انقلابی جماعت وجود میں آگئی۔

دراصل تھاکن پارٹی کے قیام کے بعد سے ہی برما کی آزادی کی عام جدوجہد شروع ہوتی ہے، اس سے پہلے، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، سیاسی سرگرمیاں صرف اوپر کے طبقہ تک محدود تھیں، جو اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لئے شطرنجی چالیں چلتے رہا کرتے تھے، عوام کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تھاکن پارٹی نے پہلی مرتبہ انقلابی پروگرام رکھا، اور عوام کو ساتھ لے کر آگے بڑھی، اور اس طرح ۱۹۳۰ء میں برمیوں نے اپنی آزادی کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کی۔

تھاکن پارٹی کا ایک وفد اُو آنگ سان کے زیر قیادت کانگریس کے رام گڑھ کے اجلاس (۱۹۴۰ء) میں آیا تھا جس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ہندوستان اور برما کے عوام برطانوی شہنشاہیت کے خلاف متحد ہوتے جا رہے ہیں، اور ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔

ابھی جنگ کے آغاز کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ برطانوی حکومت نے جنگی ضرورتوں

کی آڑ لے کر برما میں شہری آبادی پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔ اور لوگوں کے انقلابی جوش کو دبانے کے لئے حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی۔ جنگ کی وجہ سے برما کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی اور غریب عوام طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا شکار ہو رہے تھے، لیکن اب وہ خاموشی سے اس حالت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ ان میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ اور تھاکن پارٹی، حکومت کی سخت مخالفت کے باوجود روز بروز مضبوط ہوتی گئی۔

جب جاپان میدان جنگ میں کودا اور بحر الکاہل کی لڑائی شروع ہوئی تو حالات نے ایک رُخ بدلا۔ برطانیہ نے برما کو جاپان کی جارحانہ کارروائیوں سے بچانے کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس نے ترقی پسند طاقتوں کو منتشر کر کے جاپانیوں کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ پھر برما کی ہمسایہ طاقتوں کو جو جاپانیوں کا مل کر مقابلہ کرنا چاہتی تھیں، متحد نہیں ہونے دیا گیا۔ حکومت کی سختیوں کی وجہ سے برما کی سب قوم پرست جماعتیں روپوش ہو گئیں اور در پردہ کام کرنے لگیں۔ اس وقت، اگرچہ عوام میں برطانیہ کے لیے نفرت بڑھ گئی تھی، لیکن ان میں فاشی طاقتوں کے خلاف تیز و تُند جذبات کی کمی تھی، چنانچہ جاپانیوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنا اُلّو سیدھا کیا،

ادھر تھاکن پارٹی میں اختلافات پیدا ہو گئے، اور پارٹی کا ایک حصّہ جاپانیوں سے جا ملا اور ان لوگوں نے برطانوی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے جاپانیوں کے ماتحت ایک فوج بنالی۔ اس وقت عام لوگوں نے عملی طور پر جاپانیوں کا ساتھ دیا، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ لوگ برطانیہ کے مظالم کا شکار رہ چکے تھے، ان کے دل نفرت اور غصہ سے بھرے ہوئے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ جاپانی برطانیہ کے دوست ہیں، اس لئے ہمارے دوست ثابت ہوں گے،

مشہور نوجوان لیڈر اُونگ سان نے بھی اسی خیال کے پیش نظر جاپانیوں کی مدد کی ،انھیں اُمید تھی کہ اس طرح برما کو جلد از جلد آزادی حاصل ہو جائے گی ، لیکن جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ جاپانیوں نے تو ان کے ساتھ برطانیہ سے بھی بدتر سلوک روا رکھا ، تو انھیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا ، اور انھوں نے فوراً اپنا راستہ بدل دیا ، اب لوگوں نے جاپانیوں کے خلاف عوام کو متحد کرنا شروع کر دیا ۔ فاشی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اینٹی فاسسٹ پیپلز فریڈم لیگ (Anti fascist Peoples freedom League) کے نام سے ایک جماعت بنائی گئی ، دراصل جاپانیوں کے پنجے سے نکلنے کے لئے یہ ایک متحدہ محاذ قائم کیا گیا تھا ، جس میں کمیونسٹ سوشلسٹ اور دوسری جماعتوں کے لوگ شامل تھے ، اب اسی نئی جماعت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر عام لوگوں نے برطانوی فوجوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جاپانیوں کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا اور ان کے ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور سخت نقصان پہنچایا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت نے برما کو جاپانیوں کے چنگل سے چھڑانے میں بڑا کام کیا ، اگر یہ لوگ اس طرح برمی قوم کو جاپانیوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار نہ کرتے تو مشرق بعید میں جاپانیوں کو شکست دینے میں بہت دیر لگ جاتی ۔

اب یہ دیکھئے کہ جن لوگوں نے اپنے وطن کو دشمن کے چنگل سے چھڑانے میں سر دھڑ کی بازی لگائی اور مشرق بعید میں اتحادی قوموں کی فتح کے لئے میدان تیار کیا ، ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ، مارچ ۱۹۴۵ء میں رنگون پر قبضہ ہوا اور پورا برما فتح ہو گیا اس کے بعد فوراً ہی برما پر ایک ایسا آہنی نظام مسلط کر دیا گیا ، جو ان لوگوں کے لئے جاپانیوں کی ڈکٹیٹر شپ سے کسی صورت میں بہتر نہ تھا ۔ جاپانیوں کے خلاف لڑنے والے لیڈروں کو غدار قرار دیا گیا ، اور جن لوگوں نے واقعی جاپانیوں کا ساتھ دیا تھا ۔ انھیں ذمہ دار عہدوں پر رکھا گیا ۔

اس فوجی نظام کا مقصد یہی تھا کہ برما کی نجات دھندہ اینٹی فاسسٹ پیپلز فریڈم لیگ کو ختم کر دیا جائے اور پھر سے برطانوی راج قائم کرنے کے لئے میدان تیار کیا جائے۔ فریڈم لیگ یہ نہیں برداشت کر سکتی تھی کہ کسی طرح برطانوی سامراج برما میں پھر اپنے پنجے جمالے۔ برطانیہ کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، جاپانیوں کے خلاف جس حمایت نے انھیں پوری مدد دی تھی، اب وہی ان کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے تھے، کسی طرح بھی کھلے روپ میں شہنشاہیت کا دوبارہ تسلط ناممکن تھا۔ اور نہ پرانے ہتھکنڈوں سے نئی صورت حالات پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ بالآخر برطانیہ کو بھی اپنا طریقہ بدلنا پڑا۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں فوجی افسروں نے برما کا سارا انتظام گورنر کو سونپ دیا، پھر بھی حکومت کی ظلم و زیادتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فریڈم لیگ کے جماعتی نظم میں رخنہ ڈالنے کے لئے یہ کوشش کی گئی کہ سوشلسٹ اور موجیٹ پارٹی کے لوگ حکومت میں آجائیں، لیکن یہ چال بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ فریڈم لیگ، برما کی ایگزیکٹیو کونسل میں شامل ہونے کو تیار تھی، بشرطیکہ اسے زیادہ سیٹیں ملیں اور اس کے نمائندوں کو پارٹی کے پروگرام کے مطابق کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن برما کے گورنر سر ریجینالڈ نے ان شرطوں کو غیر جمہوری کہہ کر ٹھکرا دیا۔

اب حالات بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے، اور برطانیہ کو روز بروز نئی نئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا! اپریل ۱۹۴۶ء تک ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ برطانیہ کو خطرہ محسوس ہونے لگا، ظلم و زیادتی کے سارے حربے بیکار ہو چکے تھے، فریڈم لیگ میں افتراق پیدا کرنے اور اسے دنیا کی ہمدردی سے محروم رکھنے کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں، ادھر انقلابی عناصر اس قدر زور پکڑ گئے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ جانے کا خطرہ سامنے تھا۔ موجودہ گورنر کی پالیسی ناکام ہو چکی تھی، اور ضرورت تھی کہ کسی ایسے مدبر کو گورنر بنایا جائے، جو ان طوفانی

حالات میں شہنشاہیت کی ڈوبتی کشتی کو بچا سکے چنانچہ سر ہربرٹ رینس کو برما کا گورنر بنایا گیا، انھیں برما کے معاملات کا زیادہ تجربہ تھا اور جو نئی پالیسی کو اچھی طرح بروئے کار لا سکتے تھے، نئے گورنر کے تقرر کے بعد سے برما میں برطانوی حکومت کی طرف سے جو کچھ ہوا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہیت میں کیسی لچک ہے اور کس طرح وہ حالات کے مطابق خود کو ڈھال سکتی ہے۔

سر ہربرٹ رینس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اونگ سانگ سے گفت و شنید کر کے ہندوستانی نمونہ کی ایک عارضی قومی حکومت قائم کر دی جس میں فریڈم لیگ کے ممبروں کی تعداد زیادہ تھی، لیکن یہ حکومت کسی معنوں میں بھی قومی حکومت نہیں تھی، نئی حکومت کے ممبر گورنر کی پالیسی پر چلنے کے لئے مجبور تھے، اور پھر مالیات، دفاع اور خارجی معاملات کے محکمے قطعی طور پر گورنر کے ہاتھ میں تھے۔ اس حکومت میں شامل ہونے کے سوال پر فریڈم لیگ کے ممبروں میں کافی اختلاف تھا۔ اور اس وقت دائیں اور بائیں بازو کا فرق زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کمیونسٹ ایسی حکومت میں شامل ہونے کے خلاف تھے، ان کا اصرار تھا کہ نئی حکومت کو پارٹی کے نصب العین یعنی مکمل آزادی کے حصول کے لئے کھلے طور پر کام کرنے کا حق ہونا چاہیے لیکن دائیں بازو نے، جو اس وقت برسر اقتدار آ چکا تھا، یہ بات نہیں مانی، اور کمیونسٹوں کو پارٹی سے خارج کر دیا۔

آخر کو فریڈم لیگ کے اکثر ممبر ایگزیکٹیو کونسل کے کام سے مطمئن نہیں ہوئے، انھوں نے دیکھ لیا کہ یوں کام نہیں چلے گا، لیگ کی مجلس عاملہ نے ۱۲ر نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک قرارداد منظور کی، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر برما کو مکمل آزادی دیدی جائے اور برطانوی حکومت ۳۱ر جنوری ۱۹۴۷ء تک اس امر کا باقاعدہ اعلان کر دے، اور ساتھ ہی اس تاریخ تک موجودہ ایگزیکٹیو کونسل کو صیحم ..

معنوں میں قومی حکومت کا درجہ دے دیا جائے۔ اسی قرارداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت عوام میں کس قدر بے اطمینانی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی، فریڈم لیگ کے لیڈر حکومت میں تھے، اور اُن کا فرض تھا کہ وہ پارٹی کے مقاصد کے پیش نظر ان مطالبات کو انگریزوں سے منوانے کی پوری پوری کوشش کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوا اور عوام سے یہ لوگ دور ہوتے چلے گئے۔

برطانیہ نے اس وقت یہ مناسب سمجھا کہ برما کے لئے کوئی مستقل اسکیم بنادی جائے، چنانچہ برما کو ایک وفد بھیجنے کی دعوت دی گئی تاکہ لندن میں بیٹھ کر برما کے مستقبل کے بارے میں گفت و شنید کی جائے۔ اُو آنگ سان برمیوں کا ایک وفد لے کر لندن پہنچے، لندن جاتے ہوئے، انھوں نے نئی دلی میں کہا تھا "ہم برما کی آزادی اور ان عارضی انتظامات کے بارے میں بات چیت کرنے جارہے ہیں، جنھیں ہم جلدی بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات بھی زور دے کر کہی تھی کہ برما کو درجۂ نوآبادیات دینے کا کوئی سوال ہی نہیں، ہم تو مکمل آزادی چاہتے ہیں، اگر اس مرتبہ کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا تو پھر ۱۳ر جنوری سے برما میں سیاسی تعطل برپا ہوجائے گا۔"

لندن میں کئی ہفتے کی بات چیت کے بعد ایک سمجھوتہ ہوگیا، اس سمجھوتے کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ ناموافق حالات میں بھی برطانیہ نے اپنے شہنشاہیت پرستانہ مفاد کو قائم رکھنے کی بہت کچھ گنجائش رکھ لی۔ اور برمیوں کی آرزوئیں بہت کچھ تشنۂ تکمیل ہی رہیں، خود اُو آنگ سان کو بھی اس بات کا اقرار تھا، انھوں نے کانفرنس کے بعد ایک بیان میں کہا تھا:۔ "یہ صحیح ہے کہ ہمارا مطالبہ مکمل طور پر پورا نہیں ہوا، لیکن ہم نے ایسی بنیادی باتیں منوالی ہیں، جن کے ذریعہ ہم امن وعافیت کے ساتھ اپنی قومی آزادی کو کامیاب بناسکیں گے۔"

ہر ملک میں کچھ ایسے عناصر ضرور ہوتے ہیں، جنھیں آگے بڑھا کر قومی ترقی کے راستے میں مشکلات پیدا کی جاسکتی ہیں، اور بیرونی طاقتیں اپنے مقصد کے لئے ان سے کام لیتی ہیں،

چنانچہ برما میں بھی دوسری مشکلات کے ساتھ کاربن، کاچن اور شان کے قبیلوں کا ایک خاص مسئلہ ہے۔ ان قبیلوں کے اپنے اپنے سردار ہیں، اور یہ لوگ اپنے پرانے معاشی اور معاشرتی نظام پر قائم ہیں، نئے جمہوری نظام کو ذرا مشکل سے ہی قبول کریں گے، پھر برطانیہ نے ان لوگوں کے خصوصی مفاد کی پوری وکالت کی ہے۔ لندن کانفرنس کے بعد ایک سرکاری بیان میں کہا گیا تھا: "برما کے قبائلی علاقوں کو مرکز سے ملانے کی ہم نے ہمیشہ کوششیں کی ، لیکن اب ضروری ہے کہ آئندہ اس سلسلہ میں جو کچھ ہو وہ ان علاقوں کے لوگوں کی آزاد رائے سے ہو"

۴ر جنوری ۱۹۴۸ء کو برما آزاد ہو گیا۔ اور وہاں ایک خود مختار جمہوریت قائم ہو گئی۔ خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ برما کی آئین ساز اسمبلی نے یہ پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ برما دولت متحدہ برطانیہ میں شامل نہیں ہوگا۔ البتہ برما اور برطانیہ کے درمیان ایک فوجی سمجھوتہ پہلے ہی ہو چکا ہے اب دیکھئے آزاد برما کی جمہوری حکومت اپنے اندرونی معاملات اور خاص کر قبائلی علاقوں کے مسئلہ کو کس طرح سلجھاتی ہے، ان علاقوں میں خود مختاری کی ہوا پھیلی ہوئی ہے، کاربن نیشنل یونین کے نام سے ایک جماعت بن چکی ہے، جس کا مطالبہ ہے کہ علیحدہ ایک خود مختار کاربن ریاست بنا دی جائے، ابھی فروری میں کئی جگہ اس مطالبہ کے حق میں مظاہرے بھی ہو چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء :- مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ۸/ مجلد ۱۰/۸

سرمایہ :- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ/

اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث قیمت ۶/ مجلد ۷/

خلافتِ بنی امیہ :- تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت ۳/۸ مجلد ۳/۱۲ مضبوط اور عمدہ جلد ۴/۱۲

سنہ ۱۹۴۴ء :- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت ۴/ مجلد ۵/

نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی جسمیں تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت کیا رہا ہے۔ قیمت ۴/ مجلد ۵/

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت ۴/۸ مجلد ۵/۸

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی قیمت ۳/ مجلد ۴/۸

سنہ ۱۹۴۵ء :- قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف اور مباحثِ تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت ۲/ مجلد ۳/

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان قیمت ۵/۸ مجلد ۶/۸

انقلابِ روس۔ انقلابِ روس پر بلند پایہ تاریخی کتاب قیمت ۳/

سنہ ۱۹۴۶ء :- ترجمان السنۃ :- ارشاداتِ نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع ۲۹×۲۲/۸ جلد اول ۸/ مجلد ۹/

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم قیمت ۴/ مجلد ۵/

مسلمانوں کا نظمِ مملکت : مصر کے مشہور ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی کی محققانہ کتاب "النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ۔ قیمت ۴/ مجلد ۵/

تحفۃ النظار :- یعنی خلاصۂ سفرنامہ ابنِ بطوطہ مع تحقیق و تنقید از مترجم قیمت ۲/۸ قسم اعلیٰ ۳/

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز اور دلچسپ تاریخی کتاب قیمت ۲/

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے۔ اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین :۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی. نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ" برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین :۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احباء۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا انکو رسالہ بلاقیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دیجائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبا کیلئے ہے

قواعد

۱۔ برہان ہر انگریزی مہینے کی یکم تاریخ کو شائع ہوجاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں انکی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

۴۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے۔ (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۱۰؍

۶۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کراکر دفتر رسالہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۳۹ء:- اسلام میں غلامی کی حقیقت:- جدید اڈیشن جسمیں نظرِ ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳ر مجلد ۴ر

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت ۲ر مجلد ۳ر

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:- اشتراکیت کے متعلق جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم۔ قیمت ۳ر مجلد ۴ر

ہندستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۱۲ر

سنہ ۴۰ء:- نبی عربی صلعم:- تاریخ ملت کا حصہ اول جسمیں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے جدید اڈیشن جسمیں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے قیمت ۱۲ر مجلد ۱۴ر

فہم قرآن، جدید اڈیشن جسمیں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے قیمت ۲ر مجلد ۳ر

غلامانِ اسلام:- اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات وفضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید اڈیشن قیمت ۶ر مجلد ۸ر زیرطبع

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید اڈیشن جسمیں حک وفک کے بعد غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے قیمت ۶ر مجلد ۸ر

سنہ ۴۱ء۔ قصص القرآن جلد اول:- جدید اڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات واقعات تک۔ قیمت ۵ر مجلد ۶ر

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب ۲ر مجلد ۳ر

بین الاقوامی سیاسی معلومات:- یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔ قیمت ۲ر

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب اور تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید اڈیشن ۲ روپے زیرطبع

سنہ ۴۲ء:- قصص القرآن جلد دوم۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک دوسرا اڈیشن ۳ر مجلد ۴ر

اسلام کا اقتصادی نظام:- وقت کی اہم ترین کتاب جسمیں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن ۴ر مجلد ۵ر

مسلمانوں کا عروج اور زوال:- صفحات ۳۵۰ جدید اڈیشن قیمت ۴ر مجلد ۵ر۔

خلافتِ راشدہ و تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید اڈیشن قیمت ۲ر مجلد ۲ر مضبوط اور عمدہ جلد قیمت ۴ر

برہان

جلد بست ویکم   شمارہ (۵)

مئی سنہ ۱۹۴۸ء مطابق جمادی الآخر سنہ ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان اجنبی اقتدار سے آزاد تو ہوگیا لیکن کسی ملک کے لئے محض آزاد ہو جانا اور خود مختار حکومت کا مالک ہو جانا اس وقت تک کوئی خوش آئند اور قابل مبارکباد چیز نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی آزادی کو قایم و برقرار رکھنے کی اچھی اور عمدہ صلاحیت کا ثبوت نہ دے جہاں تک اس صلاحیت کا تعلق ہے ہمارا ملک دنیا کے بڑے سے بڑے ترقی یافتہ اور مہذب و متمدن ملک سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ دماغی اور ذہنی اعتبار سے تعلیمی اور ملکی وسائل پیداوار کے لحاظ سے اس ملک میں اس بات کی استعداد ہے کہ اگر ان صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بالکل صحیح صحیح کام لیا جائے تو وہ نہ صرف ایشیا کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔

کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے سب سے پہلی شرط داخلی امن و امان ہے یہ چیز جس قدر آج کل ضروری ہے شاید پہلے کبھی اتنی ضروری نہیں تھی، کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی طاقت جب کسی ملک پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو وہ اس میں خلفشار اور بدامنی و بے چینی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتی ہے تو انسانیت اور حقوق عامہ کی حفاظت کے نام پر اس ملک کو اپنے زیر نگیں لے آنے کی سعی کرتی ہے۔ تاریخ میں جب کبھی کسی ملک نے دوسرے ملک پر حملہ کیا اور اسے فتح کیا ہے ایسے ہی حیلوں اور بہانوں سے کیا ہے پھر آج کل جدید وسائل خبر رسانی اور برق صفت ذرائع نقل و حرکت نے بڑی طاقتوں کے لئے اس چیز کو اور بھی سہل اور آسان کر دیا ہے۔

اس وقت اگر ایک طرف دنیا کے بین الاقوامی سیاسیات کو اور دوسری جانب خود ملک کے اندرونی حالات وواقعات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا ملک تاریخ کے ایک بہت ہی نازک دور سے گذر رہا ہے۔ بین الاقوامی حالات یہ ہیں کہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتیں یعنی روس اور امریکہ دونوں ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں باہمی کشیدگی اور منافرت وعداوت کی خلیج روز بروز وسیع تر ہوتی جارہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک کا وجود وبقا اسی پر موقوف ہے کہ دوسرے کو سیاسی قوت کے اعتبار سے بالکل مفلوج اور اپاہج بنا دیا جائے۔ دلوں کا غبار زبانوں سے برملا ظاہر ہونے لگا ہے اور خود یورپ مشرقی اور مغربی یورپ میں تقسیم ہو کر دو مختلف جنگی محاذوں میں بٹ گیا ہے ان حالات میں اگر تیسری جنگ ہوتی ہے جس کا شدید خطرہ ہے تو یہ تو مستقبل بتائیگا کہ دونوں میں سے کون جیتے گا اور کس کو شکست ہوگی لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ایشیا، کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بری طرح پامال ہو جائینگی اور ان کے لئے اپنی زندگی اور آزادی کو برقرار رکھنا نہایت ہی مشکل ہو جائیگا ان حالات سے ہند کا متاثر ہونا بھی ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

دوسری جانب ملک کے عام اندرونی حالات یہ ہیں کہ اب اگرچہ بظاہر امن وامان ہے لیکن دلوں میں اب تک اتحاد ویگانگت کے وہ جذبات پیدا نہیں ہوئے جو ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہیں اب تک نہ اقلیت میں مکمل بھروسہ اور اطمینان پیدا ہو سکا ہے اور نہ اکثریت ہی اوس کو مکمل طور پر اپنا سکنے میں کامیاب ہوئی ہے چنانچہ پچھلے دنوں جلیانوالہ باغ کی یادگار میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں سابق صدر کانگرس اچاریہ کرپلانی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر مسلمان واقعی انڈین یونین کے وفادار ہیں تو انھیں حیدرآباد جاکر وہاں کی حکومت پر زور

ڈالنا چاہئے کہ وہ انڈین یونین کے خلاف اپنی سرگرمیاں بند کردے" اس کے بعد اس بیان کی توضیح میں انھوں نے ایک اور بیان دیا جس میں فرمایا گیا کہ "ممکن ہے میری صاف گوئی بعض مسلمانوں کو ناگوار ہو لیکن میں نے کہا وہی ہے جو عام طور پر ہر ایک شخص محسوس کرتا ہے"

اچاریہ کرپلانی کا یہ بیان اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اکثریت کے عوام تو عوام خود اس کے بعض ذمہ دار لیڈروں کے دل و دماغ میں بھی اقلیت کی نسبت وہ اعتماد پیدا نہیں ہو سکا ہے جو ہونا چاہئے تھا۔ ورنہ اب جب کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں حکومت غیر فرقہ وارانہ ہے اور سب کے لئے یکساں حقوق رکھتی ہے اور سیاسیات میں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اچاریہ کرپلانی ایسے ذمہ دار لیڈر کے لئے ہندو اور مسلمان کی تفریق کرنا اور اہم سیاسی معاملہ میں مسلمانوں سے ہی ایک مخصوص مطالبہ کرنا کیونکر برمحل ہو سکتا ہے۔ پس جب اکثریت کی بے اعتمادی کا اب تک یہ عالم ہے تو اقلیت کو ہی کس طرح خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس صورت حال کو کوئی سچا محب وطن کبھی ایک لمحہ کے لئے پسند نہیں کر سکتا۔ ضرورت اسی کی ہے کہ جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا اس کو یک قلم بھلا دیا جائے۔ بُرا سب نے ہی کیا ہے اور کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے ہاتھ خون سے رنگین نہ ہوں لیکن انسان بہرحال انسان ہے۔ وہ ایک مرتبہ مغلوب الجذبات ہو کر وحشیوں اور درندوں کے سے کام کر بیٹھتا ہے تو بعد میں پھر اُن پر نادم اور پشیمان ہو کر تلافی مافات بھی کر سکتا ہے یہ وقت ہے کہ ہم سب اپنی پچھلی غلطیوں اور گنہگاریوں کا صدق دل سے اعتراف کر کے آئندہ کے لئے عدل و انصاف اور حق و صداقت کے راستہ پر گامزن ہونے کا عہد و پیمان کریں اور جن باہمی افتراقات کے باعث ملک کو اس قدر عظیم بربادی اور تباہ حالی سے دو چار ہونا پڑا ہے ان کو یکسر ختم کر کے عام اتحاد و یگانگت کی

خوشگوار فضا پیدا کریں لڑائی کس میں نہیں ہوتی؟ بھائی بھائی سے لڑتا ہے۔ چچا بھتیجہ میں جنگ ہوتی ہے۔ اور تاریخ میں تو ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ بیٹے نے باپ کے خلاف لشکر کشی کی ہے لیکن کیا ان لڑائیوں کا جو وقتی جذبات یا کسی ہنگامی اشتعال کے باعث ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فریقین کا قدرتی اور طبعی رشتہ ٹوٹ جائے؟

ہندو اور مسلمان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک ہی مادر وطن کی اولاد ہیں جو ایک چیز کسی ایک کے لئے مضر ہو گی ضروری ہے کہ جلد یا بدیر وہ دوسرے کے لئے بھی نقصان رساں ثابت ہو گی اس بنا پر دونوں کا فائدہ اسی میں ہے مل جل کر اور کامل احساس یگانگت کے ساتھ رہیں اکثریت اور اقلیت کے تفرقہ و امتیاز کے احساس سے ایک میں جو احساس برتری اور دوسرے میں جو احساس کمتری پیدا ہوتا ہے اس کو مٹا دیا جائے کیونکہ جیسا کہ نفسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ زندگی میں خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی یہی دو قسم کے احساس ہیں جو بعض اوقات بڑی بڑی بربادیوں اور تباہ کاریوں کا سبب بنجاتے ہیں ہر ایک شخص میں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے اور اسے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اس معاملہ میں دوسرے سے سبقت لیجائے۔

احساس کمتری و برتری کے ذکر پر یاد آیا۔ بنگال کے مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر سی۔ آر داس۔ اور ہندوستان کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے اپنے برابر کرنے کی کوشش کریں اپنے روپیہ سے مسلمانوں کے لئے فیکٹریاں، مل اور کارخانے کھولیں۔ تاکہ اُن کی مالی حالت بہتر ہو اپنے روپیہ سے مسلمان نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجیں اور اس طرح اُن کا تعلیمی معیار اونچا کریں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی

پیدا ہو جائیگی اور وہ احساس کمتری کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے ورنہ اگر ایسا نہیں ہوا اور ہندو مسلمانوں میں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے وہی فرق قایم رہا جواب ہے۔ تو اندلیشہ ہے کہ کل جب ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں حکومت کے اختیارات منتقل ہونے شروع ہوں گے تو چونکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمانوں کی بہ نسبت ان کی تعلیمی اور اقتصادی حالت بھی کہیں زیادہ بہتر ہے اس بنا پر مسلمانوں میں قدرتی طور پر احساس پسماندگی اور شعور کمتری پیدا ہوگا۔ اور ادھر ہندو اپنے آپ کو مسلمانوں سے برتر سمجھنے لگیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں میں کشیدگی اور کشمکش پیدا ہو جائے گی اور اس کا انجام کسی کے لئے بھی اچھا نہیں ہوگا!" غور فرمایئے۔ ان دونوں محترم زعمائے ہند نے یہ بات اس وقت کہی تھی جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے اور دونوں دوش بدوش استبداد و استعمار کی طاقتوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھے اور کیسی بادن تولہ پاؤ رتی بات کہی تھی۔

اچاریہ کرپلانی ایسے لیڈروں کو اس قسم کے بیانات دیتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت کے زمانہ میں جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں شیر و شکر تھے تو مسلمانوں کا یہ رویہ جمعیۃ علماء ہند کی قیادت و زعامت کا ہی نتیجہ تھا گذشتہ دس برسوں میں مسلمانوں کی اکثریت نے بیشک اس کی بات نہیں مانی لیکن یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ۱۵ اگست کے بعد مسلمان دشمنی کی وجہ سے ہندوؤں کی اکثریت کانگریس سے اور خصوصاً گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے انتہا درجہ متنفر ہو گئی اور اس کا نتیجہ آخر کار گاندھی جی کی انتہائی المناک اور مظلومانہ موت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ لیکن جس طرح گاندھی جی کے واقعہ روح فرسا نے ہندوؤں کی آنکھیں کھولیں اور ان کے بڑے سے بڑے دشمن بھی ان کی عظمت کے آگے جھک گئے ٹھیک اسی طرح ہند کی تقسیم کے المناک نتائج اور مسلم لیگی سیاست کی فریب کاریوں کا پردہ چاک ہو جانے کے بعد جو

مسلمان پہلے لیگ کے ہم نوا تھے اب اُن کی اکثریت نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور یہ مان لیا ہے کہ اُن کے حقیقی رہبر و قائد ارباب جمعیۃ علمأ ہند ہی ہیں اور کرپلانی صاحب پر غالباً پوشیدہ نہ ہوگا کہ یہ جمعیۃ علمأ ہند ہے کون ؟ یہ وہی جمعیۃ ہے کہ کل تک جس کے ارکان محترم کو کانگریس سے حقیقی تعاون و اشتراک کرنے کی بنا پر ہندوؤں کا غلام ۔ کانگریس کا وظیفہ خوار اور ملت فروش کہا جاتا تھا! یہ وہی جمعیۃ ہے جس کے بزرگوں پر لیگی مسلمان غلاظتیں اُچھالتے تھے ۔ گالیاں دیتے تھے ۔ اور جن کا باہر چلنا پھرنا تک ان لوگوں نے دوبھر کر دیا تھا یہ وہی جمعیۃ ہے جس کی وطن دوستی کا یہ عالم ہے کہ کانگریس نے لیگ کے سامنے سپر ڈال دی اور تقسیم ہند کا اصول مان لیا ۔ لیکن یہ جمعیۃ آخر وقت تک گاندھی جی کی طرح تقسیم ہند کے اصول کی سخت مخالف رہی اور اس نے اس معاملہ میں برملا کانگریس کو بھی تنبیہ کی ۔ آج اگر لیگ اور کانگرس انصاف اور دیانت کے ساتھ اعتناء کریں تو حق یہ ہے کہ دونوں کو شرمانا چاہیئے کہ ایک نے تقسیم ہند کے مطالبہ پر ضد کر کے اور دوسرے نے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے ملک کو برباد کرایا اور اسے جہنم کدہ بنا دیا ۔ اس سلسلہ میں جمعیۃ علمأ ہند ہی صرف ایک ایسی وطن دوست اور قوم پرور جماعت ہے جس کا دامن اس قسم کے داغ دھبہ سے یکسر پاک و صاف ہے اور اسے کسی کے سامنے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں ہے پھر یہ وہی جمعیۃ ہے کہ ہندوستان آزاد ہوا تو مختلف جماعتوں کے یہاں تک کہ ہندو مہا سبھا کے بھی بڑے بڑے لیڈر عہدے اور وزارتیں سنبھال کر بیٹھ گئے لیکن صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے باوجود آزادی مل جانے کے بعد نہ کوئی عہدہ لیا نہ کوئی منصب قبول کیا اور نہ کبھی اس کی خواہش اور تمنا کی ۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ جمعیۃ علمأ ہند ایک کٹر مذہبی اور دینی جماعت ہے اور اس کے تمام تر معتقدات اور اعمال و افعال تعلیمات اسلام کا صحیح نمونہ اور سچی تصویر

ہیں اس بنا پر اگر یہ جماعت متحدہ قومیت کی قائل ہے اور بہانگ دہل قائل ہے تو اس کے
معنی یہ ہیں کہ اسلام اختلاف مذہب کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں قرار نہیں دیتا
بلکہ دونوں کو ایک ہی سمجھتا ہے جمعیۃ علماء کے اس فکر اور عمل کی وجہ سے برادران وطن کے
دلوں میں اسلام کی طرف سے جو بدگمانی ہے وہ دور ہو جانی چاہئے اور انہیں سمجھنا چاہئے
کہ مسلمان اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے جتنا پکا اور سچا مسلمان ہوگا اسی قدر وہ ہندوؤں
کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ مضبوط پائیگا۔

آج ہندوستان سے لیگ کا نام ونشان مٹ چکا ہے اور مسلمانوں کی عظیم اکثریت
پھر جمعیۃ علماء ہند کے علم قیادت کے نیچے جمع ہو رہی ہے اور ان کو اپنی غلط بنیادیوں اور
غلط کاریوں کا کافی احساس ویقین پیدا ہوگیا ہے پس جس طرح مسلمانوں میں کافی تبدیلی پیدا ہوچکی
ہے اسی طرح برادران وطن کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے دل بدلیں۔ گزشتہ فکر کا طریقہ بدلیں اور
اس راستہ پر مضبوطی سے چلیں جو انسانیت کے محسن اعظم گاندھی جی بتا گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ
جبر۔ اور دلخراش باتیں کہنے سے کام نہیں بنتا۔ عدم تشدد اور سچائی ہی وہ ہتھیار ہیں جن
سے دلوں کی مملکت فتح کی جا سکتی ہے اور بڑے سے بڑے دشمن کو بھی دوست بنایا جا
سکتا ہے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے مذہبی رجحانات[1]

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے - ایل ایل بی -
استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلطان علاؤ الدین خلجی کا عہد حکومت، اسلامی ہند کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کا سب سے زیادہ تابناک باب ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اور روحانی دونوں نظام، مشکلات ومصائب کے ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد، اپنے پورے شباب پر پہونچ گئے تھے - ایلتمش اور بلبن نے جس عمارت کی بنیادیں رکھی تھیں اس کو علاؤ الدین نے اپنے تدبّر اور صلاحیت جہانبانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا - مسلمانوں کا سیاسی اقتدار شمالی ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی طاقت نے تسلیم کر لیا تھا اور سارا جنوبی ہندوستان سلطان کی جہانکشایانہ ہمت کا بازیچہ بن گیا تھا - سلطنت کی بنیادیں مستحکم اور استوار ہو چکی تھیں - روحانی دنیا میں جس چراغ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر اجودھنی نے باد مخالف کے تیز وتند جھونکوں کے درمیان روشن کیا تھا، اس وقت نہایت آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا - حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ سے حقیقت ومعرفت کے چشمے ابل رہے تھے - محلات شاہی میں اگر مسلمانوں کے جاہ وجلال، شان وشوکت کے نظارے دکھائی دیتے تھے تو غیاث

---

[1] میں اپنے استاذ محترم پروفیسر شیخ عبد الرشید صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مضمون کو ملاحظہ فرمایا، اور اہم اصلاحیں اور مفید اضافے کئے -

پورمیں وہ "شاہنشہ بے سرپرِ بے تاج"[۱] جلوہ افروز تھا جس کے جمال جہاں آرا نے دہلی کو بقول برنی "رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ، موازی بیت المقدس"[۲] بنا دیا تھا۔ امیر خسروؒ کے یہ قصیدے فضاؤں میں گونج رہے تھے ؎

خوشا ہندوستاں در رونق دیں
شریعت را کمال عِزّ و تمکیں
زعلم باعمل دہلی بخارا
زشاہاں گشتہ اسلام آشکارا
مسلمانانِ نعمانی روش خاص
زدل ہر چار آئیں را باخلاص
نہ کیں با شافعی نے مہر بازید
جماعت را و سنّت را بجاں صید[۳]

ایک طرف "فقر" تھا دوسری طرف "شاہی" ــــــ دونوں عوام کے اخلاق وعادات درست کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ سلطان نے "قہر و تعزیر"[۴] سے عوام کے اخلاق درست کئے تو

---

[۱] امیر خسرو کا شعر ہے ؎

شاہنشہ بے سرپرِ بے تاج + شاہانش بخاک پائے محتاج

(دیلیٰ مجنوں)

[۲] "تاریخ فیروز شاہی" ــــــ از برنی۔ ص ۴۱ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی)

[۳] مثنوی دولرانی (مطبوعہ علی گڑھ) ص - ۴۶ - ۴۷

[۴] برنی نے علاء الدین کے متعلق لکھا ہے ــــــ

"از معاملات درشت او در کار دین و دنیا راست ایستاد ند" ص ۳۴۹ (ایشیاٹک سوسائٹی)

شیخ نے اپنے خلوص و محبت سے عوام کی زندگی میں ایک حیرت انگیز اخلاقی انقلاب پیدا کر دیا۔ دونوں کی کوششوں کا جو نتیجہ ہوا وہ برنی کی زبان سے سنیئے ـــــــــــــــــــ

فارسی	اردو
"سبحان اللہ عجب ایامے و بو العجب	سبحان اللہ! عجیب دن اور عجیب زمانہ
روزگارے کہ در دہ سال آخر عہد	تھا جو علاؤ الدین خلجی کی حکومت کے آخری
علائی خلق را مشاہدہ افتاد کہ از طرفے	دس سال میں نظر آیا یعنی ایک طرف سلطان
سلطان علاؤ الدین از جہت صواب	نے اپنے ملک کی فلاح اور بہبودی و
و صلاح ملک خود جمیع مسکرات و	اصلاح کے لئے تمام نشہ آور چیزیں۔
مناہی و اسباب فسق و فجور بہ قہر و غلبہ	ممنوعات اور فسق و فجور کے تمام اسباب
و تعزیر و تشدید و بند و زنجیر منع می	ان سب کو جبر و قہر اور تشدد اور سخت
کرد .... و از طرف دیگر	گیری کے ذریعہ روک دیا تھا اور دوسری
ہمدر آں ایام شیخ الاسلام نظام الدین	طرف انہیں دنوں میں شیخ الاسلام نظام الدین
در بیعت عام کشادہ بود و گناہگاراں	اولیاء نے عام بیعت کا دروازہ کھول رکھا
را خرقہ و توبہ می داد و بارادہ خود قبول	تھا گنہگاروں کو خرقہ و توبہ عطا فرماتے اور
می کرد و خاص و عام و غنی و مفلس	اور خود اپنے ارادہ سے قبول کرتے تھے۔
و ملک و متعلم و جاہل و شریف و سوقیا	اور ہر شخص کو خواہ خاص ہو یا عام مالدار ہو
و مصری و روستائی و غازی و مجاہد	یا غریب۔ بادشاہ ہو یا متعلم، جاہل ہو یا
و احرار و عبید طاقیہ و توبہ و مسواک	شریف۔ بازاری ہو یا شہری ہو یا گنوار
پاکی می فرمود و جماہیر طوائف مذکور	ہو یا غازی۔ اور مجاہد ہو۔ آزاد ہو یا غلام
از آنکہ خود را مرید خدمت شیخ می دانستند	ہر ایک کو توبہ اور پاکی کی مسواک دیتے تھے۔

واگر کسے را از ورامدگان در شیخ
لغزشے افتادے باز بہ تجدید بیعت کردے
و خرقہ توبہ ستدی و شرم مریدی شیخ
خلق را از بسیاری منکرات ہمرآو
علانیہ مانع می شد و خلق عامہ تقلیداً
واعتقاداً در طاعت و عبادت
رغبت نمودہ بودند.......
... و در دلہائے خواص و عوام نیکی
و نیکوکاری گرائیدہ و حاشا و کلا در
چند آخر عہد علائی نام شراب و شاہد
و فسق و فجور و قمار و فحش و لواطت
و بچہ بازی بر زبان اکثر مردماں گذشتہ
باشد"[1]

اور سب لوگ چونکہ اپنے آپ کو حضرت
کا مرید اور خدمت گذار سمجھتے تھے۔ اس
لئے بہت سی ناکردنی باتوں سے پرہیز کرتی
تھے۔ اگر حضرت کے یہاں آنے والوں میں سے
کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو وہ پھر
بیعت کی تجدید کر کے توبہ کی خرقہ لے لیتا
تھا۔ اور حضرت سے مرید ہونے کی شرم
بہت سے لوگوں کو کھلم کھلا یا چھپے چوری
بہت سے منکرات کے ارتکاب سے بچاتی
تھی اور خلق خدا عام طور پر تقلیداً اور اعتقاداً
طاعت اور عبادت کی طرف رغبت رکھتی
تھی۔ خواص اور عوام کے دلوں میں نیکی اور
نکوکاری نے جگہ پکڑ لی تھی۔ حاشا و کلا جو
علاؤالدین کے عہد کے آخری چند برسوں میں
کہیں شراب و شاہد۔ فسق و فجور۔ قمار۔ فحش
لواطت۔ بچہ بازی وغیرہ کا نام بھی لوگوں
کی زبان پر گذرا ہو۔

ہر علم کے استاد اور ہر ہنر کے ماہر اس وقت دلی میں موجود تھے۔ برنی نے اس زمانہ کے مشائخ، علماً

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۴ - ۳۴۶

سادات، واعظین، ماہرات فن قرأت، ندما، مورخین، اطبار، منجمین، سرود گویوں اور شعرار کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے - اور بعد کو بے اختیار زبان سے نکل گیا ہے ؎

" چند چیزاز عجائب روزگار با معائنہ	چند چیزیں عجائب روزگار کی ایسی دیکھنے
و مشاہدہ می شد کہ آں چناں در ہیچ	میں آئی ہیں جو کسی عہد اور کسی زمانہ میں
عہدے و عصرے دیگر مشاہدہ نہ	دیکھنے میں نہیں آئیں - اور نہ شاید کبھی
شد و شاید کہ معائنہ ہم نہ شود"[1]	دیکھی جا سکیں -

اسلامی ہند کے اس تابناک دور میں حکمرانی کرنے والے سلطان، علاؤالدین خلجی کے مذہبی معتقدات ورجحانات کو مورخوں نے نہایت غلط سمجھا ہے اور یہ غلط فہمی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ ہندوستان کی ہر تاریخ میں علاؤالدین خلجی کی مذہب سے بے تعلقی کی داستان ملتی ہے - اس مضمون میں ہم اس کے مذہبی افکار، رجحانات واعمال کو سمجھنے کی کوشش کریں گے -

غلط فہمی کے اسباب | سلطان علاؤالدین خلجی کی مذہب سے بے اعتنائی کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہوئی ہیں وہ سب ضیاءالدین برنی کے بیانات کا نتیجہ ہیں - زمانۂ حال کے مورخوں نے اس سلسلہ میں دو زبردست غلطیاں کی ہیں - اور ان ہی کی وجہ سے وہ سلطان کے معتقدات ورجحانات کے متعلق صحیح رائے قایم نہیں کر سکے - اوّل تو یہ کہ انھوں نے علاؤالدین خلجی کے متعلق برنی کے خیالات پر غور کرنے سے قبل خود برنی کے رجحانات، مذہبی معتقدات، ونظریات پر غور نہیں کیا - جب تک برنی کے مذہبی ذہن وشعور، سیاسی تصورات، پایانِ عمر کی تلخیوں اور ان سے پیدا شدہ اثرات کو ذہن میں نہ رکھا جائے برنی کو سمجھنا بہت مشکل ہے - پروفیسر شیخ عبدالرشید شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ہسٹری کانگریس (پٹنہ) کے خطبہ صدارت میں کہا تھا ————

---

[1] تاریخ فیروز شاہی - ص ۳۴۹

"تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی کو اب تک جس توجہ سے پڑھا گیا ہے۔
یہ کتاب اُس سے زیادہ توجہ اور مفصل مطالعہ کی مستحق ہے۔ اس عہد پر شاید ہی
کوئی ایسی کتاب ہو جو آپ کے لئے اس سے زیادہ دلکشی کا باعث ہو۔ جس قدر
آپ اس کو پڑھتے جائیں گے اسی قدر اپنے آپ کو مصنف سے زیادہ قریب
محسوس کرتے جائیں گے۔ مصنف اپنے رجحانات اور اپنا نقطۂ نظر بلا کسی خوف تردید
کے بیان کرتا اور معمولی انسانی کمزوریاں اور خوبیاں دونوں کو نمایاں کرتا ہے وہ اپنے
عہد کی ایک خصوصیت کو زیادہ نمایاں کرتا ہے یعنی یہ کہ قانون کے ساتھ ساتھ
اور کبھی قانون سے بھی زیادہ منفعت پر زور دیتا ہے"

دوسری غلطی جو زمانۂ حال کے مورخوں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ علاء الدین خلجی کے متعلق برنی
نے جو کچھ اور جس انداز میں کہا ہے اس "بہ مجموعی" حیثیت سے غور نہیں کیا۔ بعض مورخین نے تو پہلے
سے قایم کئے ہوئے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے برنی کے جملے سیاق و سباق سے علیحدہ
کر کر بیان کئے ہیں اور اس طرح نہ صرف ایک زبردست غلط فہمی پھیل گئی ہے بلکہ خود برنی کا مافی الضمیر
بھی غلط سمجھا گیا ہے۔

برنی کے متعلق بعض باتیں یاد رکھنے کی ہیں کیونکہ ان کے بغیر اس کو صحیح طرح سے نہیں سمجھا
جا سکتا۔

(۱) برنی ایک مذہبی آدمی تھا۔ اور بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
"قانونی معقولیت کے متعلق برنی کے خیالات بڑے سخت تھے"[ا]

"لوازم امور بادشاہی" کے متعلق اس کے اپنے مخصوص نظریات تھے۔ ان نظریات کا اندازہ

[ا] "Administration of the Sultanate of Delhi" p. 44.

اس کی کتاب "فتاوائے جہانداری" سے ہوتا ہے۔ ان ہی نظریات کے ماتحت وہ ہر سلطان کو دیکھتا ہے۔ جو اس معیار پر پورا نہیں اُترتا وہ اس کی نظر میں مذہبی اعتبار سے گر جاتا ہے۔

(۲) برنی نے اپنی کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد میں لکھی تھی۔ فیروز بے حد پابند شرع اور متدین بادشاہ تھا، علماء و مشائخ سے سلطنت کے معاملات میں مشورہ کرتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ جب برنی فیروز کے اس احترام اور پابندی شرع کو دیکھتا ہے اور پھر گذشتہ سلاطین کے حالات پر غور کرتا ہے تو مذہبی حیثیت سے ان کے نقوش ماند پڑنے لگتے ہیں اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے ــــ

"ازاں روز کہ دہلی فتح شدہ است و	جب سے دہلی فتح ہوئی اور اسلام ہندوستان
اسلام در ہندوستان ظاہر گشتہ بعد	میں ظاہر ہوا ہے سلطان معز الدین محمد سام
از سلطان معز الدین محمد سام بادشاہے	کے بعد سے اب تک فیروز شاہ سلطان سے
حلیم تر و شرمگیں تر و مشفق و مہربان	زیادہ کوئی بادشاہ بردبار۔ شرمیلا مشفق
و حق شناس و وفادار تر و در اسلام	مہربان ۔ حق شناس ۔ اور وفادار ۔ اور
و مسلمانی پاکیزہ اعتقاد تر از سلطان	اسلام اور مسلمانی میں پاکیزہ اعتقاد دہلی
عہد و زمان فیروز شاہ السلطان پائے	کے تخت پر نہیں بیٹھا ۔
بر تخت گاہ دہلی ننہادہ است"[۱]	

پھر ایک جگہ پکارتا ہے

"من ہیچ سلطان العہد . . . . در اعطاء	میں نے مسلمانوں کے حقوق کی مراعات اور
حقوق مسلمانان و اتیار احکام شرع	احکام شرع محمدی کی تعمیل کے لحاظ سے سلطان
محمدی بادشاہے دیگر ندیدہ ام"[۲]	وقت (فیروز شاہ) جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا!

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ۔ ص ۵۸۵

اس "تقابل" اور "موازنہ" نے اس کے ذہن پر بڑا اثر کیا ہے۔ برنی کا مطالعہ کرتے وقت اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

برنی کے ذہن میں بعض سماجی تعصبات بھی کام کر رہے ہیں وہ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب خاندانی نجابت و اصالت پر بڑا فخر کیا جاتا تھا۔ التمش اور بلبن نے اپنے تخت و تاج کے گرد صرف اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو جمع کیا تھا۔ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق نے ذات و نسل کے یہ سب امتیازات اٹھا دیئے۔ ان دونوں کی نظر میں "ذاتی قابلیت" سب سے بڑا معیار تھی۔ بر خلاف اس کے برنی کا عقیدہ تھا کہ حکومت کا کام صرف اعلیٰ خاندانوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اسی بنا پر اس کو علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق سے ایک بنیادی اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے برنی پر اپنے فاضلانہ مقالہ میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے ۔

> "برنی کے صفحات میں جگہ جگہ ان لوگوں کے خلاف جنھوں نے اس سماجی توازن کو ابتر کر دیا تھا ایک ذاتی ناراضگی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے" [۱]

برنی کے ان بنیادی تصورات اور رجحانات کو ذہن میں رکھ کر جب اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہم اپنے آپ کو مصنف سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں اور اس کے ذہنی محرکات کو سمجھنے کے بعد ہم کو بہت سے نظریات میں تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔

برنی کے علاوہ کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے علاء الدین خلجی کی مذہب سے بے اعتنائی کا شکوہ نہیں کیا۔ بلکہ امیر خسرو، امیر حسن، عصامی اور وصاف نے اس کی "دین پروری" "دین داری" اور "پاس شریعت" کی تعریف کی ہے۔

مذہبی نفسیات | مورخوں کے بیانات سے کچھ دیر کے لئے قطع نظر کرکے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سلطان

---

[۱] Zia ud din Barni: A Study, p. 23.

کے مذہبی ذہن وشعور کا مطالعہ کریں اور نفسیاتی اعتبار سے اس کے ذہنی محرکات کو سمجھنے کی کوشش کریں

سلطان علاؤالدین خلجی کی مذہبی نفسیات بے حد آسان ہے۔ اس کے افکار و اعمال میں حیرت انگیز مطابقت ہے۔ جہالت کے جہاں بہت سے عیوب اس کے اندر ہیں۔ وہاں ایک زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو کسی مصلحت کے پیش نظر بناوٹی طور پر پیش نہیں کرتا۔ جو دماغ میں گزرتا ہے وہ اسی انداز میں زبان اور عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس دماغ اور زبان کی ہم آہنگی نے اس کی مذہبی کیفیات کا مطالعہ بہت آسان کر دیا ہے۔ بیرونی محرکات اور حالات گرد و پیش جس طرح سے اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح سے اس کے اعمال ڈھلتے چلے جاتے ہیں

نیا مذہب جاری کرنے کا ارادہ | سلطان علاءالدین کے عہد کے ابتدائی زمانہ کا سب سے زیادہ مشہور اور اہم واقعہ ایک نئے مذہب کے اجرا کا ارادہ ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ جب علاءالدین خلجی کی فوجیں فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتی ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئیں، جب دولت کی ہر چہار طرف سے فراوانی ہوئی جب سلطان کے اقتدار کا سکہ جم گیا، تو دولت و قوت کے اس نشہ نے اس کے دماغی توازن کو خراب کر دیا۔ اور اس نے ایک نیا مذہب جاری کرنیکا ارادہ کیا[1]۔ یہ خیال علاؤالدین کے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ اس کا جواب ہمیں اس کی نفسیات میں تلاش کرنا چاہئے۔ سلطان علاؤالدین Power - politics (سیاسی قوت) میں اعتقاد رکھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد طاقت ور بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی کوشش تھی کہ اپنی رعایا کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو جائے۔ اس کا احاطۂ اختیار انسانی کردار کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت پیدا کر لے[2]۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۶۲ - ۲۶۱ [2] برنی نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ———
"در آں کین دایں کن دآں بگو دایں مگو، دایں بپوش دآں مپوش، دآں بخور دایں مخور، وہمیں فروش وآنچناں مفروش، وہمچو باش وآنچناں مباش"، تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۸۳

سیاسی اعتبار سے اس نے ملک میں انتہائی درجہ حاصل کرلیا تھا۔ لیکن وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا تسلط ابھی انسانی زندگانی پر مکمل نہیں۔ اور وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مذہب بھی اس کے ظل حمایت میں پرورش پانے لگے۔ چنانچہ اقتدار، عظمت اور شہرت کی اس ہوس نے[1] اس کو ایک نئے مذہب کے جاری کرنے کی تدبیر سجھادی۔ وہ خود پڑھا لکھا انسان نہیں تھا اس لئے اس خیال کے ہر پہلو پر بالغ نظری کے ساتھ تاریخی تجربات کی روشنی میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ جس شخص کی زندگی میدان کارزار میں گذری ہو وہ کسی چیز کو ناممکن العمل کیوں سمجھنے لگا تھا۔؟ تیغ وتفنگ پر بھروسہ کرنے والے انسان اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے کہ طاقت کے زور سے انسان کے جسم کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے افکار وخیالات پر قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگوں کے معتقدات پر قبضہ کرنا بھی اسی قدر آسان تصور کر رہا تھا جتنا ارض ہند پر قبضہ کرنے کو اس نے سہل سمجھا تھا۔ دل میں خیال آیا اور معاً یہ سمجھ بیٹھا کہ اس میں اس کو کامیابی ہو گی

برنی نے لکھا ہے کہ سلطان اکثر اپنی شراب کی مجلسوں میں اس ارادہ کا ذکر کیا کرتا تھا۔[2]
بعض مورخوں کا خیال ہے کہ مذہب کے جاری کرنے کے متعلق اس کے خیالات محض سطحی تھے۔[3] وہ محض شراب کے نشہ میں اس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا جبکہ حقیقت میں وہ کسی مذہب کے جاری کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ سلطان اپنے اس ارادہ کے متعلق مجالس شراب کے علاوہ بھی مشورہ کیا کرتا تھا۔ برنی لکھتا ہے ــــــــــ

---

[1] برنی لکھتا ہے ــــــــــ
"از حاضراں میپرسیدی کہ چگونہ چیز ہا پیدا باید آورد تا نام من دامن قیامت گیرد" تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳ - ۲۶۲
[3]

"در مجلس شراب بگفتے - دو ر پیدا آوردن دین و مذہب علیحدہ با ملوک مجلس مشورت کردے واز حاضراں بپرسیدے کہ چگونہ چیزہا پیدا باید آورد تانام من وامن قیامت گیرد"[1]

مجلس شراب میں کہتا اور دین و مذہب کی ایجاد کے بارہ میں امرا کے ساتھ مشورے کرتا اور حاضرین سے پوچھتا کہ کس طرح ایسی چیزیں ظاہر کرنی چاہئیں جن سے میرا نام قیامت تک رہے۔

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ سلطان کے یہ خیالات اس کے مخصوص مصاحبوں تک محدود رہے[2] لیکن یہ صحیح نہیں۔ برنی نے بتایا ہے کہ سلطان کے اس ارادے کی خبر جب عوام کو ہوئی تو اُن میں ایک اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔ مسلم سوسائٹی کے مختلف حلقوں میں مختلف قسم کے اثرات پیدا ہوئے۔ "بزرگان شہر" اس کی بیوقوفی پر ہنس دے۔ "دانایان شہر" کو خطرات محسوس ہوئے غرض ہر طبقہ نے اپنی فکر و ہمت کے مطابق حالات کا جائزہ لیا۔ لکھا ہے ——

"بعضے بزرگان شہر بخندیدندے در جہل و حمق او حمل کردندے و بعضے دانایان بترسیدندے و بایک دیگر بگفتندے کہ این مرد فرعون صفت است و عقل و خبرے ندارد و گنج ہائے بسیار کہ دیدہ حکمارا کور کند تا بدیدہ بے خبراں و غافلاں چہ رسد"

شہر کے بعض بزرگ ہنستے اور بادشاہ کی حماقت و جہالت پر اس کو محمول کرتے تھے اور بعض عقلمند ڈرتے اور آپس میں کہتے تھے کہ یہ شخص فرعون صفت ہے اور عقل و واقفیت رکھتا نہیں ہے اور بہتری خزانوں کا مالک ہے جو حکما کو بھی اندھا کر سکتے ہیں پھر بے خبر اور غافل لوگوں کا تو کہنا ہی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی - ص ۲۶۳

[2] Administration of the Sultanate of Delhi, p. 45.

بدست این بے خبر افتادہ است کہ
اگر شیطان راہ ورد نشے کثیر بر خلاف
دین در دل او القا کند و این مرد در
تلقین کردن آں بے راہے آدمی
شصت و ہفتاد ہزار بکشد حال
مسلماناں و مسلمانی چہ باشد و چہ شود[1]

کیا ہے۔ اگر شیطان نے دین کے خلاف
کوئی راہ وروش اسے بتادی اور اس
نے اس کی تلقین کرنے میں ساٹھ ستر
ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا تو پھر مسلمانوں
اور مسلمانی کا کیا حال ہوگا!

فرشتہ کا بیان ہے کہ جب حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اور دیگر بزرگان دہلی کو سلطان کے اس ارادہ کی خبر ہوئی تو وہ آزردہ خاطر ہوئے اور اُن کو تشویش پیدا ہو گئی۔ لکھا ہے ـــــ

"از شنیدن این خرافات آزردہ
خاطر شدہ دعا می کردند کہ او از وسواس
شیطانی بر آمدہ بر جادۂ مستقیم
شریعت مصطفوی ثابت و راسخ گردد[2]

اس خرافات کے سننے سے آزردہ خاطر
ہوئے اور دعا فرماتے تھے کہ وہ وسواس
شیطانی سے نجات پاکر شریعت مصطفوی
کی جادۂ مستقیم پر قائم و ثابت رہے!

اگر سلطان کے خیالات محض سطحی ہوتے تو اُن کی اتنی اہمیت نہ ہوتی اور شہر کے علماء و مشائخ اس قدر آزردہ خاطر نہ ہوتے۔

سلطان نے اس ارادہ کا ذکر جب علاء الملک کوتوال دہلی سے کیا تو اُس نے علاء الدین کو اُن حقائق سے آشنا کر دیا جن پر اس کے سپاہیانہ دماغ نے اب تک پردہ ڈالے رکھا تھا۔ علاء الملک نے نہایت صفائی سے کہا۔

"خداوند عالم سخن دین و شریعت و

خداوند عالم! دین و شریعت اور مذہب

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۶۴ [2] تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۵ (فارسی) نول کشور

مذہب اصلا والبتہ بہ زبان نباید آورد
کہ این کار انبیار است نہ پیشہ بادشاہان[1]

کی باتوں کو ہرگز زبان پر نہیں لانا چاہئے
کیونکہ یہ پیغمبروں کا کام ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔

اس کے بعد علاء الملک نے سلطان کی اس مسئلہ میں بنیادی غلطی اور عملی دشواریوں کی وضاحت اس طرح کی ——

"دین و شریعت بہ وحی آسمانی تعلق
دارد برائے و تدبیر بشری ہرگز دین و
شریعت بنا نشود و از گاہ آدم تا امروز
دین و شریعت از انبیار و رسل پیدا
آمدہ است و جہانداری و جہانبانی
بادشاہاں کردہ اند و تا جہاں بودہ
و ہست و خواہد بود۔ نبوت بادشاہی
نکردہ اند فاما بعضے پیغمبراں بادشاہی
کردہ اند و التماس بندۂ درگاہ آنست
کہ بعد ازیں سخن بنائے دین و شریعت
و مذہب انچہ خاصہ پیغمبران آنست
و با پیغمبرے ما مہر شدہ است در
مجلس شراب و غیر شراب از زبان
بادشاہ بیروں نیاید و اگر ازیں بابت

دین اور شریعت کا تعلق وحی آسمانی سے
ہے اور انسانی تدبیر و رائے سے ہرگز دین
اور شریعت کی بنا نہیں ہوتی ہے۔ آدم
سے لیکر اب تک دین اور شریعت پیغمبروں
اور رسولوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جب
سے کہ دنیا ہے اور جب تک کہ رہیگی
پیغمبری بادشاہوں نے نہیں کی ہے
البتہ ہاں بعض پیغمبر بادشاہ ضرور ہوئے
ہیں مجھ بندۂ درگاہ کی التماس یہ ہے کہ
اب آئندہ دین و شریعت اور مذہب
کے بنانے کی بات چیت جو کہ انبیائے کرام
کا خاصہ ہے اور جو ہمارے پیغمبر پر ختم
ہو چکی ہے مجلس شراب و غیر شراب
میں بادشاہ کی زبان پر نہ آئے۔ اگر یہ

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۶۵

کلمات کہ بادشاہے خواہد کہ دینے دلجے	باتیں خواص و عوام کے کانوں تک پہونچیں
علیحدہ بنا کند در گوش خواص و عوام مردم	تو تمام لوگ بادشاہ سے منحرف ہوجائینگے
افتد ہر ہمہ خلق از بادشاہ بگردند دیک	اور ہر طرف سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا اور
مسلمان نزدیک بادشاہ نیاید و از ہر	ایک مسلمان بھی بادشاہ کے پاس نہ آئیگا
طرف فتنہ و سیع خیزد۔"[1]	

علاء الملک کے اس جواب نے سلطان کو خواب سے چونکا دیا وہ چاہتا تھا کہ ایک نئے مذہب کو جاری کرکے اپنی رعایا کی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہو جاوے۔ علاء الملک نے جب یہ بتایا کہ اس سے ملک میں ایسا فتنہ و فساد برپا ہو جاویگا۔ کہ" برائے صد بزرجمہر فرونہ نشیند"[2] تو سلطان کو ہوش آگیا اور اس نے اپنے ارادہ سے توبہ کی۔ علاء الملک کی صاف گوئی اور حقیقت بیانی سے علاء الدین بہت متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا ——

"من ایں ساعت فکر کردم کہ ہمچنیں	میں نے اب سوچا کہ تو جیسا کہتا ہے ویسا
است کہ تو میگوئی۔ مرا ایں سخنان نمی باید	ہی ہے مجھ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں
گفت و بعد از یں گاہے در ہیچ مجلس کسے	اور اب کسی مجلس میں کوئی شخص مجھ سے
ایں چنیں سخنان از من نشنود و صد رحمت	ایسی باتیں نہیں سنے گا۔ تیرے اوپر اور
بر تو باد و بر مادر و پدر تو کہ بر روئے من	تیرے ماں باپ پر صد رحمت کہ تو نے مجھ
راست گفتی"[3]	سے حق بات کہی۔

مسلمان امراء اور مشائخ کو علاء الملک کے اس جواب اور جذبہ کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اُسے دعائے خیر دی۔[4]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۶۷ - ۲۶۵ [2] ایضاً ص - ۲۶۶ [3] ایضاً ص ۲۶۷ [4] فرشتہ جلد اوّل صفحہ

علاؤالدین کا یہ ارادہ اپنی رعایا کی زندگی کے ہر گوشہ پر مکمل تسلط حاصل کرنے کی خواہش سے پیدا ہوا تھا۔ علاء الملک کی بے لاگ تنقید نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے اس ارادہ کو اس طرح ترک کر دیا کہ گویا کبھی اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

مذہبی علم و معلومات | سلطان علاؤالدین جاہل محض تھا۔ اس نے لکھا پڑھا مطلقاً نہ تھا اس لئے اس کی مذہبی معلومات کا سرمایہ صرف اسی قدر تھا جتنا وراثت میں مل سکتا تھا۔ چنانچہ خود کہتا ہے

"من کہ جاہلم و ناخوانده و نانویسنده ام	میں جاہل ہوں۔ لکھا پڑھا نہیں ہوں سوائے
جز الحمد و قل ہو اللہ و دعائے قنوت و	الحمد اور قل ہو اللہ اور دعائے قنوت اور
التحیات چیزے دیگر خواندن نمی دانم"[1]	التحیات کے کچھ اور پڑھنا نہیں جانتا۔

لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ مذہب سے بھی بے بہرہ تھا۔ خود کہتا ہے۔

"من اگرچہ علمے و کتابے نخوانده ام	میں نے اگرچہ علم اور کتاب نہیں پڑھی ہے
اما از چندیں پشت مسلمان و مسلمان	لیکن کتنی ہی پشتوں سے مسلمان ہوں اور
زاده ام"[2]	مسلمان زادہ ہوں۔

پشتوں کی مسلمانی جس قدر مذہبی معلومات کا سرمایہ اس کو پہنچا سکتی تھی وہ اس کے پاس محفوظ تھا اور وہ اس پر مکمل اعتقاد رکھتا تھا۔ فلاسفہ اور بد اعتقاد لوگوں کی صحبت اُسے اپنی زندگی میں کبھی نہ ملی تھی۔ اور اس لئے اس کی جہالت سے کسی کو فائدہ اُٹھانے کا موقع بھی نہ ملا تھا وہ اپنے تقلیدی مذہب پر قانع تھا۔ برنی لکھتا ہے۔

"در اسلام اعتقاد تقلیدی بر طرفے	اسلام میں اعتقاد تقلیدی رکھتا تھا
آمیاں راسخ داشت و سخنے بدمذہباں[1]	اور بدمذہب اور بددینوں کا سا کلام نہ

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۶ [2] ایضاً ص ۔ ۲۹۵

"وکلام بد دیناں نگفتے و نشنیدے و نہ دانستے" [1]
کہتا اور نہ سنتا تھا۔ اور نہ جانتا تھا

برنی نے ایک جگہ شکایت کی ہے کہ

"از علم خبر نداشت و بعلماء ہم نشست و خاست نکردہ بود" [2]
علم سے واقفیت نہیں رکھتا۔ اور نہ علماء کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔

پھر دوسری جگہ اسی شکایت کو دوہرا کر لکھا ہے۔

"در امورِ جہانداری خود مسئلہ و روایتے نپرسیدے" [3]
اپنے امور جہانداری میں نہ کسی سے سوال کرتا اور نہ کوئی روایت پوچھتا تھا۔

لیکن تاریخی واقعات برنی کے اس بیان کی تائید نہیں کرتے، بلکہ خود اس کے صفحات سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علاؤ الدین علم سے بے بہرہ تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس نے کبھی کسی معاملہ میں شرعی نقطۂ خیال کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ برنی نے قاضی مغیث سے گفتگو کا حال خود لکھا ہے۔ دہلی کے سلطان کی سیاسی زندگی میں ان مسائل سے زیادہ اہم مسائل کا تصور ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان کی ہمہ گیر نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نہایت ہی اہم بنیادی معاملات پر اسلامی نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہتا تھا مذہب سے بے اعتنائی اور بے تعلقی کی صورت میں اس قسم کے استفسارات کا کوئی موقع نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے وہ[4] اس قدر بے تعلق نہ تھا جتنا کہ مورخوں نے دور لیجا کر کھڑا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر ایشور ٹوپ کا یہ خیال کہ وہ مذہب سے بالکل بیگانہ تھا یا اس کا دماغ اسلامی تعلیمات

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۳ [2] ایضاً ص ۲۶۲ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۹۔

[4] Politics in Pre-Moghal Times, By Dr. I. Topa.

سے یکسر خالی تھا۔ تاریخی شواہد کے قطعاً خلاف ہے۔

قاضی مغیث سے گفتگو | قاضی مغیث سے سلطان علاؤالدین کی مسائل شرعی پر گفتگو کئی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اس سے سلطان کے مذہبی رجحانات احساسات و افکار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اکثر تاریخ نویسوں نے علاء الدین کے متعلق اپنے خیالات کی تائید میں اس گفتگو کے جملے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے نقل کئے ہیں اور اس طرح سے ان کا مفہوم اکثر جگہ بر عکس سمجھا گیا ہے۔

ایک دن سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث سے کہا کہ میں آج تجھ سے کچھ مسائل پوچھنا چاہتا ہوں۔ جو بات سچ ہو وہ مجھ سے کہنا۔ قاضی مغیث نے عرض کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ سلطان نے پوچھا۔ تجھے کس طرح سے یہ خیال پیدا ہوا۔ قاضی نے عرض کیا کہ خداوند مجھ سے مسائل دینی دریافت فرمائینگے میں حق بات کہوں گا۔ خداوند عالم کو اس پر ناراضگی ہوگی آخر کار مجھے مروا ڈالیں گے" علاء الدین نے اس پر جواب دیا "من نخواہم کشت ہر چہ از تو پرسم پیش من راست و درست بگو"[1]

اس کے بعد علاء الدین نے قاضی مغیث سے چند اہم شرعی مسائل دریافت کئے مسائل یہ تھے۔

۱۔ "خراجگذار و خراجدہ در شرع چگونہ ہندوی را گویند"[1]

۲۔ "وزدے و اصابت در رشوت کارکناں و آنانکہ سیاقت قلم می کنند و از جمع می برند جائے در شریعت آمدہ است"[1]

۳۔ "ایں مالے کہ من با چنداں خونابہ دیدن در وقت ملکی از دیوگیر آوردہ ام۔ آں مال ازاں من است و یا از بیت المال مسلمانان"[1]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۰ ؁ ۲۹۰ ۔ ۲۹۲ ۔ ۲۹۳

۴- "مرا و فرزندان مرا در بیت المال چہ مقدار حق است"[1]

یہ سوالات فی نفسہ بے حد اہم ہیں۔ ان کی نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان اہم ہمہ گیر مسائل پر اسلامی نقطۂ خیال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ حقوق الذمیین۔ سزائے جرائم۔ مشاہرِ سلطان اور انتظام بیت المال ــــــــ کسی مسلمان بادشاہ کی زندگی میں ان سے زیادہ اہم مسائل نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کہ سلطان ان تمام مسائل پر شرعی زاویہ نگاہ معلوم کرنا چاہتا تھا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو شریعت کا بے حد خیال تھا۔

کچھ لوگ شاید اس موقعہ پر یہ اعتراض کریں کہ سلطان نے ان مسائل پر قاضی سے اختلاف کیا۔ اس سلسلہ میں قاضی کے جوابات کو سن کر ہی کوئی فیصلہ کرنا ممکن اور مناسب ہے۔

ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سلطان نے جو سوال کیا تھا۔ اس کا جواب قاضی نے یہ دیا۔ کہ ہندوؤں سے سختی سے محاصل وصول کرنا "لوازم دینداری" میں سے ہے۔

ساتھ ہی ساتھ قاضی مغیث نے ایک بنیادی مسئلہ اور پیش کر دیا۔ ان کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنے تک کے حق میں نہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ

"جز امام اعظم کہ ما مذہب او داریم در باب قبول کردن جزیہ از ہندواں۔
از صاحب مذہباں دیگر روایتے نیامدہ است"[2]

سلطان نے جب قاضی مغیث کا یہ بے موقع جوش اور غلط طرز استدلال دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑا اور کہا ــــــ "ازیں سخنہائے کہ تو گفتی من ہیچ نمی دانم"[3]

اس کے بعد سلطان نے خوط۔ مقدم اور دیگر ان طبقوں کی حالت پر جو سلطنت کے اقتصادی نظام میں کافی طاقت حاصل کر گئے تھے سیاسی اعتبار سے گفتگو کی اور کہا ــــ

---

[1] [2] [3] صفحات ۲۹۲ - ۲۹۰ - ۲۹۱

"اے مولائے مغیث تو مردے دانشمندی و بے تجربہا نداری۔ من خواندگی ندارم و بے تجربہا بسیار دارم" [1]

قاضی مغیث نے جو نظریہ پیش کیا تھا وہ سیاسی حالات اور مسلمانوں کی تاریخی روایات کے منافی تھا۔ محمدؒ بن قاسم نے سب سے پہلے ہندوؤں کو ذمی کے حقوق دئے تھے۔ اور ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ قاضی مغیث نے حالات گردوپیش سے آنکھ بند کر کے ایک ایسا مسئلہ پیش کر دیا جو فی نفسہ غلط ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت کے نقدان کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

قاضی نے دیوگیر کے مال کے متعلق سلطان کے استفسار کا جواب دیا ——

"آں مال کہ خداوند عالم از دیوگیر آوردہ است بہ قوت لشکر اسلام آوردہ است زبہر مالیکہ بہ قوت لشکر اسلام آرند آں مال بیت المال مسلماناں باشد، کہ اگر خداوند عالم تنہا مال از جائے حاصل کردے و آں را وجہے مباح در شرع بودے اں مال از آں خداوند عالم باشد" [2]	جو مال کہ خداوند عالم نے دیوگیر سے حاصل کیا ہے وہ لشکر اسلام کی قوت سے کیا ہے اور جو مال لشکر اسلام کی قوت سے حاصل کیا جائے وہ مسلمانوں کے بیت المال کا مال ہوتا ہے۔ ہاں اگر خداوند عالم کسی مباح طریقہ پر تنہا کوئی مال حاصل کرتے تو بیشک وہ خداوند عالم کا مال ہوتا۔

اس پر سلطان کا اعتراض یہ تھا کہ اس نے یہ سب مال اپنی "ذاتی حیثیت" میں اپنے "ذاتی نوکروں" کی مدد سے اس وقت حاصل کیا تھا جبکہ وہ محض ملک تھا۔ اس لئے یہ مال کس طرح بیت المال کی ملکیت ہو سکتا ہے؟ سلطان نے کہا ——

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص - ۲۹۱ [2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۳ - ۲۹۲

"مالیکہ من جان خود را و جان چاکران
خود را در باختہ باشم و از ہندوانیکہ نام
و نشان ایشاں در دہلی نمی دانستند در
وقت ملکی آوردہ ام و آں را در خزانہ بادشاہ
نہ رسانیدہ و در تصرف خود داشتہ
انچناں مال چگونہ بیت المال باشد"[1]

جو مال کہ میں اپنی اور اپنے نوکروں کی جان
پر کھیل کر ان ہندوؤں سے لایا ہوں جن
کا نام و نشان بھی دہلی میں نہیں جانتے تھے
اور یہ مال میں ملک ہونے کے وقت لایا
اور خزانۂ شاہی میں اس کو پہنچایا بھی نہیں
بلکہ اپنے قبضہ میں رکھا وہ مال کس طرح
بیت المال کا ہو سکتا ہے۔

چوتھے سوال کے جواب میں قاضی نے خلفائے راشدین کا وہ معیار زندگی پیش کر دیا جس کا ذکر بھی اس ماحول اور ان حالات گرد و پیش میں قطعاً بے محل تھا قاضی نے کہا :-

"اگر خداوند عالم اتباع خلفاء راشدین
کند و درجات اُخر طلبد چنانکہ خداوند عالم
اہل جہاد را دو صد و سی و چہار تنکہ تعین کردہ
است ہماں مقدار خداوند عالم را ازبرائے
نفقہ و خاصہ و حرم خود بر باید داشت و
اگر خداوند عالم میان روی را کار فرماید
و اوید انکہ بدیں مقدار کہ سایر حشم را میدہد
میسر نشود و عزت اولو الامری نماند ہماں
قدر کہ امرائے معارف درگاہ خود را چنانکہ

اگر خداوند عالم خلفائے راشدین کی پیروی
کریں اور آخرت کے درجات طلب کریں
تو جیسا کہ اہل جہاد کے لئے دو سو چونتیس
تنکہ مقرر کر دئے ہیں اتنی ہی مقدار خداوند
عالم خاص اپنے اور اپنے اہل و عیال کے
اخراجات کے لئے لے لیں۔ اور اگر
خداوند عالم میانہ روی کو اختیار کریں اور
اور یہ سمجھیں کہ اس مقدار میں جو کہ تمام ملازمین
کو دیتے ہیں گذر نہیں ہو سکتی اور بادشاہی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص - ۲۹۳

ملک قیران و ملک قیر بیگ و ملک نایب وکیلدر و ملک خاص حاجب را امید بد از بیت المال بجہت نفقہ خاصہ و حرم خود را بر باید داشت اگر خداوند عالم بر خصت روایت علمأ دنیا از بیت المال نفقہ خود و خاصہ حرم خود بردارد آں قدر بر باید داشت کہ بہ نسبت دیگر بزرگاں درگاہ بیشتر و بہتر ستانند کہ ازاں بیشتر و بہتر خداوند عالم را از دیگراں تفرد بودئے نماید و عزت اولوالامری بخواری نکشند و ہر چہ ازیں سہ طریق کہ عرض داشتم خداوند عالم از بیت المال بیشتر بردارد و لکھا و کرد رہا و زرینہ ہا و مرصع ہا اعطأ حرم کند جواب آں در قیامت باز پرسیدہ شود[1]

کی شان قایم نہیں رہ سکتی تو جتنی رقم کہ درگاہ کے بڑے بڑے لوگوں کو دی جاتی ہے ۔ اتنی ہی رقم بیت المال سے اپنے اور حرم کے اخراجات کے لئے لے لیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم علمأ نے دنیا کی روایتی اجازت و رخصت کے مطابق بیت المال سے اپنا اور اپنے حرم کا خرچ لیں تو اتنا لینا چاہئے کہ دوسرے بزرگان درگاہ کی نسبت زیادہ اور اچھا لے لیں جس کی وجہ سے آپ کو دوسروں سے امتیاز ہو جائے اور بادشاہی کی شان پر بھی دھبہ نہ آئے ۔ یہ تینوں صورتیں جو میں نے بیان کی ہیں اگر خداوند عالم نے ان سے تجاوز کر کے بیت المال سے زیادہ لے لیا اور لاکھوں ، کروڑوں ، اور سونے کی اور جڑاول چیزیں خاص حرم کو دینی شروع کر دیں تو قیامت میں ان سب کے متعلق باز پرس ہوگی ۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰ - ۲۹۳

اس جواب پر سلطان کو غصہ آگیا۔ لیکن غصہ جس بات پر آیا ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ کہتا ہے

"قاضی تو کہتا ہے کہ اتنے سالوں سے میرے حرم میں جو خرچ ہوتا ہے وہ جائز نہیں تھا"

اس جملے کے پیچھے بہت سے جذبات معلوم ہوتے ہیں کیا اب تک تمام حرم کے اخراجات غیر شرعی طریقہ پر ہو رہے تھے؟

حقیقت یہ ہے صدیاں گزری تھیں کہ خود اسلامی مرکزوں سے وہ معیار اٹھ گیا تھا جس کی طرف قاضی نے اشارہ کیا تھا۔ ان سلاطین کا تو ذکر ہی کیا جن کے دل و دماغ پر قیصر و کسریٰ کی تصویریں نقش تھیں۔ قاضی مغیث کے اس سوال کے جواب میں جو بات علاء الدین نے کہی تقریباً وہی دہلی کا ہر سلطان کہتا کہ سیاسی حالات کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن اس سے سلطان کی مذہب سے نفرت یا بے تعلقی کا نتیجہ کسی طرح اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

سلطان کی اس گفتگو اور برہمی سے قاضی مغیث کو یہ خیال پیدا ہوا کہ علاء الدین اس سے سخت ناراض ہو گیا ہے۔ اور اب اس کی جان کی سلامتی ممکن نہیں۔ اگلے دن جب اسی خوف اور ہراس کے عالم میں دربار میں آیا تو سلطان نے قریب بلایا خلعت اور ہزار تنکہ انعام دیا[1]۔ اور اس کے بعد کہا ———

"من اگرچہ علمے وکتابے نخواندہ	میں نے اگرچہ علم اور کتاب کا مطالعہ نہیں
ام اما از چندیں پشت مسلمان ومسلمان	کیا ہے لیکن کتنی ہی پشتوں سے مسلمان
زادہ ام واز برائے آنکہ بلغا کے نشود	ہوں اور مسلمان زادہ ہوں اور اس غرض

[1] اگر سلطان قاضی کے اس شرعی نقطۂ خیال پیش کرنے سے ناراض ہو جاتا (جیسا کہ برنی کے انداز سے شبہ ہوتا ہے) تو وہ یہ عطیہ قاضی کو ہرگز نہ دیتا۔

کہ در ملغاک چندیں ہزار آدمی کشتہ می
شود بہر چیز یکہ دراں صلاح ملک و
صلاح ایشاں باشد بر خلق امر می کنم
و مردماں دہ دیدگی و بے التفاتی می
کنند و فرمان مرا بجائے نمی ارند مرا ضرورت
می شود کہ چیزہا در شت درباب ایشاں
حکم کنم کہ ایشاں بداں فرماں برداری کنند
ونمی دانم کہ اں حکم ہا مشروع است
دیا نا مشروع و من در ہر چہ صلاح ملک
خود می بینم و مصلحت وقت مرا دراں
مشاہدہ می شود حکم می کنم ونمی دانم کہ
خدائے تعالیٰ فردا قیامت بر من چہ خواہد
کرد فاما اے مولانائے جمعیت من یک
چیز در مناجات خود با خدائے تعالےٰ
می گویم کہ بار خدائے تو می دانی کہ اگر یکے
بازن دیگر سفاح می کند مرا در ملک
من زیاں نمی دارد و اگر کسے شراب می
خورد ہم مرا زیانے نیست و اگر دزدے
می کند جائے از میراث پدر من نمی برد

سے کہ فساد نہ ہو کیونکہ فساد میں ہزاروں
آدمی مارے جاتے ہیں ۔ میں جس چیز میں
ملک کی بھلائی دیکھتا ہوں لوگوں کو اس
کا حکم کرتا ہوں لوگ بے پروائی اور بے
توجہی برتتے ہیں اور میرا فرمان بجا نہیں
لاتے اس لئے ضرورت ہے کہ میں ان کے
متعلق سخت احکام نافذ کروں کہ وہ ان
کی تعمیل کریں ۔ میں نہیں جانتا کہ وہ احکام
جائز ہیں یا نہیں ۔ میں تو جن چیزوں میں ملک
کی بھلائی دیکھتا ہوں اور ان کو وقت کے
مناسب پاتا ہوں ان کا حکم کر دیتا ہوں
میں نہیں جانتا کہ کل خدا کا معاملہ میرے
ساتھ کیا ہوگا ! لیکن ہاں اے مولانا مغیث
میں ایک بات خدائے تعالیٰ کے ساتھ
مناجات میں کہتا ہوں ! اور وہ یہ کہ اے
خدا تو جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت
کے ساتھ زنا کرے تو اس سے میرے
ملک میں کوئی نقصان نہیں ہوتا ۔ اگر کوئی
شراب پیتا ہے تو مجھ کو اس سے بھی کوئی

که مرا در آید و اگر مال می ستانند در نامردی لی رود و از نارفتن ده بست نفر کار نامردی لی ماند در باب این چہار طائفہ انچہ حکم پیغامبراں است ان بکنم[1]

نقصان نہیں پہنچتا اگر کوئی چوری کرتا ہے تو میرے باپ کی میراث میں سے کچھ نہیں لیتا۔ جس کا مجھ کو درد ہو۔ اور اگر کوئی مال ہڑپ لیتا ہے اور اس کا اندراج نہیں ہوتا اور دس بیس آدمیوں کے نہ جانے سے نامردی کا کام رکتا نہیں ہے ——— لیکن اس سب کے باوجود ان چاروں لوگوں کے متعلق میں وہ ہی کرتا ہوں جو پیغمبروں کا حکم ہے

اس جواب سے سلطان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اس نے بہت سی باتوں کی وضاحت اس میں کر دی ہے۔

(۱) سلطان نے یہ خیال کر کر کہ کہیں قاضی کو اس کے مذہبی اعتقادات یا شریعت کے احترام کے متعلق شبہ نہ ہو جائے صاف صاف کہہ دیا کہ گو میں پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن میں مسلمان ہوں۔ میرے اجداد مسلمان تھے اور میں مسلمان پیدا ہوا ہوں۔

(۲) سلطان نے بتایا کہ جہاں تک احکاماتِ شرعی کا تعلق ہے وہ اپنی بے علمی کے باعث اُن سے واقف نہیں۔ لیکن سیاسی مقتضیات جو ہوتے ہیں اُن کے پیشِ نظر وہ "صلاحِ ملک" اور "صلاحِ خلق" کے لئے احکامات نافذ کرتا ہے۔ اس کو یہ نہیں معلوم کہ کہاں تک یہ احکامات شرع کے مطابق ہوتے ہیں اس لئے کہ اس کو شرع کا علم نہیں ہے لیکن جہاں تک نیت کا تعلق ہے وہ سب کچھ ملک کی بہبودی کی خاطر کرتا ہے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۶ - ۲۹۵

(۳) آخر میں سلطان بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے وہ کیا کیا دعائیں کرتا ہے اور کس طرح عرض کرتا ہے کہ وہ عوام کے اخلاق و اطوار کی درستی میں کوشاں ہے۔

اس تمام گفتگو کو اگر صحیح زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو سلطان کے مذہبی رجحانات کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ تاریخ نویسوں نے اس گفتگو کو اس طرح سے نقل کیا ہے کہ سلطان کا سارا مافی الضمیر مسخ ہو گیا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے غلط خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں جو جملے اس کی مذہب سے بے تعلقی کے ثبوت میں نقل کئے جاتے ہیں وہ اس کے احترام مذہب کی سب سے زیادہ قوی دلیل ہیں۔

مولانا شمس الدین ترک کی آمد سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک مشہور محدث اور عالم مولانا شمس الدین ترک مصر سے ملتان تشریف لائے تھے۔ اُن کے ہمراہ حدیث کی ۴۰۰ کتابیں تھیں وہ ملتان ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ سلطان نماز ادا نہیں کرتا اور جمعہ میں بھی حاضر نہیں ہوتا۔ یہ سنتے ہی انھوں نے دہلی آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور سلطان کو علم حدیث کی تشریح میں ایک رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں بقول برنی "در مدح سلطان مبالغت نمود"[1] ساتھ ہی انھوں نے فارسی میں ایک رسالہ لکھ کر سلطان کے پاس بھیجا۔ اُس میں لکھا تھا۔

میں مصر سے بادشاہ اور شہر دہلی کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ میں خدا اور رسول کے لئے دہلی میں علم حدیث کا درس جاری کروں اور مسلمانوں کو بے دیانت فقیہوں کی روایت پر عمل کرنے سے نجات دلاؤں۔ لیکن جب میں نے سنا کہ بادشاہ نماز نہیں پڑھتا اور جمعہ میں نہیں آتا تو اب میں ملتان سے ہی واپس جاتا ہوں[2]

اس رسالہ میں مولانا ترک نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے بادشاہ کی دو تین ایسی صفات

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۷ [2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۷

سنی ہیں جو " بادشاہان دین دار" کی خصوصیات ہیں اور دو تین باتیں ایسی سنی ہیں جن کی شاہان دیندار سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ خوبیوں کو مولانا ترک اس طرح گناتے ہیں ——

(۱) "خواری وزاری ولا اعتباری و بے مقداری ہندوان"

سلطان کے اس "کارنامہ" کا ذکر کرنے کے بعد بے اختیار لکھتے ہیں۔

"آفریں اے بادشاہ اسلام برایں دین پناہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم"[1]

(۲) "شنیدہ ام کہ غلہ و اقمشہ و اسباب چناں ارزاں کردہ کہ سر سوزنے براں زیادت تصور ندارد"[2]

میں نے سنا ہے کہ اناج اور کپڑے اور دوسری چیزیں آپ نے اتنی ارزاں کر دی ہیں کہ سوئی کے ناکہ کی برابر بھی اس پر زیادتی کا تصور نہیں ہو سکتا۔

پھر کہتے ہیں کہ یہ کام اتنا سخت تھا کہ بہت سے بادشاہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے تعجب ہے کہ آپ کے لئے ایسا کرنا کیونکر ممکن ہو گیا۔

(۳) "شنیدہ ام کہ جملہ مسکرات را بادشاہ برانداختہ است وفسق و فجور در کام فاسقان و فاجراں از زہر تلخ تر شدہ است"[3]

سنا ہے کہ تمام نشہ آور چیزوں کو بادشاہ نے باہر نکال پھینکا ہے اور فسق و فجور فاسق لوگوں کے کام و دہن میں زہر سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا ہے۔

اس پر بادشاہ کو مبارک باد دیتے ہیں۔

(۴) "شنیدہ ام کہ بازاریاں اہل السوق راکہ اہل اللعنت اند در سوراخ موش در آوردہ"

سنا ہے کہ بازاری لوگوں کو آپ نے چوہے کے بل میں گھسا دیا ہے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۷ [2] ایضاً۔ ص ۲۹۸ [3] ایضاً

اس پر بھی بادشاہ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کام بھی ایسا ہے کہ آدم کے وقت سے اب تک کسی بادشاہ کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکا۔

ان چاروں خوبیوں پر سلطان کو مبارک باد دینے کے بعد شیخ ترک بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

"اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار عمل درمیان انبیاء جائے تست[1] | اے بادشاہ! تجھکو مبارک کہ ان چار کاموں کی وجہ سے تیرا مقام پیغمبروں کے درمیان ہے۔

اس کے بعد جن باتوں کی شکایت کرتے ہیں اُن پر بھی غور کرنا چاہئے

(۱) تم نے قضا کا کام حمید ملتانی جیسے شخص کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ دنیادار آدمی ہے اور قضا کا کام "نازک ترین اشغال دین" میں سے ہے۔ اس میں احتیاط لازم ہے۔

(۲) میں نے سنا ہے کہ تمہارے شہر میں احادیث مصطفےٰ کو ترک کیا جاتا ہے اور دانشمندوں کی روایت پر عمل کیا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ "جس شہر میں حدیث کے باوجود فقہ کی روایت پر عمل کریں وہ شہر اینٹ کیوں نہیں بجاتا اور اس پر آسمانی مصائب کیوں نہیں برسنے لگتے۔

(۳) آخر میں شکایت کی تھی کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے شہر میں " دانشمند بدبخت سیاہ رو" مسجدوں میں بیٹھتے ہیں۔ اور رشوت لے کر فتوے دیتے ہیں۔ اور اُن کی بد دیانتی کی خبریں قاضی کی وجہ سے تم تک نہیں پہونچتیں[2]

ان سب کمزوریوں میں سب سے زیادہ وزنی اعتراض جو سلطان کے ذاتی کردار سے متعلق ہے وہ نماز سے غفلت ہے۔ بلاشبہ مذہبی فرائض کی ادائیگی میں یہ کوتاہی انتہائی قابل اعتراض ہے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۸ [2] ایضاً

لیکن اس کو سلطان کی مذہب سے بے تعلقی، نفرت یا دشمنی پر محمول کرنا (جیسا کہ بعض لوگوں نے کیا ہے) غلط اور گمراہ کن ہے اس سلسلہ میں بے اختیار خواجہ میر حسن علاء سنجری کی یہ رباعی زبان پر آجاتی ہے [۱]

دل را غم یار خار خارے دگر است	تقوی وصلاحیت شعارے دگرست
مشغول بدو شمارے دگرست	بیروں ز نماز وروزہ کارے دگرست

جہاں مولانا شمس الدین ترک کا یہ اعتراض نقل کیا جاتا ہے وہاں اُن کا یہ جملہ بھی یاد رکھنا چاہیے جو انھوں نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"درمیاں انبیار جائے نسبت" [۲]

برنی نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ اور کتاب مولانا نے بھیجی تو بہاء الدین دبیر نے کتاب تو سلطان علاء الدین کی خدمت میں پیش کر دی لیکن رسالہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اس لیے کہ اس میں قاضی حمید کے متعلق شکایات تھیں۔ برنی کو ملک قرا بیگ نے بتایا تھا کہ اس رسالہ کی اطلاع سعد منطقی نے علاء الدین کو کر دی تھی۔ اور بہاء الدین کی اس حرکت پر سلطان بے حد برہم ہوا تھا علاء الدین کو مولانا شمس الدین کے واپس چلے جانے کا افسوس ہوا۔ [۳]

ملکی نظام اور مذہب | برنی نے متعدد جگہ شکایت کی ہے کہ سلطان نے سیاسی معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہ ہونے دیا۔ علاء الدین کے سیاسی ومذہبی عقیدے کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

"چوں در بادشاہی رسید در دل او ہم	بادشاہ ہونے پر اس کے دل میں یہ خیال
چنیں نقش بستہ کہ ملک داری وجہانبانی	جم گیا کہ ملک داری اور جہانبانی ایک علیحدہ
علیحدہ کار لیست وروایت واحکام شریعت	کام ہے اور احکام شریعت وروایت ایک

[۱] دیوان حسن سنجری دہلوی۔ (حیدرآباد) ص۔ ۲۰ [۲] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۹ [۳] ایضاً

علیحدہ امریست واحکام بادشاہی بہ بادشاہ	الگ کام ہے۔ احکام بادشاہی کا تعلق
متعلق است واحکام شریعت بروایت	بادشاہ سے ہے اور احکام شریعت کا
قاضیاں ومفتیاں مفوض است در	تعلق قاضیوں اور مفتیوں سے ہے۔
حکم اعتقاد مذکور ہر چہ درکار ملک داری	بادشاہ اپنے اسی اعتقاد کے مطابق
اور افراہم آمدی وصلاح ملک دساں	ملک داری کے کاموں میں جو مناسب
دیدی آں کار خواہ مشروع وخواہ نا	سمجھتا اور جس میں وہ اپنے ملک کی بھلائی
مشروع بکردے"[1]	دیکھتا تھا وہ کرتا تھا خواہ وہ جائز ہوتا یا ناجائز

لیکن برنی کے اس بیان سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔ اس نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں واقعات سے بحث نہیں کی۔ تاکہ ہم اعمال کا جائزہ لے سکتے جن کی بنا پر برنی اس قسم کا خیال ظاہر کرنے پر مجبور ہوا۔ برخلاف اس کے برنی کے صفحات میں خود اس بیان کی تردید موجود ہے سلطان کے کسی عمل سے جان بوجھ کر شریعت کی مخالفت ظاہر نہیں ہوتی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ سلطان علاء الدین خلجی نے شرع کو نظر انداز کر دیا تھا صحیح نہیں۔ اس نے نہایت سخت ضرورت اور مشکل کے وقت بھی خراج کی مقدار مقرر کرنے میں شرع کے عائد کردہ حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ اس نے ملک کے سماجی نظام کے سلسلہ میں احکامات احتساب پر بہترین طریقہ سے عمل کیا تھا۔[2]

درستی اخلاق کی کوششیں سلطان علاء الدین خلجی نے عوام کے اخلاق درست کرنے کے لئے بے پناہ کوششیں کیں۔ امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں سلطان کی بعض اہم مساعی کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۸۹

[2] The Administration of The sultanate of Delhi p: 45.

جن میں سے ایک یہ ہے کہ طوائفوں کے نکاح جبراً کرادیے[۱]۔

خون پینے والے جادوگروں (سحرۂ خون آشام) کو سلطان نے بالکل ختم کردیا۔ اس گروہ کے سب لوگوں کو گردن تک زمین میں گاڑ کر سنگسار کردیا گیا[۲]۔

سلطان نے شراب نوشی کے انسداد کے لئے بھی بے حد جدوجہد کی اس نے شراب کا بیچنا اور پینا ممنوع قرار دے دیا تھا۔ علاء الدین پہلا ہندوستانی فرمانروا تھا جس نے شراب بیچنے کے مکمل انسداد کی کوشش کی۔ اس نے بگنی، بھنگ اور جوے کو بھی ممنوع کردیا تھا۔ شراب پینے والوں کی سزا کے لئے اس نے قید خانہ بنوائے اور خماران و قماران و بگنی گراں[۳] کو شہر بدر کردینے کا حکم دیا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس حکم کی وجہ سے سلطان کو خراج کا بہت نقصان ہوا —

"خراجہائے بے اندازہ ایشاں از دفاتر دور کردند"[۴]

لیکن سلطان نے اس حکم کو درستی اخلاق اور حکومت کے استحکام کے لئے ضروری سمجھا اور اس کے نفاذ میں سختی سے کام لیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے سب جام و سبو توڑ ڈالے۔ اور بداؤں دروازے کے پاس ان کے ڈھیر لگ گئے۔ محل شاہی میں جتنی شراب تھی وہ سب پھینکدی گئی۔ برنی کا بیان ہے کہ بداؤں دروازے میں اس قدر شراب پھینکی گئی تھی کہ کیچڑ پیدا ہو گئی تھی[۵]۔

---

[۱] خزائن الفتوح مطبوعہ علی گڈھ ص ۱۹-۱۸ [۲] خزائن الفتوح ص ۲۰

[۳] "بگنی بفتح یا و سکون کاف فارسی۔ نوعے از شراب باشد کہ آں را با عربی نبیذ خوانند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وبا یائے فارسی یعنی بگنی نیز بہ نظر آمدہ"

صائب لکھتا ہے — مست گشتم زجرعۂ بگنی + شد مزاجم ز بھنگ مستغنی

[۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴ [۵] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴

[۶] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴

امرار کو حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر شہر کے بازاروں، سڑکوں اور محلوں میں شراب نوشی کے انسداد کی منادی کریں۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس حکم کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ "حیادار" تھے انھوں نے اس کے بعد شراب پینا بند کر دیا۔ جو لوگ "بدنفس" اور "بے شرم" تھے انھوں نے اپنے گھروں میں بھٹیاں کھول لیں اور پوشیدہ طور پر تجارت کرنے لگے۔ سلطان نے ایسے لوگوں کو عبرتناک سزائیں دیں[1]۔

زانی لوگوں کے بعض گروہوں کو جو "اصحاب اباحت" کے نام سے مشہور تھے سلطان نے قطعاً نیست و نابود کر دیا[2]۔ اصحاب اباحت کے متعلق پروفیسر محمد حبیب صاحب کا خیال ہے کہ ان لوگوں سے مراد قرامطہ، اسمٰعیلی اور دیگر مرتد شیعہ طبقہ مقصود ہیں[3]۔

امیر خسرو سلطان علاءالدین کی دینداری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——

"باز از آنجا کہ کمال دین داری این معین	پھر جب کہ اس مددگار شریعت کے کمال
شریعت جملگی اصحاب اباحت را احضار	دینداری نے تمام اصحاب اباحت کو
فرمود، و متفحصان صادق را بر ایشاں	بلوایا اور سچے جاسوس اپنے متعین کر دیئے
گماشت تا ہر یک را پیش جستند، وازدے	تو ان میں سے ہر ایک کو دربار میں بلایا اور
تفتیش کردند"[4]	ان کی تفتیش کی۔

سلطان نے درستی اخلاق کے لئے یہ قدم کن جذبات و مقاصد کے ماتحت اُٹھایا تھا؟ اس سلسلہ میں اس کے ذہنی محرکات کا تجزیہ کرنا مشکل ہے لیکن اگر برنی کے ایک بیان پر یقین کیا جا سکتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس مسئلہ میں مذہبی جذبات بھی شامل تھے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۸۴ - ۲۸۵ [2] خزائن الفتوح۔ ص ۲۱ [3] The Campaigns of Alauddin by Prof: Habib p 12. F. N. 3 [4] خزائن الفتوح۔ ص ۲۱

اس نے قاضی مغیث سے اپنی گفتگو میں کہا تھا کہ "میں خدا تعالیٰ سے اپنی مناجات میں کہتا ہوں کہ کسی چور یا زانی یا شراب خوار نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں اس کو سزا دوں۔ اس کے باوجود میں جو اس کو سزا دیتا ہوں تو صرف پیغمبروں کے نقش قدم پر چلنے کی غرض سے دیتا ہوں!

سلطان علاء الدین خلجی، امیر خسروؒ کی نظر میں | حضرت امیر خسروؒ کا، سلطان بلبن کے زمانہ سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد تک ہمیشہ کسی نہ کسی دربار سے تعلق رہا ہے اگر ایک طرف ملک چھجو، شہزادہ محمد، حاتم خاں کی تعریف میں انھوں نے قصیدے کہے ہیں تو دوسری طرف سلطان جلال الدین، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دربار کبھی اُن کے قصیدوں سے گونج اٹھے تھے۔ ان سب قصیدوں کا اگر مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین کی شان میں جو قصائد انھوں نے لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ جوش، جذبہ اور جان ہے اور اس کی ایک وجہ ہے۔ اب تک ان کے ممدوح کسی غیر معمولی قابلیت کے مالک نہ تھے۔ علاء الدین جب تخت پر آیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ حقیقت میں تعریف کا مستحق بادشاہ تخت پر آگیا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے لکھا ہے ــــ

"علاء الدین خلجی کے آتے ہی ایک حقیقی ہیرو اسٹیج پر آگیا۔ اور امیر خسرو نے ایک شاعر کی سچی تیز نگاہی کے ساتھ منافقت کو دور کر کے حقیقت کو اختیار کر لیا اور پھر ایسے قصائد لکھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھے تھے"[1]

امیر خسروؒ نے اپنی مثنویوں میں سلطان علاء الدین خلجی کی مذہبی دلچسپیوں کا نہایت بلند آہنگی سے ذکر کیا ہے۔ "مجنوں لیلیٰ" میں سلطان کے متعلق لکھتے ہیں[2]

---

[1] "امیر خسرو"۔ از پروفیسر محمد حبیب (علی گڈھ) [2] "مجنوں لیلیٰ" بہ تصحیح نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ (علی گڈھ) ص ۱۵

سینۂ اش صدفِ دُرِ الٰہی — سنگش محکِ عیارِ شاہی

ایک اور شعر ہے ؎

دیں را علمش عماری خواب — محرابی او بناہ محراب [1]

"آئینہ سکندری" کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

محمد جہانگیر حیدر مصاف — کہ از بیش او پس خزد کوہ قاف
چراغ بنور حق افروختہ — عدو را بہ پروانگی سوختہ [2]

"مطلع الانوار" میں لکھتے ہیں ؎

شاہِ محمد کہ بتائید رائے — کرد قوی شرع رسولِ خدائے [3]

پھر ایک جگہ کہتے ہیں ؎ قاعدۂ ملک تو بنیاد دیں [4]

اسی مثنوی میں ایک جگہ سلطان کو ایماں پناہ کہتے ہیں۔ [4]

"شیریں وخسرو" میں سلطان علاء الدین کے متعلق لکھتے ہیں ؎

رضائے حق بہ تسلیمے خریدہ — دعائے را بہ اقلیمے خریدہ
رہِ دیں بس کز و بیجا رماندہ — سلاحِ غازیاں بیکار ماندہ [5]

"دولرانی" میں کہتے ہیں ؎

علائے دین و دنیا شاہ والا — بقدرت نائب ایزد تعالیٰ
چو انصافِ عمرؓ صیتش شنیدہ — زایامِ عمر سوئیش دویدہ [6]

---

[1] "مجنوں لیلیٰ" ص ۱۷۔ محرابی نوعے است از شمشیر [2] "آئینۂ سکندری" بہ تصحیح مولانا سعید احمد فاروقی (علیگڈھ) ص ۱۴ [3] "مطلع الانوار" بہ تصحیح مقتدی خاں شیروانی (علی گڈھ) ص ۲۴ [4] مطلع الانوار" ص ۲۶-۲۷ [5] "شیریں وخسرو" بہ تصحیح حاجی احمد علیخاں اسیر (علیگڈھ) ص ۱۲ [6] "دولرانی" بہ تصحیح رشید احمد انصاری (علیگڈھ) ص ۱۶-۱۷

"خزائن الفتوح" میں لکھتے ہیں۔

"اثرے از ماثر جہانداری ایں خلیفہ، محمدؐ نام، ابو بکر صدق، عمر عدل، نیز باز گویم کہ عثماں وار آیات رحمت رحمانی را در جلد مصحف وجود چگونہ جمع آوردہ است وعلی کردار ابواب علم را در مدینۃ الاسلام دہلی بکلید احسان بر چہ نمط باز کشادہ وایں مصر جامع را از کف دجلہ فیض بچہ آب روشنی بغداد دادہ، و رایات عباسی کہ از افتادن واقعات گراں خورد شکستہ بود بعلامات خلافت خویش برقاعدۂ عدل از سر برپائے کردہ، و عرصہ ممالک آفاق را از ارشاد رائے رشید بر چہ طریق مامون گردانیدہ بادر جہد امور چہ نوع المستنصر باللہ و المستعصم بودہ بودہ"[1]

یہ خلیفہ جو کہ محمد نام رکھتا تھا اور جو حضرت ابو بکر کا سا صدق اور حضرت عمر کا عدل رکھتا تھا اُس کے کارنامہائے جہانداری میں سے ایک کارنامہ بیان کرتا ہوں کہ حضرت عثمان کی طرح اُس نے .... خداوندی رحمت کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں کس طرح جمع کر دیا ہے اور حضرت علی کی مانند علم کے دروازوں کو مدینۃ الاسلام دہلی میں کس طرح احسان کی کنجی سے کھول دیا ہے اور اس بڑے شہر کو فیض کے دجلہ کے پانی سے کس طرح بغداد کی سی روشنی بخش دی۔ اور عباسی جھنڈے جو کہ سخت قسم کے واقعات کے پیش آنے کی وجہ سے سرنگوں ہو گئے تھے ان کو کس طرح پھر اپنی خلافت کی نشانیوں سے عدل کے ستون پر قایم کر دیا ہے اور تمام دنیا کے ممالک کو اپنی پختہ اور صحیح رشید مامون الرشید کے طریق پر ڈالا ہے۔ جو احکام کہ سلطانات بنی عباس میں کس طرح المستنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے۔

---

[1] "خزائن الفتوح"۔ (علی گڑھ) - ص ۲۷

سلطان علاء الدین خلجی، امیر حسن علاء سنجری کی نظر میں | " دستور صادقاں ارادت"[1] یعنی "فوائد الفواد"

کے مرتب خواجہ امیر حسن علاء سنجری، علاء الدین خلجی کے عہد کے مشہور شاعر اور بزرگ تھے۔ اپنے زمانہ میں "سعدی ہند" کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے۔[2] قناعت اور علائق دنیا سے تجرد و تفرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ برنی کا بیان ہے کہ میں نے ان اوصاف میں اُن جیسے کم لوگ دیکھے ہیں"

اُن کی زندگی میں کئی خاندان حکمراں ہوئے۔ اور بعض بادشاہ ان میں شعر و سخن کے دل دادہ اور فدائی تھے۔ مگر وہ ان سب درباروں سے علیحدہ رہے[3] لیکن سلطان علاء الدین کے عہد میں انھوں نے خوب قصیدے کہے اور سلطان کی نہایت بلند آہنگی سے مدح و ثنا کی۔ گو مبالغہ آرائی قصیدے کی جان ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ حقیقت نگاری اور قصیدہ نگاری میں تضاد ہے۔ امیر حسنؒ کے قصائد اگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کئے جائیں تو مبالغہ کے پردے اُٹھتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور سلطان کے اصلی خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ خود امیر حسن کا فرمانا ہے ؎

تو سخن سنجیدہ می گوئی دعل مدح تو ہرگز اندر یہٗ اندیشہ نتواں برکشید[4]

قصیدہ گو کی ہمیشہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے ممدوح کے اُن اوصاف کو بیان کرے جن سے وہ زیادہ سے زیادہ خوش ہو سکے اور جو اس کے رجحانات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوں۔ امیر حسنؒ کے قصائد اُٹھائیے۔ جگہ جگہ بادشاہ کی "دین داری" اور "دین پروری" کی تعریف ہے۔ "دین پناہ" اور "دین پرور" کے لقب سے ایک جگہ نہیں متعدد جگہ بادشاہ کو خطاب کیا ہے۔ اس سلسلہ کے

---

[1] "وایں فوائد الفواد، دستور صادقاں ارادت شدہ است" [2] برنی تاریخ فیروز شاہی [3] "دیوان حسن سنجری" (مطبوعہ حیدر آباد) مقدمہ ص ۹۳ [4] دیوان حسن سنجری ص ۴۸۴

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ———

علاء الدین والدنیا محمد شاہ دیں پرور
که از الطاف غیبی آنچه او خواهد همان بادا (ص ۴۵۳)

دست فلک چو برکشد بیدق صبحگاه را
روح امیں دعا کند دولت پادشاه را
شاه جهان علاء الدین کوست پناه دین حق
عصمت حق پناه باد این شه دیں پناه را (ص ۴۵۵)

تو دیں خدائے را نگہباں		تائید خدا نگاهبانت (ص ۴۶۷)

خدایگان زمین وزماں محمد شاه
که کار دیں محمد با عتقاد کند (ص ۴۷۲)

یارب ہمہ جہاں مدد عمر شاہ باد
اسلام در پناه شه دیں پناه باد (ص ۴۷۵)

اے تو شه دیں پناه و دیں بتو آورد پشت
عصمت پروردگاه پشت پناه تو باد (ص ۴۷۸)

شاہ ما چوں ملت حق را کند پشتی بعدل
می سزد گر نصرت غیبش به پشتیباں شود (ص ۴۸۲)

دیں حق را چو نگہباں و نگه داری تو
حق ہمہ جائے نگہدار و نگہباں تو (ص ۴۷۱)

ثبات ملت و ملک از بقائے او بادا		بقائے اوست کہ اسلام را مدار آمد (ص ۴۸۴)

؎ زر بخش علاؤالدین بر دنیا و دیں حافظ
دیں را بکنف دارد دنیا بعطا بخشد (ص ۴۸۵)

؎ کرم ہا کرد حق در حق سلطان مسلماناں
حقیقت شد کہ او را در مسلمانی ہمی باید
فراہم می کند از فضل یزداں کار ملک و دیں
بلے ایں کارہا از فضل یزدانی ہمی باید (ص ۴۸۵)

؎ دل پاکت کہ اماں بخش مسلمانانست
چوں دل شہ بہ دیں مسلمانی باد (ص ۴۸۵)

؎ اکنونکہ دین حق ز در تو سدد گرفت
چوں دور چرخ مدت ملکت مدید باد (ص ۴۸۸)

؎ اے تو شہ دیں پناہ دیں بتو افزودہ است
عصمت پروردگار پشت و پناہ تو باد (ص ۴۹۰)

؎ سر شاہاں مدار دہر در وئے ملک و پشت دیں
علاء الدین والدنیا محمد شاہ دیں پرور
مبارک روئے و فرخ رائے و گردوں بخت و دریا کف
مخالف سوز و شرع اندوز و دیں افروز و دیں گستر (ص ۴۹۸)

؎ سلطاں علاء دولت و دیں کز علو اد
اسلام و شرع آمدہ ہر روز بیش بیش (ص ۵۰۱)

سلطاں علاء دنیا و دیں آنکہ دین حق + در سایۂ سرادق او کرد جائے خویش (ص ۵۰۴)

ہ علاء الدین والدنیا محمد شاہ دیں پرور
کہ سلطان سلاطیں است و برہان بنی آدم (ص ۵۰۸)

ہ پناہ جملہ اسلام و پشت زمرۂ ایماں
مدار ملت احمد مراد خلقت آدم

خدایگاں سلاطین علائے دیں محمد
کشیدہ دائرہ عدل گرد مرکز عالم (ص ۵۱۷)

ہ سلطان علائے دولت و دیں خاصۂ خدا
ہرچہ از خدائے خواستہ دادہ خدا تمام (ص ۵۲۱)

ہ اکنونکہ دین حق ز در تو مدد گرفت
چوں دور چرخ مدت ملکت مدید باد (ص ۴۸۸)

ہ ہزار شکر کہ می پروریم جاں در ناز
بزیر رایت اسلام پرور سلطان (ص ۵۲۵)

ہ انچہ کرد می کند بہر بقائے دین حق
ہم بخدا اگر کند جز کرم خدایگاں (ص ۵۲۱)

ہ بنام ایزد زہے چتر شہ دین دار کز عظمت
پر جبریل را ماند سوادش چوں خط فرماں (ص ۲۹۲)

ہ اے پشت و پناہ امم و بازوے خلقت
اے دیدۂ اسلام و پسندیدۂ سبحان (ص ۵۳۴)

ہ شاہا تو نگہ داشتۂ قاعدۂ دیں دیں را تو نگہباں و نگہباں تو یزداں (ص ۵۳۴)

ے بے ہیچ شبہ شہ بود اندر پناہ حق
زیرا کہ ہست دیں حق اندر امان شاہ (ص ۵۳۹)

ے علاء الدین والدنیا محمدؐ شاہ دیں پرور
کہ ہست از وے ور ائش عالمے را کار بکشادہ (ص ۵۴۷)

ے جہاں بخش علاء الدین سلطان جہانگیر
الحق شہ دیں پرور و اسلام پناہی (ص ۵۵۰)

ے علاء الدین والدنیا محمدؐ شاہ دیں پرور
کہ از عدلش اساس شرع دار دسخت بنیادی (ص ۵۵۲)

ے خدایگان سلاطین علائے دنیا و دیں
مدار مملکت و بازوئے مسلمانی (ص ۵۵۶)

سلطان کا نام علاء الدین محمدؐ شاہ تھا۔ امیر حسن علاء سنجریؒ نے اکثر قصائد میں رعایت لفظی سے کام لے کر لکھا ہے کہ سلطان نے دین محمدؐ کی بنیادیں رسول مقبولؐ کی طرح استوار کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ——

ے نامش محمدؐ است محمدؐ صفت بہ بیں
دیں را زوال دولت او شد مدارہا (ص ۲)

ے محمدؐ ے کہ ہم از بہر دیں و ہم نامش
چو لشکرے ز عرب تا عجم بروں آمد (ص ۴۸۱)

ے ابو المظفر شاہ جہاں محمدؐ شاہ
کہ چوں محمدؐ مقصود ہشت و چار آمد (ص ۴۸۴)

سہ　محمدؐ آشکارا کرد دین حق بنام ایزد
کنوں در عہد ہم نامش شد ایں دیں آشکاراتر　(ص ۴۹۶)

سہ　ابو المظفر خاص خدا محمدؐ شاہ
پناہ ملت و پشت ہدیٰ محمدؐ دار .　(ص ۵۰۰)

سہ　محمدؐ ست محمدؐ صفت بنام ایزد
چو خضر از رخ شادی درا مبارک فال　(ص ۵۰۶)

سہ　مدار ملت و پشت ہدیٰ محمدؐ شاہ
کہ ہست ہم چو محمدؐ پناہ اہل امم　(ص ۵۱۷)

جگہ جگہ سلطان کی "اسلام پروری" اور "قاعدہ دین" کی پابندی کی تعریف کرتے ہیں سہ

سہ　ہزار شکر کہ می پروریم جاں در ناز　بزیر رایت اسلام پرور سلطاں　(ص ۵۲۵)

سہ　ہمیشہ قاعدۂ دیں بروقوی باد　بنور روح محمدؐ بحق روح امیں　(ص ۵۳۱)

سہ　روئے عروس دیں محمدؐ یافت جمال　از جبین شہ خدائش برافزود حال نو　(ص ۵۳۵)

سہ　شرع نبی و دین حق نشو و نما کرد و فر　یافت بعہد مصطفیٰؐ باز بروزگار او　(ص ۵۳۷)

سہ　شاہ جہاں محمدؐ شرع محمدؐ بیست　اندر پناہ مملکت جاوداں شاہ　(ص ۵۳۸)

سہ　سر ہمہ خلفائے امم محمدؐ آنک　کہ دین پاک محمدؐ بدو گرفت پناہ　(ص ۵۴۶)

ایک جگہ قسم کھاکر یقین دلاتے ہیں سہ

سہ　بجان جملہ اسلامیاں خورم سوگند　کہ دوست بر ہمہ اسلام منت جانی　(ص ۵۵۵)

(باقی آئندہ)

انسانِ کامل

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ (جامعۂ عثمانیہ) حیدرآباد دکن

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(رومی)

ان اشعار میں عارف روم نے دیو جانس کلبی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شے کی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا۔ لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ "اجی آخر ڈھونڈھتے کیا ہو؟" کہا کہ انسان کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔

اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اونچے مقام پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ "لوگو اوپر آؤ" جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ "میں نے تو انسان کو بلایا تھا، تم تو بول و براز ہو"۔

گویا دیو جانس کی نگاہ میں انسان کامل اور اس انسان نما صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و براز میں ہو سکتا ہے۔ دیو جانس اور اس کے متبعین نے انسان کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں ہمیں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے

کہ انسان کامل کی زندگی کا مقصود مادیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جسکو وہ اپنی زبان میں "نیکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیکی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے فارغ ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے مال و دولت جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ کمال کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے کلبیہؔ کا نعرہ تھا۔

خرمنیتی از آب و علف دست بدار سگ نیستی از جیفہ دنیا بگذر

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کی مویّدات جاہ و شہرت مال و دولت سے مستغنی ہو جائے، اتنی بات تو صاف ہے لیکن قلب کے اس تخلیہ کے بعد اس کا تحلیہ کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہے نیکی سے۔ نیکی سے کیا مراد ہے اس کا ایجابی تضمن کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد "خواہشات نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ" اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن ہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا، یا فلسفہ کی تاریخ میں یہ محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں "جس کی نگاہ زلزلہ فگن عالم افکار ہے"، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے۔ ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روح انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ روح انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دو کی غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنی حصہ ہے، وہ احساسات خواہشات اور اشتہاآت ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ۔ ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو،

قہرمانی ہو جو ان کو حد اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے۔ یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے، جو حکمت کا مقام ہے جس طرح خواہشات و اشتہاآت کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری و الٰہی حق حکمرانی و قہرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لئے بنائی گئی ہے۔ ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جسکو ہم اپنی زبان میں "ارادہ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ احساسات و اشتہاآت کی طرح دنی اور ذیل نہیں۔ فطرۃً مائل بہ شر نہیں یہ خلقاً شریف ملکہ ہے اور جب اس کی صحیح رہبری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور کورانہ جذبہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے لہذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ یہ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات و اشتہاآت کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جا سکتا ہے۔ افلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصے کو۔ اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات و خواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت و رہبری حاصل کر سکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں یہ تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جدا و علیحدہ ہیں۔ اگر فطرت انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور حواس بدن کے محض وظائف ہیں تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت و اطاعت کے لئے ہیں۔ جسم روح کی خدمت گذاری کے لئے ہے۔ اس ربط و تعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور دو گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے

ان دو گھوڑوں میں ایک شریف ہے اور دوسرا رذیل اس لئے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور رذیل جذبات و خواہشات کی۔ رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رخ آسمان کی جانب ہوتا ہے اس کا رجحان و میلان علو و رفعت کی طرف ہے۔ وہ جمال و کمال کا دلدادہ لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل کو سمجھتا ہے اور اسی کا شیفتہ و ربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقل قہرمان کا کام ہے کہ اپنے ان دو گھوڑوں کو قابو میں رکھے۔ ادنیٰ و رذیل کو اعلیٰ و شریف کے تابع کردے۔ ان کا رخ علو و رفعت کی جانب پھیر دے۔ نتیجہ کے طور پر روح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ جو اس کا کمال ہے۔ یعنی روح کا کمال اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و ماہیت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائگی میں مصروف ہوجاتا ہے، اور "وضع الشئی علیٰ محلہ" کے اصول کی تعمیل و تکمیل ہوجاتی ہے۔ فرد عقلمند اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل روح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ لذت و الم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔ جب عقل ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے اُمّہات فضائل بھی چار ہیں۔ حکمت و شجاعت، عفت و عدالت

اب انسان کامل کی روح میں کامل توافق ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفات حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلی ہوتی ہیں اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبدا و منبع ہیں۔ تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے ان کا حامل انسان کامل ہے۔ اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارائے دو جہاں" ہے گو کشتگان شہرت کی نظر میں حقیر و صغیر ہی کیوں نہ ہو۔

پیش خلقاں خوار و زار و ریش خند — پیش حق محبوب و مطلوب و لپسند

(رومی)

انسان جسم و روح پر مشتمل ہے جسم عناصر کثیر سے مرکب ہے اور روح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو روح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور روح کے مختلف ملکات عقل کے تابع ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے ایسی وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوتی ہے اور جو اپنا ظہور کثرت میں کرتی ہے اس لئے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق یا ہم آہنگی وحدت کا نام ہے اور مرد کامل وہ 'مطرب' (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دلفریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلفریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ واحد ہے لہذا کمال یا فضیلت عدالت افلاطون کے الفاظ میں 'تشبّہ باللہ' ہے اس وحدت یا 'کمال کا لازمی' ضروری و قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ انسان کامل ہمیشہ مسرور و شادماں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لگد کوب جہاں سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہوتا اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ وہ کورانہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کو کشاں کشاں زنداں میں جھونکا جا سکتا ہے اور تازیانہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر

پا سکتا ہے۔ تاہم "عدالت" کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شاداں ہو سکتا ہے۔ اس کی روح نغمہ الٰہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے۔ وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس　　تا بداں دل شاد باشی یک نفس

من نہ شادی خواہم و نے خسروی　　آنچہ خواہم من از تو ہم توی

(رومی)

افلاطون کا یہ بیان "حکمت ایمانی" کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب خود عقل کو بھی "شرع" کے تحت کر دیا جائے یعنی "عقل جزی"، "عقل کلی" کی پیروی کرنے لگے

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

(اقبال)

صحیح بخاری کی فنّی خصوصیات

(از جناب مولوی محمد سلیم صاحب صدیقی ایم۔اے)

(۳)

ان مختصر شرحوں میں مہلب ابن ابی صفرہ کی بھی شرح ہے جس میں مہلب نے بخاری کی بعض گرفتیں بھی کی ہیں مختصر شرحوں کے سلسلہ میں سب سے اچھی مفید جامع شرح بدرالدین محمد ابن بہادر بن عبداللہ الزرکشی الشافعی کی ہے زرکشی نے اپنی شرح کا نام "التنقیح" رکھا ہے۔ حافظ ابن حجر نے زرکشی کی شرح پر "نکت" کے نام سے بعض حواشی لکھے ہیں نیز قاضی محب الدین احمد بن نصراللہ البغدادی الحنبلی المتوفی سنہ ۸۴۴ھ نے بھی زرکشی پر ایک حاشیہ لکھا ہے مختصر شروح میں الدمامینی نے گجرات کے بادشاہ احمد ابن مظفر شاہ کے نام سے معنون کرکے ایک شرح لکھی ہے سیوطی نے حسب دستور بخاری پر ایک مختصر حاشیہ التوشیح کے نام سے لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ کا بیان ہے۔

ھو تالیف لطیف قریب من شرح الزرکشی	یہ بھی ایک لطیف تالیف ہے زرکشی کی کتاب کے قریب قریب ہے۔

ہندوستان کے مشہور لغوی محدث علامہ حسن صاحب مشارق الانوار کی مختصر شرح کا صاحب کشف الظنون نے "ہو مختصر فی مجلد" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے ایک دلچسپ انکشاف جو مختصر شروح کے سلسلہ میں کیا گیا ہے یہ ہے کہ فخرالاسلام بزدوی جو حنفی اصول فقہ کے امام سمجھے جاتے ہیں اور ان کا اصولی متن اصول فقہ کا ایک شاہ کار قرار دیا گیا ہے حاجی خلیفہ

کہتے ہیں ان کی بھی ایک مختصر شرح بخاری کی پائی جاتی ہے اسی طرح فقہ حنفی کے ایک اور عالم ابو حفص عمر بن محمد النسفی صاحب مدارک کی ایک شرح کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ "النجاح فی شرح کتاب اخبار الصحاح" اس کا نام ہے بیان کیا گیا ہے کہ نسفی نے اس کے دیباچہ میں ان اساتذہ کا ذکر کیا ہے جن کے واسطے سے وہ بخاری سے روایت کرتے تھے اور یہ بجاس سندیں ہیں ایک اور نحوی عالم صاحب الفیہ ابن مالک نے "شواہد التوضیح و تصحیح مشکلات جامع الصحیح" کے نام سے بخاری کی ایک مختصر شرح لکھی ہے۔ کشف الظنون میں ہے۔

هو شرح لمشکل اعرابه	مشکل اعرابی مباحث کے متعلق یہ شرح ہے

اسی طرح ایک اور نحوی شرح ابو الحسن محمد بن محمد الجوانی النحوی المتوفی سنہ ۶۴۰ھ کی بھی ہے۔ ابو بکر ابن العربی اور یمنی عالم عبد الرحمٰن وغیرہ نے بھی مختصر شرحیں بخاری کی لکھی ہیں۔

شروح متوسطہ اس ذیل میں البرماوی کی شرح ۴ جلدوں میں ہے جو در اصل الزرکشی اور کرمانی کی شروح کا خلاصہ ہے سنہ ۸۳۰ھ میں برماوی کی وفات ہوئی شرح کا نام "اللامع الصحیح" ہے دوسری متوسط شرح الکازرونی سعید ابن مسعود المتوفی سنہ ۷۶۶ھ کی ہے "الکوثر البجاری علی ریاض البخاری" کے نام سے علامہ احمد بن اسمٰعیل محمد الکروانی الحنفی کی بھی شرح ہے حاجی خلیفہ نے الکروانی کی شرح کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

رد فی کثیر من المواضع الکرمانی و ابن حجر و بین مشکلات اللغت و ضبط اسماء الرواۃ فی مواضع	کرمانی اور ابن حجر کی شرحوں کے مختلف مقامات کی اس شرح میں تردید کی گئی ہے اور لغت کے مشکلات بھی حل کئے ہیں نیز راویوں کے ناموں کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔

کرمانی کی شرح میں ایک جدید اضافہ یہ ہے کہ شروع میں رسول کریم کی سیرت اور اس کے بعد امام بخاری کی سوانح حیات کو بھی درج کیا ہے مصنف نے سنہ ۸۷۴ھ میں بمقام ایڈریانوپل اس شرح کی تالیف سے فراغت حاصل کی۔ العینی کی نسبت سے بھی حاجی خلیفہ نے بخاری کی اور ایک شرح کا ذکر کیا ہے۔ یہ مشہور بدرالدین عینی کے سوا ہیں۔ ان کا نام زین الدین ابی محمد عبدالرحمٰن ابن ابی بکر بن العینی الحنفی ہے۔ لکھا ہے کہ ھو فی ثلاث مجلدات (یعنی ان کی شرح تین جلدوں میں ہے) عینی اپنی اس شرح کے حاشیہ پر پوری بخاری نقل کرتے چلے گئے ہیں۔

متوسط شروح میں ابوذر احمد بن ابراھیم ابن السبط الحلبی المتوفی سنہ ۸۸۴ھ کی بھی ایک شرح ہے۔ حاجی خلیفہ نے بیان کیا ہے کہ

لخصہ من شروح ابن حجر والکرمانی والبرماوی — ابن حجر اور کرمانی و برماوی کی شرحوں کا اس شخص نے خلاصہ کیا ہے۔

اس کا نام التوضیح لاوہام الواقعۃ فی الصحیح ہے۔ نیز تین جلدوں میں ابن ارسلان المقدسی الرملی المتوفی سنہ ۸۴۴ھ کی بھی شرح ہے اور دو جلدوں میں سبط بن العجمی کی شرح کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

شروح طویلہ | بخاری کی طویل شرحیں جن بزرگوں نے لکھی ہیں ان میں ایک طبقہ تو مغرب اور اندلس کے علماء کا ہے ابن بطال اور ابن التین دونوں کے اقوال کا ذکر بخاری کے ان شارحین نے جو آخری زمانہ میں گذرے ہیں مثلاً ابن حجر وغیرہ نے بکثرت تقریباً تمام ابواب میں کیا ہے۔ حاجی خلیفہ وغیرہ نے اگرچہ ان شروح کی ضخامت نہیں بتلائی ہے لیکن اکثر ابواب میں ان کا تذکرہ کیا ہے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں کا کام مختصر نہ تھا البتہ ابن بطال کی شرح کا تذکرہ کرتے ہوئے کشف الظنون میں جو یہ لکھا ہے۔

غالبہ فقہ المالکی من غیر تعرض لموضوعہ — ان کی شرح زیادہ تر فقہ مالکی کے مسائل پر

الکتاب غالبا   مشتمل ہے خود بخاری کی کتاب کے اصل موضوع سے بہت کم تعرض کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح ہونے کی حیثیت سے ابن بطال کی یہ کتاب شاید زیادہ کامیاب نہیں ہے

رہے مشرق کے علما سو اس سلسلہ میں سب سے پہلے ابن المنیر الاسکندرانی کی شرح کا ذکر کیا جاتا ہے ہم نے تراجم بخاری کی شروح کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا تھا کہ تراجم ابواب پر انھوں نے ایک الگ کتاب لکھی ہے کشف الظنون سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ شرح تراجم بخاری کے انھوں نے خود صحیح بخاری کی بھی ایک طویل شرح قلمبند کی لکھا ہے

ھو شرح طویل فی عشر مجلدات   یہ طویل شرح دس جلدوں میں ہے

اس طرح ابوالقاسم احمد بن محمد بن عمر التیمی کی شرح کا ذکر کرتے ہوئے ھو واسع جدا کے الفاظ سے صاحب کشف الظنون نے اس کا تعارف کرایا ہے۔

اس سلسلہ میں چند اور شرحوں کا ذکر لوگوں نے کیا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے سب سے پہلے بڑے پیمانہ پر باضابطہ شرح کی ابتدا مشہور حنفی عالم علامہ مغلطائی ابن قلیج الترکی نے فرمائی ہے یہ آٹھویں صدی ہجری کے مصری عالم ہیں ان کی شرح کا نام "التلویح فی شرح الصحیح" ہے۔ شروح بخاری میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کا پتہ نہ چل نہ سکا کہ یہ کتنی جلدوں میں ہے۔ تاہم حاجی خلیفہ نے لکھا ہے "ھو شرح کبیر" مغلطائی کی شرح کا خلاصہ جلال الدین رسولا بن احمد الشافعی المتوفی سنہ ۷۹۳ھ نے کیا ہے مغلطائی کے بعد شمس الدین محمد بن یوسف بن علی الکرمانی المتوفی سنہ ۷۹۶ھ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بمقام مکہ معظمہ سنہ ۷۷۵ھ میں کرمانی نے اس شرح کو مکمل کیا ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ طواف کرتے ہوئے "الکوکب الدرار" نام رکھنے

کا انہیں الہام ہوا ۔

شرح بخاری میں اگرچہ اس شرح کو بہت شہرت حاصل ہے لیکن حافظ ابن حجر نے یہ لکھا ہے

شرح مفید علی انہ ہام فی النقل لانہ لا یاخذہ الا من الصحف	یہ ایک فائدہ بخش شرح ہے لیکن اس میں کافی چوکیں شارح سے اس لئے ہوئی ہیں کہ محض کتابوں سے اس شخص نے کام لیا ہے

یہ بڑے پتہ کی بات ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرمانی نے اس فن کو اساتذہ سے نہیں حاصل کیا تھا محض کتابوں کے مطالعہ سے معلومات فراہم کرتے تھے اس لئے ان سے بعض اوقات ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔

الکرمانی کے صاحبزادہ تقی الدین یحییٰ بن محمد الکرمانی نے بھی بخاری کی شرح کی ہے بظاہر اپنے والد کی شرح کو بجائے نقل کرنے کے کچھ عبارتوں کے رد و بدل سے ایک اپنی کتاب بھی انہوں نے بنالی ہے گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ کرمانی کبیر کی شرح کا یہ خلاصہ ہے ۔ کہتے ہیں یہ شرح آٹھ جلدوں میں ختم ہوئی ۔

طویل شرحوں میں اس کے بعد ابن ملقن المتوفی سنہ ۸۰۴ کی شرح کا نمبر آتا ہے ۔ یہ بیس جلدوں میں پوری ہوئی ہے لیکن جیسا کہ بخاری نے لکھا ہے ۔

اعتمد فیہ علی شرح شیخہ مغلطائی وزاد فیہ قلیلا	زیادہ تر اس میں اپنے استاد مغلطائی کی شرح کے مضامین پر اس شرح میں ابن ملقن نے اعتماد کیا ہے اور بہت ہی خفیف اضافہ اپنی طرف سے کرسکے ہیں

گویا مغلطائی ہی کی شرح کا یہ نقش ثانی ہے حافظ ابن حجر نے ابن ملقن کی اس شرح پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شروع میں شارح نے بڑا زور دکھایا ہے لیکن آخر میں بتدریج ان کا قلم سست پڑتا چلا گیا ہے حافظ نے اسی لئے لکھا ہے

بل هو فی نصفه الثانی قلیل الجدوی	نصف ثانی کو ان کی شرح بہت کم فائدہ مند باقی رہی ہے۔

لیکن سچ پوچھئے تو امام بخاری کا امت اسلامیہ پر باوجود ان تمام خدمات کے ایک ایسا قرض چڑھا ہوا تھا جس کے اتارنے کی گو مسلسل کوشش جاری رہی۔ لیکن وہ باقی کا باقی چلا آتا رہا تا اینکہ نویں صدی ہجری میں اس قرض کے اتارنے والے کو خدا نے پیدا کیا یہ شیخ الاسلام احمد بن علی ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو ابن حجر کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں۔ ان کی شرح جس کا نام "فتح الباری" ہے اس کے تیار ہونے کے بعد "لاہجرۃ بعد الفتح" کا اعلان کر دیا گیا، یعنی اب بخاری کی شرح کی طرف نئی توجہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور جو قرض امام کا امت کے ذمہ چلا آرہا تھا وہ ادا ہو گیا حاجی خلیفہ نے اس شرح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

ومن اعظم شروح البخاری شرح الحافظ العلامہ ابن حجر العسقلانی	بخاری کی تمام شرحوں میں سب سے بڑی شرح حافظ علامہ ابن حجر عسقلانی کی ہے۔

اس کے بعد وہ یہ لکھتے ہیں کہ یہ شرح دس جلدوں میں مکمل ہوئی ہے اور مقدمہ ہدی الساری کو ملا لیا جائے تو گیارہ جلدیں ہو جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے

شہرته انفرادہ بما یشتمل علیہ من الفوائد الحدیثیه والنکات الادبیه والفوائد الفقہیه تغنی عن وصفه	اس کتاب کی شہرت اور علم حدیث کے جن فوائد پر اور جن ادبی نکات اور نادر بے نظیر نکات پر یہ کتاب مشتمل ہے ان خصوصیتوں نے اس

کی ضرورت باقی نہیں رکھی ہے کہ اس کتاب
کی تعریف کی جائے

خصوصیات اس شرح کے اگر بیان کئے جائیں تو وہ ایک مستقل مقالہ کی شکل اختیار کرے گا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۸۱۷ھ میں بطور املا کے حافظ نے اس شرح کو لکھوانا شروع کیا کچھ دن یہ کام یوں ہی ہوتا رہا پھر بعد کو تھوڑا تھوڑا کر کے حافظ نے خود ہی لکھنا شروع کیا جب ایک جز پورا ہوجاتا تو وقت کے مقامی فضلا اس کی نقل لے لیتے تھے ہفتہ میں ایک دن مقرر تھا جس میں اصل مسودہ اور اس کی نقل کو لے کر سب جمع ہوتے۔ جز پڑھا جاتا درمیان میں بحث تمحیص اور رد و قدح کا سلسلہ جاری رہتا آخر میں اصلاح و ترمیم کے بعد مسودہ پاس ہوجاتا اس مجلس میں قرأت کا کام علامہ ابن خضر کرتے تھے۔ بہر حال

وصار السفر لا یکمل منہ الا وقد قوبل الی ان انتھی فی اول رجب سنہ ۸۴۲ — غرض کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہوئی جب تک کہ پورا مقابلہ اس کا نہ کر لیا گیا آخر پہلی رجب سنہ ۸۴۲ھ میں یہ شرح ختم ہوئی

اور یہی تاریخ اس شرح کے اختتام کی ہے حاجی خلیفہ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کی تنقیحی کوششوں کو حافظ نے آخری کوشش نہیں قرار دیا تھا بلکہ جب تک جیتے رہے اپنی اس محبوب کتاب کی نظر ثانی میں مصروف رہے۔

سوا ما الحقہ بہ بعد ذلک فلم ینتھ الی قبیل وفاتہ — علاوہ اس کے (اس مجلس کی کارروائیوں کے بعد بھی) اس میں حافظ اضافہ کرتے رہے پس یوں سمجھنا چاہئے کہ ان کی وفات سے کچھ ہی دن پہلے کتاب مکمل ہوئی

کہتے ہیں کہ ۸۴۲ھ میں جب اس کتاب کی تکمیل ہو گئی تو

عمل مصنفہ ولیمۃ عظیمۃ لم یتخلف عنہا وجوہ المسلمین الا نادراً بالمکان المسمی "بالتاج"	فتح الباری کے مصنف نے ایک عظیم الشان دعوت کی اتنی بڑی دعوت دی تھی جس میں سربرآوردہ ہستیوں میں شاید ہی کوئی شریک نہ ہوا ہو یہ دعوت مصر میں بمقام "تاج" عمل میں آئی تھی۔

یہ دعوت روز شنبہ دوسری شعبان کو ہوئی۔ پانچہزار مصری اشرفیاں دعوت میں خرچ ہوئیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکمل ہونے کے بعد بھی علماء کی مختلف مجالس میں اس شرح کی متعدد دفعہ خواندگی ہوتی رہی۔ آخری مجلس کا ذکر حاجی خلیفہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وقُرِیَٔ فی المجلس الاخیر وھناک حضورہ الائمہ کالقایاتی والسعد الدیری والونائی وغیرھم	آخری مجلس میں جس میں یہ شرح (فتح الباری) پڑھی گئی اس میں اس عہد کے ائمہ مثلاً قایانی اور سعد دیری، اور ونائی وغیرہ شریک تھے

یہ عجیب بات ہے کہ لکھنے کے ساتھ ہی اس کتاب کو سارے عالم اسلام میں غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا اسی کا نتیجہ تھا

طلبہ ملوک الاطراف بالاستکتاب	اطراف عالم کے سلاطین نے اس کتاب کی نقلیں منگوائیں۔

لکھا ہے کہ بعضوں نے تین تین سو اشرفیاں قیمت ادا کر کے اس کتاب کی نقل لی۔ خود حافظ کا یہی بیان ہے

لما اکملت الشرح کثرت الرغبات	اطراف عالم کے سلاطین کی طرف سے اس

فیه من ملوك الاطراف فاستكتبت لصاحب المغرب ابی فارس عبدالعزیز ولصاحب المشرق شاه رخ وللملك الظاهر

کتاب کی فرمائش کی اتنی کثرت ہوئی کہ میں نے یک نسخہ مغرب اقصےٰ کے بادشاہ ابن فارس عبدالعزیز کے لئے اور ایک نسخہ مشرق کے بادشاہ شاہ رخ (ابن تیمور) کے لئے اور ایک نسخہ ملک ظاہر کے لئے لکھوایا

اسی زمانہ میں جب ایک شافعی عالم ابن حجر مصر میں بخاری پر کام کر رہے تھے حنفی طبقات کے علماء میں بھی احساس پیدا ہوا گذر چکا ہے کہ ۸۱۷ھ میں فتح الباری کی تصنیف کا آغاز ہوا تھا ٹھیک اس کے چار سال بعد ۸۲۱ھ ماہ رجب میں مصر ہی کے ایک حنفی عالم بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی نے اپنی شرح لکھنی شروع کی فتح الباری ۸۴۲ھ میں ختم ہو گئی لیکن عینی کی شرح ۸۴۲ھ تک ثلث اول کے نصف تک پہنچی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوسری شرح کی تکمیل میں کافی وقت صرف ہوا تھا اس شرح کا نام "عمدۃ القاری" ہے حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ

هو بخطه فی احدی وعشرین مجلد بالمدرسة التی انشاءها بحارة كتامه بالقرب الجامع الازهر

خود اپنے خط سے یہ کتاب ۲۱ جلدوں میں ختم ہوئی ہے جو انھوں نے اس مدرسہ میں تیار کیا تھا جو جامع ازہر کے قریب حارہ کتامہ میں واقع ہے۔

لیکن بعد کو ان کی یہ شرح دس جلدوں میں مرتب کی گئی ہے اور اب دس جلدوں میں ملتی ہے مشہور ہے اور یہ بات کشف الظنون وغیرہ سب ہی کتابوں میں ہے کہ

استمد فیه من فتح الباری بحیث ینقل منه الورقة بكمالها

عینی نے اس شرح میں فتح الباری سے کافی مدد لی حتیٰ کہ بسا اوقات پورا ورق کا ورق

فتح الباری سے بعینہٖ نقل کر لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ برہان ابن خضر جو فتح الباری کی مجلس نظر ثانی میں قاری تھے ان ہی سے فتح الباری کے اجزاء عینی کو ملتے رہتے تھے۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے۔

کان یستصیر من البرهان ابن خضر باذن مصنفه	علامہ فتح الباری کے اجزاء برہان ابن خضر سے عاریۃً باجازت مصنف (ابن حجر) لیا کرتے تھے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر کی اجازت سے نقل عینی کو ملتی تھی جو دلیل ہے اس بات کی کہ ابتدا میں ان دونوں حنفی اور شافعی علما کے تعلقات کافی خوشگوار تھے لیکن اسباب کیا پیش آئے یہ تو معلوم نہیں مگر آخر زمانہ میں دونوں کے تعلقات جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کچھ خراب ہو گئے عینی کو اپنی شرح میں جہاں کہیں موقع ملا ہے حافظ ابن حجر پر تنقید کرنے میں کمی نہیں کی ہے۔ ابن حجر ان اعتراضات سے اپنی زندگی میں واقف ہو چکے تھے اور "انتقاض الاعتراض" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن جیسا کہ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے حافظ کی وفات ہو گئی اور جوابات کی تکمیل نہ ہو سکی۔

اس مناظرانہ رسالہ کے دیباچہ میں خود حافظ نے لکھا ہے کہ میری کتاب کو غیر معمولی حسن قبول دنیا میں جب حاصل ہوا تو

فحسدہ العینی وادعی الفضیلۃ علیہ فکتب فی ردہ و بیان غلطہ فی شرحہ	پس عینی کو اس کتاب سے حسد پیدا ہوا اور برتری کا مدعی، پھر اس کتاب کی تردید میں بھی لکھا اور اپنی شرح میں میری کتاب کی غلطیوں کو بیان کیا۔

(باقی آئندہ)

سنہ ۴۳ء: ۔ مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول لغت قرآن پر بے مثل کتاب ۶ مجلد للعہ

سرمایہ: ۔ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ، جدید اڈیشن۔ قیمت عہ

اسلام کا نظام حکومت۔ اسلام کے ضابطۂ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث قیمت ۶ مجلد ۶

خلافت بنی امیہ: ۔ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت ۳ مجلد ۳ مضبوط اور عمدہ جلد للعہ

سنہ ۱۹۴۴ء: ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت للعہ، مجلد صہ

نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جس میں تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے۔ قیمت للعہ مجلد صہ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی قیمت ۳ مجلد للعہ

سنہ ۱۹۴۵ء: ۔ قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت عہ مجلد ۳

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان قیمت صہ مجلد ۳

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی کتاب قیمت ۳

سنہ ۴۶ء: ۔ ترجمان السنہ: ۔ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ صفحات ۶۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹/۸ جلد اول عللہ مجلد عہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم قیمت للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا نظم مملکت: مصر کے مشہور ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی کی محققانہ کتاب "النظم الاسلامیۃ" کا ترجمہ۔ قیمت للعہ مجلد صہ

تحفۃ النظار: ۔ یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تحقیق و تنقید از مترجم قیمت عہ قسم اعلیٰ ۳

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز اور دلچسپ تاریخی کتاب قیمت عہ

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے۔ اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱- **محسن خاص** - جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲- **محسنین** :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳- **معاونین** :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴- **احبا** :- نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا انکو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دیجائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبا کیلئے ہے

قواعد

۱- برہان ہر انگریزی مہینے کی یکم تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔

۲- مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

۳- باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں انکی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

۴- جواب طلب امور کے لئے ۱ار ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵- قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۱۰ ار

۶- منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء:- اسلام میں غلامی کی حقیقت:- جدید ایڈیشن
جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔
قیمت ے مجلد للعہ

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور روحانی
نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت عا مجلد ے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت:- اشتراکیت کے متعلق جرمن
پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ مع مقدمہ از مترجم۔
قیمت ے مجلد للعہ

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۸ر

۱۹۴۰ء:- نبی عربی صلعم:- تاریخ ملت کا حصہ اول
جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص
ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے
جدید ایڈیشن جس میں اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے
قیمت عہ مجلد ۱۲ر

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے
ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے قیمت عا مجلد ے

غلامان اسلام:- اسّی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات
و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان جدید
ایڈیشن قیمت ہے مجلد عہ زیر طبع

اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط
اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں حک و فک کے
بعد غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب
کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے قیمت ہے مجلد عہ

۱۹۴۱ء:- قصص القرآن جلد اول:- جدید ایڈیشن
حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات
تک۔ قیمت عہ مجلد ہے

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر جدید محققانہ کتاب عا مجلد ے

بین الاقوامی سیاسی معلومات:- یہ کتاب ہر لائبریری میں
رہنے کے لائق ہے ہماری زبان میں بالکل جدید کتاب۔
قیمت عا

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب تاریخ انقلاب روس
کا مستند اور مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن دو روپے (زیر طبع)

۱۹۴۲ء:- قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع سے
حضرت یحییٰ کے حالات تک دوسرا ایڈیشن ے مجلد للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام:- وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن للعہ مجلد عہ

مسلمانوں کا عروج و زوال:- صفحات ۳۵۰ جدید
ایڈیشن قیمت للعہ مجلد عہ۔

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید ایڈیشن
قیمت ہے مجلد ہے مضبوط اور عمدہ جلد قیمت للعہ

جون سنہ ۱۹۴۸ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

از پروفیسر عبادت صاحب بریلوی۔ ایم۔ اے

یہ حقیقت ہے کہ ہماری گذشتہ چند سالوں کی تاریخ قدامت اور رجعت کے ایسے طوفانوں کی تاریخ ہے جنہوں نے معقولیت اور ترقی پسندی اور ترقی پذیری کی بنیادوں کو ہلا ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو تباہی آئی ہے، وہ آج ہم سب کے سامنے ہے۔ یہ ایک ایسا زخم ہے جس کا صدیوں تک مندمل ہونا مشکل ہے یہیں تک بات ختم ہو جاتی تب بھی غنیمت تھا لیکن افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ قدامت اور رجعت کی قوتیں جو اس تباہی کو لانے میں پیش پیش رہی ہیں ان کا زور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور وہ ایسے نئے نئے گل کھلا رہی ہیں جن کو دیکھ کر خود ہماری تہذیب حیران ہے۔ انسانیت انگشت بدنداں ہے اور عقل و خرد کے ہوش اڑ گئے ہیں۔

قدامت اور رجعت کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی قوتوں نے وطن عزیز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ہی دیس کے رہنے والے ایک رات میں ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دئے گئے۔ جو قوتیں اس غیر فطری عمل کو روکنا چاہتی تھیں، اور جن کے نزدیک یہ جنت نشان کے پیچیدہ مسائل کا صحیح حل نہیں تھا، ان کی ایک نہ سنی گئی۔ ان کو طرح طرح سے ذلیل کیا گیا۔ ان کی پگڑیاں سر بازار اچھالی گئیں۔ اس بات کو مختلف انداز سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ابن الوقت، غدار، جاہل اور نادان ہیں لیکن ان کے عزم و استقلال کی قوتیں ان طوفانوں سے برابر سرگرم ستیز رہیں، اور ایک لمحے کو بھی ان کی قوتِ ارادی کے قدم ڈگمگا نہ سکے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ راہِ حق پر گامزن ہیں۔ لیکن بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ وطن

عزیز کی تقسیم کے بعد وہ لوگ جو کل تک ان کے دوش بدوش کام کرتے تھے جن کی تخئیل کی سانس یک جان دو قالب ہو کر آسمانوں کے ستاروں کو چھونے کے منصوبے باندھا کرتی تھی، ان میں سے بعض بلکہ اکثر خود قدامت اور رجعت کے گڑھے میں جا گرے، اور اپنے ساتھیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ یہ ہماری تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ اور اس پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رجعت پسند قوتیں جو آج اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کر کے نئے نئے گل کھلا رہی ہیں، وہ دوسرے روپ میں بہت پہلے سے موجود تھیں لیکن اب انھوں نے حالات کی بدلتی ہوئی کیفیت کا سہارا لے کر من مانی کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ہم آج زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی کارفرمائیاں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ افسوسناک اور تحیر خیز مثال ہمیں اس پالیسی کی صورت میں ملتی ہے جو زبان کے معاملے میں ان قوتوں نے اختیار کی ہے۔

یو پی کی حکومت نے اس سلسلے میں سب سے پہلے قدم اٹھایا ہے۔ وہ حکومت جو اپنی غیر جانبداری، بلند نگاہی اور کشادہ دلی میں ہمیشہ ہمیشہ پیش پیش رہی تھی آج اس نے سب سے پہلے فرقہ پرستی، تنگ نظری اور کم نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اور کانگریس کے زریں اصولوں سے کھلے خزانے انحراف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے کانگریس کی نہایت صریح اور واضح تجویزوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس نے ہندوستان کے سب سے بڑے قائد اور رہنما مہاتما گاندھی کے احکامات سے چشم پوشی کی ہے یعنی یو پی کی موجودہ حکومت نے اپنے صوبے کی زبان کو ہندی قرار دیا ہے اور یہ بات لازمی کر دی گئی ہے کہ سوائے ناگری رسم الخط کے اور کوئی رسم الخط استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی نہایت سخت اور مشکل قسم کی ہندی اب یو پی کی سرکاری زبان ہے۔ اور اس کو عام کرنے میں آندھی کی سی تیزی سے کام لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ چند مہینوں کے اندر یو پی میں ہر جگہ، ہر شعبے اور ہر محکمے میں سنسکرت آمیز ہندی کو ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کام کرنے والے بے شمار دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود اس میں کام کرنے کے لئے مجبور کئے جا رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں "نادر شاہی" احکامات کی یہ تنہا مثال ہے۔ عوامی حکومت کی مطلق العنانی کا نمونہ اس کے علاوہ

کہیں اور نہیں مل سکتا۔ جمہوریت کا دعویٰ کرنے کے باوجود تسلطائی ذہنیت کا یہ عجیب وغریب مظاہرہ ہے۔

حکومت یوپی کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ سنسکرت آمیز ہندی کا دور دورہ ہے ہر شعبے میں ہندی رائج کی جا رہی ہے۔ حکومت کے کام جس حد تک ہو سکتے ہیں ہندی میں ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں ہندی ہو گئی ہے پولیس کے محکمے میں ہندی ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندی ہے، بازاروں میں ہندی ہے، در و دیوار پر ہندی ہے۔ ہر شخص کے آس پاس، دائیں بائیں ہندی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ لوگوں کی زبانوں پر ہندی نہیں ہے۔ جس زبان کو حکومت پوری قوت سے رائج کر رہی ہے جس کے لئے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے جس کو پھیلانے کے لئے سخت احکامات نافذ کئے جا رہے ہیں، جس کی اشاعت کے لئے عوام کے مذہبی اور فرقہ پرستانہ جذبات سے کھیلا جا رہا ہے، وہ عوام نہیں بولتے۔ کم از کم یوپی کے عوام نہیں بولتے۔ عوام کا کیا ذکر ہے، آپس کی بات چیت اور گفتگو میں ٹنڈن جی نہیں بولتے۔ پنت جی نہیں بولتے۔ سمپورنانند جی نہیں بولتے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ دعوے یہی کرتے ہیں کہ ان کی زبان یہی سنسکرت آمیز ہندی ہے۔ بالک ہٹ اور تریا ہٹ سنتے آتے تھے لیکن آج "ہندی ہٹ" سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ ہٹ اب دن بدن زیادہ سے زیادہ بھیانک، خوفناک اور خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جنت نشان کی تقسیم اسی طرح کی ہٹ اور ضد کے نتیجے میں عمل میں آئی۔ اور اس کے بعد میں تباہی اور بربادی کے جو طوفان آئے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ کون جانے کہ اس ضد اور ہٹ کے نتائج اس سے بھی زیادہ بھیانک خوفناک اور خطرناک ثابت ہوں۔

اگر لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو یوپی میں وہ یک جہتی پائی جاتی ہے جس پر وہ فخر کر سکتا ہے اس صوبے کے تمام لوگ اس ایک زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں جس کو مختلف زمانوں میں مختلف نام دیے جاتے رہے۔ کسی زمانے میں اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا کسی زمانے میں وہ ریختہ کے نام سے موسوم کی گئی۔ کسی زمانے میں اس کو اردوئے معلّٰی کہہ کر پکارا گیا اور آخر میں وہ صرف "اردو" رہ گئی۔ یہ زبان ایک زمانے تک کاروبار کے لئے استعمال کی جاتی رہی۔ حکومت سے اس کو کبھی بھی خاطر خواہ مدد نہ ملی۔ مغلوں کے یہاں سارا کام فارسی میں ہوتا تھا اس لئے اس کو وہ پوری طرح اپنا نہ سکے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف عوام میں پھیلتی اور بڑھتی رہی۔ یہ زبان

فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی ہندو اور مسلمان سب اسی الخط کو استعمال کرتے تھے۔ برج بھاشا کا رسم الخط اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا تھا۔ جب برج بھاشا نے اردو کی شکل اختیار کرلی تو رسم الخط فارسی ہی رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج میں اس زبان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا تو ابتدا اسی سے ہوئی۔ کتابیں بھی اسی زبان میں تصنیف وتالیف ہوئیں۔ اس زمانے کے لکھنے والے بھی اس کے لئے ہندی، اردو، یا اردوئے معلیٰ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں؛ انگریزوں نے البتہ اس کو ہندوستانی کہا ہے فورٹ ولیم کالج اور اس کے ارباب حل وعقد نے جہاں ہماری زبان کو بہت سے فائدے پہنچائے وہاں ایک کاری زخم اس کے اوپر بھی ایسا لگایا جو آج تک مندمل نہیں ہوسکا ہے یہ اس خیال کا پرچار تھا کہ ہندو منشی اس عام مشترکہ زبان کو قدیم سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط میں بھی لکھیں کیونکہ فارسی رسم الخط ان کے لئے بدیسی ہے۔ للو جی لال نے اس کو شروع کیا۔ اور پھر اس تحریک کا بیج پھوٹ نکلا۔ ہماری زندگی کے احیائی رجحانات (............) کے سلسلے میں اس نے پرورش پائی۔ اور زبان کا مسئلہ سیاست کے ساتھ الجھ گیا۔ یہ ہے موجودہ ہندی کی حقیقت! برج بھاشا اور اسی طرح کی دوسری زبانوں سے براہ راست اس کا سلسلہ نہیں ملایا جا سکتا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ہندوستانی لسانیات سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔

موجودہ ہندی حال کی پیداوار ہے۔ اور "بعض معاویہ" میں اس کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور کی جارہی ہے۔ لیکن ہمیں اس کے باوجود ہندی سے کوئی پرخاش نہیں۔ اگر بعض لوگ اس کے ارتقاء کو فطری سمجھتے ہیں تو اس کے پھیلانے اور بڑھانے کے لئے حالات پیدا کرنے چاہئیں۔ لیکن اس طرح کہ اس سے دوسرے نظریات کو ٹھیس نہ لگے۔ تمام زبانوں کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع ملنا ضروری ہے کم از کم ہندی کے علمبرداروں کو اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو مختلف شکلیں ہیں۔

کانگریس نے انھیں تمام حالات کو سامنے رکھ کر اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس آسان بولنے والی زبان کو ہندوستانی، کا نام دے دیا جائے۔ تاکہ ایک بیچ کا راستہ نکل سکے چنانچہ اس سلسلے میں کانگریس کی یہ تجویز موجود ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان وہ آسان بولنے والی زبان ہوگی جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ اس کا نام ہندوستانی ہوگا۔ وہ دونوں رسم الخط یعنی ناگری اور فارسی میں لکھی جائے گی۔ گاندھی جی مرتے دم تک اس کا علم بلند کرتے رہے۔ کیونکہ

ان کے خیال میں یہی نجات کا راستہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں مرکزی حکومت اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ کچھ پتہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ گاندھی جی کی طرح حق گو، منصف مزاج۔ حقیقت پرست، اور صداقت پسند لوگ اب نہ ہونے کے برابر ہیں ان کی زندگی میں یہ گتھی بہت آسانی سے سلجھ سکتی تھی۔

مرکزی حکومت کا جو فیصلہ ہوگا، اس کا جواب تو مستقبل ہی دے گا لیکن آج یوپی کی حکومت نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کا جو فیصلہ کر دیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ مرکزی حکومت کے فیصلے سے قبل یہ پیش قدمی، اور وہ بھی کانگریس کے فیصلے کے صریحاً خلاف کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ کانگریس نے صاف صاف "ہندوستانی" کو قومی زبان تجویز کیا تھا لیکن یوپی کی حکومت نے اس سے انحراف کر کے سنسکرت آمیز ہندی کو یوپی کی زبان قرار دے دیا ہے۔ اور اس کو عام کرنے میں جس سرعت سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہمارے تصور کی پرواز بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی یہ جلدی صرف اردو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ہے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کی نیند سلا دینے کے لئے ہے۔ کیونکہ اردو یوپی کی حکومت کے خیال میں مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور مسلمانوں کی زبان کو فنا کرنے کے لئے وہ کانگریس اور مہاتما گاندھی کی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ ٹنڈن جی نے متعدد بار پبلک جلسوں میں کانگریس اور گاندھی جی کا مضحکہ اڑایا ہے انھوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی فطرت میں تفرقہ پردازی ہے۔ اس کا وجود تسلیم نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کانگریس میں شامل ہیں۔ وہ یوپی اسمبلی کے اسپیکر ہیں اور انھیں کانگریس پارٹی کا تعاون حاصل ہے ؎

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

کیا ہم کانگریس کے ارباب حل وعقد سے یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ جو فرد یا جماعت کانگریس میں ہوتے ہوئے بھی اس کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرے اس سے بازپرس کرنے کا انھیں حق حاصل ہے یا نہیں؟

اردو کو ہم تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا سب سے بڑا سرمایہ تصور کرتے ہیں ممکن ہے۔ بعضوں کے نزدیک وہ افتراق کے نتیجے میں صورت پذیر ہوتی ہو اور اس نے آپس میں تفرقہ پھیلایا بھی ہو۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا عرض کرنا ضرور اپنا فرض سمجھتے ہیں اگر وہ باہمی میل جول کا نتیجہ نہیں ہے تو پھر اس میں "ہندی" اور فارسی کی آمیزش شیر و شکر کی طرح کیوں نظر آتی ہے؟

اس میں بعض ایسی کتابیں کیوں لکھی گئی ہیں جن میں فارسی اور عربی کا ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے؟ (اس سلسلے میں سید انشا کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی اور آرزو لکھنوی کی "سریلی بانسری" خاص طور پہ قابل ذکر ہیں) ۔ اور اگر ہمیشہ سے تفرقہ اندازی اس کا کام رہا ہے تو اردو ادب میں وطنیت ہندو مسلم میل جول، کانگریس کی موافقت، وطن پرستوں کا ذکر، اور زندگی کے بنیادی مسائل کا تذکرہ اس قدر زیادہ کیوں ملتا ہے؟ مسلم لیگ اور پاکستان کی موافقت میں آج تک اس کے کسی معیاری شاعر اور ادیب نے کیوں کچھ نہیں لکھا؟ کیوں وہ سب کے سب اس کی مخالفت کرتے رہے؟ اور اس کے علمبرداروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت دیا شنکر نسیم، درگا سہائے سرور، برج نرائن چکبست، نوبت رائے نظر، جوالا پرشاد برق، بشن نرائن در، کشن پرشاد کول، سرتیج بہادر سپرو، مہاراج بہادر برق، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، دیا نرائن نگم، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، تشیشور پرشاد منور، رگھوپتی سہائے فراق، اور بے شمار دوسرے لکھنے والے کیوں پیدا ہوئے؟ ۔ اور آج بھی ایک اچھا خاصہ طبقہ کیوں سرگرداں ہے؟ ۔ حقیقتاً یہ ہے کہ وہ افتراق کی نشانی نہیں میل جول کا نمونہ ہے سیاست کی وجہ سے پھیلتی ہوئی نفرت نے اس کو اس کے صحیح مرتبے سے گرا دیا ہے، ورنہ وہ بقول سرتیج "اگر ہندوستان میں کوئی زبان ایسی ہے جو پشاور سے سی پی تک اور سی پی سے آگے صوبہ بمبئی کے بعض مقامات تک بولی اور سمجھی جاتی ہے تو وہ اردو اور صرف اردو ہے ۔ وہ لوگ صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے میں اس دعوے کو تسلیم کرنے سے صاف طور پہ انکار کرتا ہوں ۔ اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اردو ان کی زبان ہے تو میں اس قول کو ماننے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے برابر کی خدمات انجام دی ہیں"

لیکن یو پی کی حکومت اس کو صرف مسلمانوں کی زبان کہتی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اردو کے خلاف اپنے اس طرز عمل کو ہرگز روا نہ رکھتی ۔ یو پی کی حکومت کو یہ کون سمجھائے کہ اردو اگر مسلمانوں کی زبان ہوتی تو بنگالی اور سندھی بھی اس کو سینہ سے لگاتے لیکن ایسا نہیں ہے بنگالی کے مسلمان علمبردار تو اس کی مخالفت میں اس قسم کی دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کا ادب دہریت اور الحاد سے بیٹا پڑا ہے ۔ یہ خیال کسی معمولی آدمی کا نہیں ہے بلکہ مشرقی بنگال کے ایک وزیر کا ہے جس کو انھوں نے بنگالی کے مقابلہ میں اردو کو کم مرتبہ ثابت کرنے کے سلسلے

میں پیش کیا ہے۔ لیکن بالفرض حکومت یوپی کے اس خیال کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو کیا ایک جمہوری حکومت کا دعوے دار ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اقلیت کی زبان ہی کی حیثیت سے وہ اس کو اس کی جائز جگہ دے، ہر جمہوری حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کی حفاظت کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اس کو جمہوری حکومت کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یوپی کی حکومت جمہوریت کی علمبردار اور دعوے دار ہونے کے باوجود زبان کے معاملے میں جس قسطائی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہی ہے اس کی مثال جمہوریت کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے

اردو اور اردو والوں کی چشمِ حسرت اس وقت کانگریس کے ارباب حل وعقد اور متحدہ قومیت کے ان صحیح، سچے اور پرخلوص علمبرداروں کی طرف دیکھ رہی ہے، اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ کیا وہ مہاتما جی کی خواہشوں، ان کے اصولوں، اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس طرح موت کے گھاٹ اترتا ہوا دیکھتے رہیں گے؟ کیا الٹی گنگا بہتی رہے گی اور انھیں احساس تک نہ ہوگا؟۔ کیا ایک منظم سازش کے جال کو وہ بچھتا ہوا دیکھیں گے اور ان کے کان پر جوں تک نہ رینگے گی؟ کیا ایک نئے طوفان کی آمد کے لئے حالات پیدا کئے جاتے رہیں گے اور انھیں خیال تک نہ ہوگا؟۔ کیا وہ ان تمام ناسازگار حالات سے چشم پوشی کرتے رہیں گے؟ ۔ لیکن آخر کب تک؟ کیا وہ اس وقت توجہ کریں گے جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا، اور فضا میں یہ آواز گونجنے لگے گی ؎

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

سلطان علاء الدین خلجی کے مذہبی رجحانات

(۲)

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔
استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلطان علاء الدین، عصامی کی نظر میں عصامی، محمد بن تغلق کے عہد کا مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب فتوح السلاطین، برنی کی تاریخ فیروز شاہی" سے آٹھ سال قبل لکھی تھی[1]۔ اس کتاب میں کئی جگہ عصامی نے سلطان علاء الدین کے معتقداتِ مذہبی کی تعریف کی ہے۔ اور اس کو "شاہِ دیں پرور" بتایا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

بہ عہدش کسے جز غم دیں نخورد — بدورش کس از غم شکایت نخورد
غمِ خلق می خورد تا زندہ بود — زشاہاں ہمہ گوئے عصمت ربود
غرض چوں ہمیں شاہِ فیروز فن — کہ بودا ست دیں پرور دوں شکن[2]

کتاب کے آخری حصہ میں عصامی نے محمد بن تغلق اور علاء الدین خلجی کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ اور پھر لکھا ہے ؎

محمد اگر ہر دو را گشت نام — یکے از لیام است یکے از کرام
گر او کرد اسلام را آشکار — ازیں کفر بگرفت یکسر دیار

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ "عصامی نامہ" از سید یوشع بی۔ اے [2] فتوح السلاطین (آگرہ) ص ۲۹۳-۹۴۔

گر او کرد در شرع احمد شروع — شد این منحرف از اصول و فروع[1]

عمارات میں مذہبی جذبہ | اگر یہ صحیح ہے کہ عمارتوں کے طرز تعمیر اور کتبوں کے طرز تحریر سے بنانے والے کے احساسات و رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے[2] تو ہمیں سلطان علاء الدین خلجی کی بنوائی ہوئی عمارتوں کا نہایت غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ فتح پور سیکری میں اکبر کی عمارتوں کے متعلق بعض مورخوں کا خیال ہے کہ وہ صرف اکبر کے مذہبی رجحانات کی عکاسی ہی نہیں کرتیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مذہبی تخیل اور "دین الٰہی" نے اپنے آپ کو پتھر میں منتقل کر دیا ہے یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علاء الدین خلجی کے احترام شریعت کا اعلان کرنے میں شعراء کی زبان اور عمارتوں کے کتبات اس حد تک ہم آہنگ ہیں کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سلطان کو شریعت اسلامیہ کا بڑا احترام تھا اور وہ عوام میں بھی اپنے ان جذبات احترام کا اظہار کرتا تھا۔

علائی دروازہ کی مغربی محراب کا کتبہ ملاحظہ ہو ——

"چوں ایزد تعالیٰ اعلیٰ اعلاءہ وسمی اسماءہ برائے احیائے مراسم ملت و اعزاز معالم شریعت خدایگان جہاں را برگزیدہ تا ہر لمحہ اساس دین محمدی استحکام می پذیرد و ہر لحظہ بنائے شریعت محمدی میگرداز برائے دوام مملکت و نظام سلطنت عمارت مسجد طاعات بحکم کلام ملک الارباب سواہ کہ انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ

---

[1] "فتوح السلاطین"، ص ۵۶۹

عصامی، محمد بن تغلق کے مخالف مورخوں میں ہے۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون "سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات"، مطبوعہ "برہان"، مارچ ۱۹۴۶ء

[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر تاراچند کی کتاب "Influence of Islam on Indian Culture" میں طرز تعمیر سے متعلق باب۔

(دالیوم الاخر) ابو المظفر محمد شاہ السلطان یمین الخلافتہ ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ الی یوم القیام رفع بناء جوامع الاسلام و انقاۃ مدی الزمان فی اشاعۃ الاحسان فی التاریخ فی الخامس عشر من شوال سنہ عشر و سبعمائتہ حضرت علیا خدایگان سلاطین مصطفی جاہ انصار ع لامر اللہ المخصوص بعنایت اکرم الاکرمین علاء الدنیا والدین غوث الاسلام والمسلمین معز الملوک والسلاطین القایم بتائید الرحمن ابو المظفر محمد شاہ سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ بنا این خیرات سنت و جماعت است عمارت فرمود"[۱]

جنوبی محراب کا کتبہ ہے ———

"بتوفیق بیہمتا و معاونت مینشی نشر امثال لمسجد اسس علی التقوی تعالی امرہ و شانہ و تعالی عدلہ و احسانہ بر مقتضی خیر ما مور امر ذلک دہجلت شطر المسجد الحرام محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما قال من بنی مسجد للہ بنی لہ بیتاً فی الجنۃ مجلس اعلیٰ خدایگان سلاطین زمان شہنشاہ موسیٰ فر سلیمان مکان راعی شرائط شریعت محمدی حامل مراسم ملت احمدی موکد معابر معالم و مساجد و موطد قواعد مدارس و معابد و ممہد بنیان رسوم مسلمانی و موسس مبانی مذہب نعمانی قالع اصول مردہ فجار و قاطع فروع قیدہ کفار و ہادم بناصوامع اصنام، رافع اساس مجامع اسلام مظہر امر اللہ) قاہر کفرہ رؤف متین قامع فجرہ روئے زمین فاتح قلاع ساحہ امکان ضابط بقاع راسخ بنیان المعتصم بجلال اللہ المنان ابو المظفر محمد شاہ السلطان یمین الخلافت مبین دین اللہ ناصر امیر المومنین مد اللہ ظلال

---

[۱] "واقعات دار الحکومت دہلی" از مولانا بشیر الدین مرحوم - ج - ۳ - ص ۱۸۳ - ۱۸۲

جلالہ علی رؤس العلمین الیٰ یوم الدین بنا فرمود ایں مسجد کہ مسجد جامع اولیا رو ملتہم ملت اتقیا و مجمع ملایک کرام و محضر ارواح انبیاء عظام است بتاریخ فی الخامس عشر من شوال سنہ عشر و سبعمائتہ ۔ در عہد ہمایوں حضرت علیا خدایگان سلاطین جہاں علاء الدنیا والدین العالی بجنود الظفر ابوالمظفر محمد شاہ السلطان یمین الخلافہ ناصر امیر المومنین مد اللہ ظلال خلافتہ علی رؤس العلمین الی یوم الدین ایں مسجد کہ بوصف ومن دخلہ کان آمنا موصوف است ۔ ایں مسجدے کہ در نسبت در رفعت چوں بیت المقدس مشہور است حضرت اعلیٰ خدایگاں فائض فضل شامل احسان المؤید بتائید الملک المنان علاء الدنیا والدین المظفر ابوالمظفر محمد شاہ السلطان یمین الخلافت ناصر امیر المومنین مد اللہ ظلال عظمتہ الی یوم الدین بصدق نیت و خلوص عقیدت بنا نمود“ [1]

شرقی محراب کا کتبہ دیکھئے اس میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں ——

” نافذ فرمان معلّی منابر اسلام محی آثار احکام بانی منابر مساجد طاعات رافع اساس معابر عبادات عامر بلاد و ہدایت غامر دیار .... مظہر قوانین جہاں مبرہن براہین اجتہاد .... حافظ حوانیت مسکرات ...... وغیرہ وغیرہ

اگر درباری شعراء کی زبان اور شاہی معمار کے ہاتھ سلطان کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں تو ہمیں یہ کہتے ہیں قطعاً تامل نہیں ہونا چاہئے کہ سلطان مذہب سے اپنا تعلق ظاہر کرتا تھا اور مذہب سے بے تعلقی کی وہ داستان جو برنی نے پیش کی ہے وہ حقیقت سے بہت بعید ہے دہلی کے کسی سلطان کی عمارتوں میں مذہب اور شریعت کا اتنا

[1] واقعات دارالحکومت دہلی ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۸۲ ۔ ۱۸۳

ذکر نہیں ملتا جتنا علاء الدین کے عہد کی عمارتوں میں ملتا ہے یہ کس طرح سے مان لینا چاہئے کہ جس چیز سے اس کو نفرت تھی اسی کا ذکر اس نے اس بلند آہنگی کے ساتھ شاہی عمارتوں میں کیا ہے ——— !

حضرت امیر خسروؒ نے خزائن الفتوح میں سلطان علاء الدین کی بنوائی ہوئی مساجد کا ذکر کیا ہے - ان مسجدوں کی عظمت اور مضبوطی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ———

"مساجد دیگر در شہر باستحکامے بنا فرمود کہ چوں در زلزلہ قیامت نہ بام ہزار چشمہ فلک بیفتد، گوشہ ابروئے ہیچ محرابے خم نگردد"[1]

سلطان نے متعدد مسجدوں کی مرمت کرائی۔[2]

عوام کے خیالات میں تبدیلی | ابتدائے عہد میں سلطان کے مذہبی خیالات کی طرف سے عوام میں ایک عام بے چینی اور بدظنی پھیل گئی تھی - اجراء مذہب کے متعلق اس کے خیالات عوام میں نہایت تشویش ناک انداز میں سنے گئے تھے۔ لیکن اس ارادہ کو ترک کرنے کے بعد سلطان نے اپنی زندگی میں اس قدر نمایاں تبدیلی کر دی کہ لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سلطان نے کبھی اس قسم کی حرکت بھی کی تھی - درستیِ اخلاق کے لئے اس کی مسلسل جدوجہد نے عوام پر بہت اچھا اثر کیا اسی زمانہ میں دربار سے احترامِ شریعت کی صدائیں بلند ہوئیں - امیر خسرو کی یہ آواز ایکطرف کانوں میں پڑی ؎

شاہِ محمدؐ کہ بتائید رائے کرد قوی شرع رسول خدائے

عمارتوں کی طرف نظر اٹھی تو "حامی شریعت" "حامل مراسم ملت احمدی" جیسے جلے نظر پڑے - تمام شکستہ مسجدوں اور محرابوں میں پھر ایک بار رونق اور آب و تاب نظر آنے لگی - برنی لکھتا ہے -

---

[1] خزائن الفتوح (علی گڑھ) ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۲۶ - ۲۵

"عجیب در عہد علائی بسیار عمارت استحکام	سلطان علاء الدین کے عہد حکومت میں
از مسجد و منارہ و حصار ہا و کاوانیدن	مسجدوں، مناروں، قلعوں اور حوضوں کی
حوض مشاہدہ و معاینہ شد کدام بادشاہ	جو مضبوطی اور استحکام دیکھنے میں آتا ہے،
را میسر شدہ است"	غور کرو یہ خصوصیت کسی بھی بادشاہ کو میسر ہوئی ؟

لوگوں کو سلطان سے عقیدت پیدا ہونے لگی۔ مغلوں کے حملوں کا کامیاب طریقہ پر سدباب ہونے پر عوام کو اطمینان وسکون بھی میسر تھا۔ ہر طرف سے سلطان کو فتح ونصرت کی خبریں ملتی تھیں ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——

"از توافق بخت دنیائی و اقبال زمینی کہ او را روئے نمودہ بود مہمات جہانداری او بر حسب دل خواست او بر می آمد و مقاصد اندیشیدہ و نا اندیشیدہ او مبیش اندتمنا در کنار او می افتاد و مردمان دنیا طلب کہ جملہ بزرگی ہا را متعلق حصول دنیا و برآمد مقاصد رضا دانند برآمد مقصود وجہانداری سلطان علاء الدین بر کرامت او حمل می کردند و سخنان او را کہ در برآمد مہمات ملکی او در فتح ونصرت لشکر از زبان او بیرون آمدی بر کشف و کرامات او تصور می نمودند"[1]

خواجہ امیر حسن علاء سنجری نے ایک قصیدہ میں اسی کشف وکرامت کی طرف شاید اشارہ کیا ہے ؎

---

[1] تاریخ فیروز شاہی برنی۔ ص ۲۴۴

خواجہ امیر حسن سنجری کہتے ہیں ؎

بلے ایں معجزات فتح شاہنشاہ دیں پرور
نہ در وہم فرد گنجد نہ در فہم خرد منداں (دیوان ص ۵۳۱)

امور ملک را ضابط رموز غیب را واقف عباد اللہ را راعی بلاد اللہ را سلطاں

(دیوان میر حسن - ص ۵۲۴)

آج ہم سلطان علاء الدین کی مذہب سے بے اعتنائی کا بار بار ذکر سنتے ہیں، اُس زمانہ کے عوام کے خیالات کا پتہ لگائیے تو اندازہ ہوگا کہ مذہبی حیثیت سے سلطان کی کس قدر عزت و منزلت کرتے تھے علاء الدین کی کرامت میں لوگوں کا اعتقاد اس کے مرنے کے بعد تک رہا حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی ؒ کے ملفوظات ——— "خیر المجالس" ——— میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان علاء الدین خلجی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک شخص بولا :-

"لوگ اس کی قبر پر زیارت کو جاتے ہیں اور اپنی مراد کی رسیمان اُن کے مزار پر باندھ آتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی حاجتیں برلاتا ہے - مجھ کو (حمید قلندر، جامع ملفوظات) اس موقع پر ایک قصہ یاد آیا - وہ بیان کیا - چند روز ہوئے کہ میں زیارت مزار کو سلطان علاء الدین کے گیا تھا - بعد نماز جمعہ کے پھر فاتحہ پڑھ کر جہاں لوگ کلاوہ باندھتے تھے گیا - اگرچہ مجھ کو کچھ حاجت نہ تھی مگر میں اپنے دستار سے ایک دھاگہ نکال کر وہاں باندھ آیا - رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی پکارتا ہے کہ سلطان علاء الدین کی قبر پر کون رسیمان حصول مراد کو باندھ گیا ہے اس کے چند بار پکارنے کے بعد میں روبرو گیا اور کہا - میں نے دھاگا باندھا ہے - بولا تیری حاجت کیا ہے بیان کر میں نے کہا کہ مجھے کوئی حاجت نہیں کہ بیان کروں -- اور دل میں گذرا کہ جو مجھے حاجت ہے اپنے شیخ کے روضہ مبارک سے خواستگاری کی ہے - شیخ کافی ہے غیر سے کیا چاہوں اسی حال میں بیدار ہو گیا"

(خیر المجالس)

یہ بیان نہ کسی قصیدہ گو کا ہے نہ کسی درباری مورخ کا یہ جذبات ہیں ایک ایسے مذہبی آدمی کے جس کو حکومت اور سلاطین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور جس کی حق گوئی اور صاف بیانی میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔

خدا کا خوف اور ڈر | سلطان علاء الدین خلجی کے متعلق یہ خیال کہ وہ مذہب سے بالکل بیگانہ اور بے تعلق تھا، ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے لیکن تاریخی شواہد اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ ہم دو واقعات اس کے زمانہ کے ایک سیاسی تاریخ اور ایک مذہبی تذکرے سے نقل کریں گے جن سے معلوم ہو گا کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے اعمال و کردار کے لئے خداوند عالم کو جواب دہ ہے۔ حکومت ایک ذمہ داری ہے جو خدا کی طرف سے اس کے سپرد کی گئی ہے اور اس کا فرض ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لئے کوشش کرے تاکہ قیامت کے دن اس کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

(۱) برنی نے قاضی مغیث سے سلطان کی جو گفتگو نقل کی ہے اس کے آخری حصہ پر پھر غور کیجئے ــــــ

"ہاں۔ اے مولانا مغیث میں ایک بات خدا تعالیٰ سے مناجات میں کہتا ہوں . . . ."

(ملاحظہ ہو مضمون کا ابتدائی حصہ)

(۲) "خیر المجالس" میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں ــــــ

"قاضی حمید الدین ملک التجار[1] جب ان دنوں اودھ میں گیا تو وہاں دعوت کی مجھ

---

[1] ملک التجار حمید الدین ملتانی، "جاکر خانہ" "پردہ دار" "کلید دار کوشک" اور "قاضی دہلی" کے عہدوں پر رہا تھا۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۵۲

کو بھی بلایا۔ جب بعد دعوت لوگ رخصت ہوئے تو میں اور وہ ایک جگہ بیٹھے تو یہ قصہ بیان کیا کہ ایک بار میں نے سلطان علاء الدین کو دیکھا پلنگ پر بیٹھے ہوئے سر برہنہ، پاؤں زمین پر، فکر میں غرق، مبہوتوں کی شکل۔ میں روبرو گیا۔ بادشاہ ایسا فکر میں تھا کہ کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے باہر آکر یہ حال ملک فرید تک سے کہا کہ آج میں نے بادشاہ کو اس طرح دیکھا ہے تم بھی چل کر دیکھو۔ کیا سبب اس فکر کا ہے۔ اُن کی صدا پروانگی تھی۔ وہ قاضی کے ساتھ اندر گیا۔ بادشاہ کو باتوں میں لگایا پھر عرض کی کہ امیر المسلمین سے کچھ عرض ہے حکم ہو تو بیان کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ قاضی حمید الدین ملک التجار آگے بڑھا اور قاضی نے کہا میں بھی اندر آیا تھا حضور کو دیکھا سر برہنہ پریشان حال فکر مند ہیں۔ سو آپ کو کس بات کی فکر تھی، بادشاہ نے کہا سنو مجھ کو چند روز سے یہ فکر ہے کہ میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر حاکم کیا ہے۔ اب کچھ ایسا کام کرنا چاہئے کہ مجھ سے تمام خلق کو نفع پہونچے۔ دل میں سوچا کیا کروں۔ اگر تمام خزانہ اپنا اور سو چند اس کا تقسیم کروں تب بھی خلق کو نفع نہ ہوگا۔ اب ایک بات سوچی ہے وہ تم سے کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تدبیر ارزانیٔ غلہ کی کروں کہ اس سے سب مخلوق کو فائدہ پہونچے گا اور ارزانیٔ غلہ کی تدبیر یہ ہے کہ بنجاروں کی نائکوں کو حکم دوں ....[۵]

سب کو معلوم ہے کہ علاء الدین کا اقتصادی نظام سیاسی ضروریات کا پیدا کیا ہوا تھا لیکن اس میں خدا کی عاید کردہ ذمہ داریوں کو کس قدر دخل تھا ——— !

---

[۵] خیر المجالس، ملفوظات حضرت چراغ دہلوی مرتبہ حمید قلندر ص ۱۸۹

(اردو ترجمہ مسلم پریس ۱۳۱۶ھ)

صوفیاء و مشائخ سے تعلقات | سلطان علاء الدین خلجی، صوفیاء و مشائخ کا بڑا معتقد تھا۔ اعجاز خسروی میں اس کا ایک فرمان امیر خسرو نے نقل کیا ہے جس سے اپنے عہد کے بزرگوں اور مشائخ سے اس کی عقیدت کا پتہ چلتا ہے[1]۔ مشکلات کے وقت وہ اکثر بزرگوں کی طرف رجوع کیا کرتا تھا۔ کڑہ میں اپنے چچا جلال الدین خلجی کے قتل سے قبل وہ ایک مجذوب کڑک سے ملا تھا۔ مجذوب نے پیشین گوئی کی تھی سہ

ہر کس کہ کند با تو جنگ — تن در کشتی سر در گنگ[2]

سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد صوفیاء و مشائخ کے پاس نہایت عقیدت اور ارادت کے ساتھ تحائف وغیرہ بھیجتا رہا۔ اُس کے ایک مشہور ہم عصر حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی بڑی شہرت اور عظمت کے بزرگ تھے۔ ایسے مست الست تھے کہ بڑے بڑے صاحبِ کمال درویشوں کی ہمت بھی اُن کے سامنے جانے کی نہ پڑتی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے چاہا کہ اُن کی خدمت میں کچھ نذر ارسال کرے۔ امراء سے مشورہ کیا گیا کہ کون شخص اس کام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کلام کرے۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ امیر خسرو کو روانہ کیا جائے۔ علاء الدین نے ایک امیر کو سلطان المشائخ کی خدمت بابرکت میں روانہ کیا اور اجازت چاہی۔ پہلے تو آپ نے تامل فرمایا لیکن پھر کچھ سوچ کر اجازت دے دی امیر خسرو نذر لے کر قلندر صاحب کے پاس پانی پت روانہ ہوئے۔ قلندر صاحب نہایت شفقت سے پیش آئے۔ خسرو کا کلام سنا، اور اپنا سنایا۔ بادشاہ کی نذر یہ کہہ کر قبول کی کہ اگر مولانا نظام الدین کا درمیان نہ ہوتا تو ہرگز قبول نہ کرتا۔ امیر خسرو جب روانہ ہونے لگے

---

[1] اعجاز خسروی جلد چہارم۔ ص ۱۱۶ [2] تاریخ فرشتہ جلد اول۔ ص ۱۵۰ (اردو نول کشور)

تو دو خط (ایک شیخ المشائخ کے نام دوسرا سلطان کے نام) لکھ کر دیئے۔ علاء الدین کے نام جو خط تھا اُس کی عبارت تھی ———

"علاء الدین کوتوالِ دہلی مقرر دانند کہ با بندگان خدائے نیکو کند"

جب دربار میں یہ خط پڑھا گیا تو بعض خوشامدی امراء نے کہا کہ بادشاہ کو ایسا لکھنا ترکِ ادب میں داخل ہے۔ سلطان نے کہا کہ غنیمت ہے کہ اس ذرۂ بے قدر کو اس مرتبہ کوتوالِ دہلی تو لکھا ہے، ایک مرتبہ تو شحنۂ[۱] دہلی لکھا تھا[۲]۔

قلندر صاحب کے علاوہ اپنے عہد کے اور بزرگوں سے بھی سلطان نہایت عقیدت سے پیش آیا۔ سہروردیہ سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی سے سلطان کو خاص عقیدت تھی۔ غلام سرور نے لکھا ہے ———

"سلطان علاء الدین با وجود غرور و استکبار کہ داشت بہ استقبال آنجناب سوار شدے و دو لکھ تنکہ بروز آمدن و پنج لکھ تنکہ بروقت ترخیص پیش کش کردے[۳]"

اس غرور و تکبر اور بڑائی کے باوجود جو سلطان کے سر میں سمائی ہوئی تھی، بنفس نفیس شیخ کے استقبال کے لئے باہر نکلا اور دو لاکھ کی رقم شیخ کی تشریف فرمائی کے احترام میں اس روز خرچ کی، پھر رخصت کے وقت پانچ لاکھ شیخ کی خدمت میں پیش کئے۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان علاء الدین خلجی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اس عہد کے سب

---

[۱] شحنہ۔ بکسر اول و سکون دوم و فتح نون مردیکہ از طرف بادشاہ برائے ضبط کارہا و سیاست مردم در شہر نصب کند بعرف آنرا کوتوال و حاکم گویند [۲] حیاتِ خسرو۔ مصنفہ مولانا سعید احمد مارہروی۔ ص ۱۸-۱۷
[۳] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد دوم۔ ص ۹۸۔

سے زیادہ نامور اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اُن کا نام پہنچ چکا تھا۔ غیاث پور میں اُن کی خانقاہ تھی۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا برنی نے لکھا ہے کہ غیاث پور حالانکہ دہلی شہر سے کافی فاصلہ پر تھا اور راستہ خراب تھا لیکن اس کے باوجود خانقاہ نظامیہ میں آنے جانے والوں کی وجہ سے سڑکوں پر ایک بھیڑ رہتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی میلہ ہو رہا ہے۔ ہزاروں فرسنگ سے لوگ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ سیر الاولیاء میں لکھا ہے ـــــــ

"در آں ایام کہ حق تعالیٰ سلطان المشائخ را جمہور عالمیاں جلوہ گری داد و کوس عظمت و کرامت او در گوش فلک و ملک رسید و خلقے از علمأ و مشائخ وامراء و ملوک بندہ آنحضرت گشتند ـــــــ حاسد از خار حسد در دل خلیدن گرفت بگوش بادشاہ عہد سلطان علاء الدین رسانیدند کہ سلطان المشائخ مقتدائے عالم شدہ است و ہیچ خلقے از خلق نیست کہ خاک او را در تاج سرنمی دارد . . . . زیرا چہ خلل ملک آید . ." [1]

جب آپ کی عظمت اور کرامت کا شہرہ آسمان پر فرشتوں کے کان تک پہونچا اور بڑے بڑے علماء و مشائخ اور امراء اور ملوک آپ کے غلام ہوئے . . . . . . تو حاسدوں کے دلوں میں حسد کا کانٹا چبھنے لگا اور انھوں نے بادشاہ وقت سلطان علاء الدین کو سکھایا کہ سلطان المشائخ مقتدائے عالم ہوتے ہیں . . . . ایسا نہ ہو کہ اُن کے سبب سے بادشاہ کی سلطنت میں خلل آئے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۳ - ۱۳۲

سلطان کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا ہو جانا کوئی غیر معمولی یا غیر فطری بات نہیں تھی اُس زمانہ میں کسی شخص کا اس قدر مقبول ہو جانا بادشاہوں کے لئے تشویش اور پریشانی کا باعث ہوا کرتا تھا۔ قطع نظر اس کے، سلطان کو یہ بھی یاد تھا کہ اُس کے چچا کے عہد میں ایک بزرگ ہی نے (سید مولا) اپنے مذہبی اقتدار کو کس طرح سیاسی اقتدار حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنا چاہا تھا اس لئے شبہات کا پیدا ہو جانا بالکل فطری بات تھی وہ ابھی یہ نہیں جانتا تھا کہ شیخ کا مرتبہ ان چیزوں سے بہت اعلیٰ وارفع تھا۔ اُن کی نظر میں اس دولت وحکومت کی کوئی وقعت یا اہمیت نہ تھی۔ سلطان نے اپنے شبہات کے پیش نظر شیخ کے خیالات کا پتہ لگانا چاہا۔ ایک دن اُس نے خضر خاں کے ذریعہ ایک خط سلطان المشائخ کی خدمت میں بھیجا۔ اور یہ لکھا کہ چونکہ آپ مخدوم عالم ہیں اس لئے مجھے مناسب ہے کہ ہر کام میں آپ کی رائے پر عمل کروں سلطان نے یہ سوچا تھا کہ اس خط سے شیخ کی سیاسی خواہشات کا اندازہ ہو جائے گا۔ خضر خاں جب یہ خط لیکر سلطان المشائخ کی خدمت میں پہونچا تو آپنے پڑھے بغیر فرمایا ——

"درویشاں را با کار بادشاہاں چہ کار	درویشوں کو بادشاہی امور سے کیا واسطہ
من درویشم، از شہر گوشہ گرفتہ ام	میں درویش ہوں، شہر کے گوشہ میں زندگی
و بہ دعا گوئی بادشاہ و مسلمانان مشغولم	بسر کرتا ہوں اور مسلمانوں اور بادشاہ کی
اگر بسبب این معنی بادشاہ بعد ازیں	دعا گوئی میں مشغول ہوں اگر بادشاہ اس بارے
چیزے مرا گوید من ازینجا ہم بردم ارض	میں پھر کہے گا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔
اللہِ واسِعَۃٌ"	اللہ کی زمین وسیع ہے۔

یہ جواب پاکر سلطان پورے طور سے مطمئن ہوگیا۔ اس کے سب شبہات دور ہو گئے امیر خورد نے لکھا ہے ——

چوں جواب خضرخاں بہ سلطان علاء الدین رسانید بادشاہ بغایت خوش شد و گفت من می دانستم کہ این معنے بہ حضرت سلطان المشائخ نسبتے ندارد فاما دشمناں می خواستند کہ مرا با مرداں خدا در اندازند و ایں معنی سبب خرابی ملک گردد"[1]

خضرخاں نے جواب خط حب سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان بے حد مسرور ہوا اور کہنے لگا میں تو پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس طرح کی باتوں کا حضرت سلطان شیخ المشائخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا البتہ دشمنوں نے یہ چاہا تھا کہ مجھے اللہ کے ایسے خاص بندوں کے متعلق سوءظن میں مبتلا کر دیں اور اس طرح یہ چیز ملک کی ابتری کا سبب بنے،

اس کے بعد سلطان نے شیخ کے پاس معذرت کے لئے آدمی بھیجا اور کہا۔

"من از معتقدان مخدوم جرأتے کردہ ام بخشیدہ باشند و اجازت کنند تا من بیایم و سعادت پائے بوس حاصل کنم"[2]

میں حضور کی خدمت میں جرأتِ بے جا کا مرتکب ہوا ہوں۔ آنجناب میری اس جرأت پر خط عفو کھینچ دیں اور حاضر خدمت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ قدم بوسی کی سعادت حاصل کر سکوں۔

اس گذارش کے جواب میں شیخ المشائخ سے فرما دیا کہ میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں میں غائبانہ دعا کرتا ہوں۔ اور غیبت میں دعا کرنے کا اثر بھی ہوا کرتا ہے[3] لیکن سلطان اس کے بعد بھی ملاقات پر مصر ہوا۔ حضرت نے کہلا بھیجا ـــــــــــــــ

---

[1] سیر الاولیاء (چرنجی لعل ایڈیشن)۔ ص ۱۳۴۔

[2] [3] سیر الاولیاء۔ ص ۱۳۵

"خانۂ این ضعیف دو در دارد اگر از یک در درآید من از در دیگر بیروں روم"[1]

میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک سے اندر داخل ہوگا تو میں دوسرے سے باہر چلا جاؤں گا۔

حالانکہ شیخ اور سلطان میں ملاقات نہ ہوسکی لیکن سلطان اپنی عقیدت کا ثبوت برابر دیتا رہا جب کوئی مشکل پیش آتی تو شیخ کی طرف رجوع کرتا اور اُن کی دعاؤں کا طالب ہوتا۔ علاءالدین نے وارنگل کی فتح کے لئے اپنا لشکر روانہ کیا، اور عرصہ تک مہم کی کوئی اطلاع، الاغ اور قاصدوں سے نہ معلوم ہوئی تو شیخ کی طرف رجوع کیا۔ برنی نے لکھا ہے ——

"سلطان متفکر خاطر گشتہ و خبر سلامتی لشکر از شیخ نظام الدین از روئے کشف و کرامات پرسید"

سلطان فکرمند اور پریشان خاطر ہو رہا تھا اور اس نے حضرت شیخ نظام الدین سے لشکر کی سلامتی کی خبر معلوم کرائی کہ وہ اپنے کشف سے کچھ بتائیں۔

ملک قرابیگ نے، قاضی مغیث الدین بیانہ کو شیخ کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا ——

---

[1] سیرالاولیار - ص ۱۳۵ -

برنی نے ملاقات نہ ہونے کی ذمہ داری سلطان پر رکھی ہے اور لکھا ہے :—

"سلطان علاءالدین را چہ دل تواں گفت و ادرا تا چہ حد بے التفات و بے باک تصور کراں کرد کہ از ہزار و دو ہزار فرسنگ مسافراں و طالباں در آرزوئے ملاقات شیخ نظام الدین می رسیدند و پیر و جوان و خورد و بزرگ و عالم و جاہل و عاقل و ناداں شہر دہلی بہ صد حیل و تدبیر خود را منظور نظر شیخ نظام الدین می گردانیدند و سلطان علاءالدین را گاہے در دل نہ گذشتہ کہ خود بر شیخ آید یا شیخ را بر خود طلبد و ملاقات کند" تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶۔

پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب "امیر خسرو دہلوی" میں برنی کے بیان کو زیادہ صحیح مانا ہے۔

چوں جواب خضر خاں بہ سلطان علاء الدین رسانید بادشاہ بغایت خوش شد و گفت من می دانستم کہ این معنے بہ حضرت سلطان المشائخ نسبتے ندارد فاما دشمناں می خواستند کہ مرا با مرداں خدا در اندازند و ایں معنی سبب خرابی ملک گردد"[1]

خضر خاں نے جواب خط حسب سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان بے حد مسرور ہوا اور کہنے لگا میں تو پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس طرح کی باتوں کا حضرت سلطان شیخ المشائخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا البتہ دشمنوں نے یہ چاہا تھا کہ مجھے اللہ کے ایسے خاص بندوں کے متعلق سوء ظن میں مبتلا کر دیں اور اس طرح یہ چیز ملک کی ابتری کا سبب بنے،

اس کے بعد سلطان نے شیخ کے پاس معذرت کے لئے آدمی بھیجا اور کہا۔

"من از معتقدان مخدوم جرأتے کردہ ام بخشیدہ باشند و اجازت کنند تا من بیایم و سعادت پائے بوس حاصل کنم"[2]

میں حضور کی خدمت میں جرأتِ بے جا کا مرتکب ہوا ہوں۔ آنجناب میری اس جرأت پر خط عفو کھینچ دیں اور حاضر خدمت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ قدم بوسی کی سعادت حاصل کر سکوں۔

اس گذارش کے جواب میں شیخ المشائخ نے فرما دیا کہ میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں میں غائبانہ دعا کرتا ہوں۔ اور غیبت میں دعا کرنے کا اثر بھی ہوا کرتا ہے[3] لیکن سلطان اس کے بعد بھی ملاقات پر مصر ہوا۔ حضرت نے کہلا بھیجا ــــــــــ

---

[1] سیر الاولیاء (چرنجی لعل ایڈیشن)۔ ص ۱۴۴۔

[2] [3] سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۵

"خانۂ این ضعیف دو در دارد اگر از یک در درآید من از در دیگر بیرون روم"[1]

میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک سے اندر داخل ہوگا تو میں دوسرے سے باہر چلا جاؤں گا۔

حالانکہ شیخ اور سلطان میں ملاقات نہ ہوسکی لیکن سلطان اپنی عقیدت کا ثبوت برابر دیتا رہا جب کوئی مشکل پیش آتی تو شیخ کی طرف رجوع کرتا اور اُن کی دعاؤں کا طالب ہوتا۔ علاء الدین نے وارنگل کی فتح کے لئے اپنا لشکر روانہ کیا، اور عرصہ تک مہم کی کوئی اطلاع، الاغ اور قاصدوں سے نہ معلوم ہوئی تو شیخ کی طرف رجوع کیا۔ برنی نے لکھا ہے ——————

"سلطان متفکر خاطر گشتہ و خیر سلامتی لشکر از شیخ نظام الدین از روئے کشف و کرامات پرسید"

سلطان فکر مند اور پریشان خاطر ہو رہا تھا اور اس نے حضرت شیخ نظام الدین سے لشکر کی سلامتی کی خبر معلوم کرائی کہ وہ اپنے کشف سے کچھ بتائیں۔

ملک قرابیگ نے، قاضی مغیث الدین بیانہ کو شیخ کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا ——————

---

[1] سیر الاولیاء۔ ص ۱۳۵۔

برنی نے ملاقات نہ ہونے کی ذمہ داری سلطان پر رکھی ہے اور لکھا ہے:——

"سلطان علاء الدین را چہ دل تواں گفت و اور اتا چہ حد بے التفات و بے باک تصور کراں کرد کہ از ہزار و دو ہزار فرسنگ مسافراں و طالباں در آرزوئے ملاقات شیخ نظام الدین می رسیدند و پیر و جوان و خورد و بزرگ و عالم و جاہل و عاقل و ناداں شہر دہلی بہ صد حیل و تدبیر خود را منظور نظر شیخ نظام الدین می گردانیدند و سلطان علاء الدین را گاہے در دل نہ گذشتہ کہ خود بر شیخ آید یا شیخ را بر خود طلبد و ملاقات کند"، تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶۔

پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب "امیر خسرو دہلوی" میں برنی کے بیان کو زیادہ صحیح مانا ہے۔

"خاطر من از نا رسیدن لشکر اسلام ملتفت شدہ است شمارا غم اسلام بیش از من ست کہ اگر بنور باطن خبرے از حال لشکر شمارا روشن شدہ باشد بشارتے بمن بفرستید"

لشکر اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے میرا دل دہیں پڑا ہے یہ ظاہر ہے آپ کو اسلام اور اس کی عزت و حرمت کا غم مجھ سے زیادہ ہے اگر بذریعہ نور باطن لشکر کی حالت و کیفیت کی خبر آپ پر روشن و منکشف ہو، مجھے اس کی بشارت سے مطلع فرمایئے۔

پیغام لے جانے والوں کو ہدایت کی شیخ کی زبان مبارک سے جو حکایت یا سرگزشت اس پیغام کے جواب میں سنیں وہ من وعن اس کے پاس پہونچائیں۔ سلطان کو شیخ المشائخ کا یہ مخصوص انداز معلوم تھا کہ ایسے سوالات کے جواب میں وہ اکثر کوئی پرانی حکایت سنا دیا کرتے تھے چنانچہ جب یہ دونوں پیغامبر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے زمانۂ گذشتہ کے کسی مشہور بادشاہ کی فتح کا قصّہ سنانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا ——

"این فتح چہ باشد کہ ما فتح ہائے دیگر را امید داریم"

جب یہ خبر سلطان کو پہنچائی گئی تو بے حد خوش ہوا۔ اور بقول برنی ——

"دستار چہ خود را بر دست گرفت و در گوشہ دستار چہ گرہ زد و گفت کہ من کلمات شیخ را بجان گرفتم و می دانم کہ سخن از زبان شیخ بہرزہ بیروں نیامدہ است، وارنگل فتح شدہ است و مارا فتح ہائے دیگر ہم بہ نظر می باید داشت"

اپنی پگڑی ہاتھ میں لی اور اس کے ایک کونے میں گرہ دی پھر کہنے لگا میں نے کلمات شیخ اپنے پلے سے باندھ لئے ہیں مجھے یقین ہے کہ شیخ کی زبان سے جو بات نکلی ہے وہ یوں ہی بے معنی نہیں ہے، ورنگل فتح ہو چکا ہے اور ہمیں اس کے علاوہ دیگر فتوحات پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے

کچھ عرصہ بعد جب وارنگل فتح ہو جانے کی خبر ملی تو سلطان کا اعتقاد سلطان المشائخ میں بہت بڑھ گیا۔ برنی کا بیان ہے ـــــ

"وسلطان را اعتقاد در کرامت و بزرگی شیخ بر مزید گشت و اگرچہ سلطان علاء الدین را با شیخ نظام الدین قدس روحہٗ ملاقاتے نشد فاما در تمامی عصر او از زبان سلطان درباب شیخ سخنے بیروں نیامد کہ دراں سخن شیخ بنوعے آزردہ شود و باآنکہ دشمناں و حاسداں خدمت شیخ از بسیارے اعطائے شیخ و کثرت آمد و شد خلق بآستان شیخ و اطعام و اکرام عام شیخ بعبارتے موحش در سمع او چناں غیورے می رسانیدند و لیکن او بسمع سخن دشمناں و بدگفت حاسداں التفات نکرد و در سنوات آخر عہد خود بغایت مخلص و معتقد شیخ شد معذلک میاں ایشاں ملاقاتے اتفاق نیفتاد"[1]

غرض سلطان کو روز بروز شیخ نظام الدین اولیاء سے عقیدت و ارادت بڑھتی رہی۔ فرشتہ نے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے اس کی بے پناہ عقیدت کا پتہ چلتا ہے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت کی خانقاہ میں سماع ہو رہا تھا۔ حدیقہ سنائی کے یہ اشعار ـــ

پیش منما جمال جہاں افروز	در نمودی برا سپند بسوز
آں جمال تو چیست ہستی تو	واں سپند تو چیست مستی تو

سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ کو وجد آگیا۔ قرابیگ جو سلطان کے "اخص الخواص" میں سے تھا

---

[1] تاریخ فیروزشاہی۔ ص ۳۳۲ - ۳۳۱

سجن رائے نے لکھا ہے ــــ "سلطان اگرچہ بظاہر ملاقات شیخ نمی کرد اما استمداد از باطن ایشاں موطن نمودہ بارسال رسل و رسائل و اتحافات تحف و طائف مراسم اخلاق و اعتقاد بجای آورد ـــــ"
ـــــ خلاصۃ التواریخ۔ ص ۲۲۸ (ظفر حسن ایڈیشن)

وہاں موجود تھا، اس نے یہ اشعار لکھ لئے جب بادشاہ کے پاس گیا تو یہ اشعار سنائے سن کر علاء الدین کا یہ عالم ہوا کہ ———

"ہر بار می خواند و بر چشم می مالید و تحسین می کرد"

قرابیگ نے عرض کیا۔ حضور شیخ سے اس قدر عقیدت کے باوجود بھی شیخ سے ملاقات نہیں کرتے۔ سلطان نے جواب دیا ———

"اے قرابیگ ترک، ما بادشاہیم، از سرتاپا آلودۂ دنیا و بدیں آلودگی شرم میداریم کہ آں چناں پاکے را بنیم، باید کہ خضر خاں و شادی خاں را کہ جگر گوشگان من اند بخدمت شیخ بردہ مرید گردانی و دولک تنکہ شکرانہ بدرویشان جماعت خانہ رسانی"[1]

شاید ان ہی تعلقات پر نظر رکھتے ہوئے سید امیر علی نے اپنی کتاب spirit of Islam میں سلطان علاء الدین کو شیخ المشائخ کا مرید بتایا ہے[2] لیکن یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کسی بزرگ کا مرید نہیں تھا بلکہ بقول پروفیسر محمد حبیب ———

"In his own erratic way he had made up his mind to bend his sinful knees before God alone."[3]

---

[1] فرشتہ مقالہ دوازدہم - ص ۳۷ (مطبوعہ کانپور) [2] ص ۱۷۱ (فٹ نوٹ)

[2] بعض تذکروں میں سلطان کے مرید ہونے کے متعلق روایتیں درج ہیں لیکن یہ سب غلط اور ناقابل اعتبار ہیں گلزار ابرار میں محمد غوثی نے لکھا ہے کہ علاء الدین حضرت بو علی شاہ قلندر کا مرید تھا (ص ۱۰۱) خزینۃ الاصفیاء میں غلام سرور نے اس کو شیخ ضیاء الدین رومیؒ کا مرید بتایا ہے ان دونوں روایتوں کی تصدیق معاصر تذکروں سے نہیں ہوتی (جلد ۲ - ص ۴۶)

[3] "امیر خسرو"۔

ہندوؤں سے تعلقات اور ان کے ساتھ برتاؤ | جب کسی سلطان کے مذہبی رجحانات کا ذکر کیا جاتا ہے تو معاً لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اس بادشاہ کے عہد میں غیر مسلموں پر ضرور ظلم و ستم روا رکھا گیا ہوگا۔ گویا مذہب، ظلم اور ناانصافی ہم معنی الفاظ ہیں لیکن یہ خیال حد درجہ غلط اور گمراہ کن ہے قرونِ وسطیٰ میں ہندو اور مسلمان دونوں فرمانرواؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ رعایا خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو، اس کے ساتھ ناانصافی یا ظلم کرنا اپنی حکومت کی بنیادیں کمزور کرنا ہے۔ ناانصافی کے ساتھ کوئی حکومت نہیں چل سکتی۔ اٹھارویں صدی میں اسی نظریہ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے صاف فرمادیا تھا کہ حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے لیکن ناانصافی کے ساتھ نہیں[1]۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت میں مختلف مذہبی طبقوں کے ساتھ انصاف اور رواداری کا سلوک کرنا، ایک اخلاقی اور مذہبی ذمہ داری تصور کیا ہے۔ محمد عوفی نے اپنی کتاب جوامع الحکایات میں گجرات کے ایک ہندو راجہ کے انصاف کا قصہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصاف اور رواداری کا بلند ترین تخیل ہندو راجاؤں کے ذہن میں بھی تھا۔ یہ قصہ ذرا طویل ہے اور بلاواسطہ ہماری بحث سے متعلق نہیں لیکن اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور قرونِ وسطیٰ میں مذہب کی صحیح حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اس لئے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے ——

محمد عوفی لکھتا ہے ——

"ایک ایسی ہی حکایت میں نے اُس وقت بھی سنی تھی جب مجھے کھمبایت جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ شہر گجرات نہر والہ کے اضلاع میں سے ہے۔ اور ساحل دریا پر آباد ہے یہاں خوش عقیدہ، پاک مذہب اور مسافر نواز سنی مسلمانوں کی جماعت سکونت پذیر ہے زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے مگر ایک مختصر سی تعداد میں آتش پرست بھی بستے ہیں۔

---

[1] ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مسلمان جماعت کی زبانی سننے میں آیا کہ رائے جے سنگھ کے عہد حکومت میں، اس شہر میں ایک جامع مسجد تھی جس کے مینار پر چڑھ کر موذن اذان دیا کرتا تھا ایک مرتبہ پارسیوں کے اکسانے سے کافروں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور اسّی مسلمان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے مسجد جلا دی اور مینار مسمار کر دیا۔ مسلمانوں کا خطیب جس کا نام علی تھا بھاگ کر نہروالہ آیا اور راجا تک فریاد پہنچانے کی کوشش کی لیکن ہندو درباریوں نے مذہبی تعصب کی بنا پر راجا تک اس کی رسائی نہ ہونے دی۔

ایک دن راجا نے شکار کا ارادہ کیا خطیب غریب کو موقع ہاتھ آیا راجا کی شکار گاہ کے راستہ میں ایک درخت کی اوٹ میں جا کر بیٹھ رہا۔ راجہ کی سواری پہنچی تو جھپٹ کر سامنے آیا اور راجہ کو قسمیں دیں کہ ہاتھی ٹھیرا لے اور اس کی گزارش سن لے۔

جب راجا نے ہاتھی ٹھیرایا تو خطیب نے کھمبایت کے دردناک حادثہ کی پوری تفصیل جسے وہ ہندی اشعار کی صورت میں لکھ کر لایا تھا راجا کے گوش گزار کی یہ سرگذشت سن کر راجا نے خطیب کو ایک مصاحب کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اس کی حفاظت اور خاطر مدارات کی جائے اور دوبارہ حکم ملنے پر پیش کیا جائے۔

شکار سے لوٹنے پر راجا نے اپنے وزیر کو بلا کر کہا کہ میں تین دن تک نہ تو محلات سے باہر نکلوں گا اور نہ کسی کو باریابی کی اجازت دوں گا۔ اس لئے تم امور سلطنت کی اچھی طرح نگرانی رکھنا اور مجھے تنگ نہ کرنا"

اسی رات راجہ جے سنگھ ایک سانڈنی پر سوار ہو کر تن تنہا کھمبایت کی طرف چل پڑا۔ نہروالہ سے کھمبایت چالیس فرسنگ کی مسافت پر ہے۔ راجہ نے ایک رات اور ایک دن برابر سفر کیا اور دوسرے دن شام کو کھمبایت آپہنچا۔ بازکیوں کا بھیس

بدلی تلوار گلے میں ڈال رات کے اندھیرے میں شہر کے اندر داخل ہوگیا۔ شہر کے بارونق حصّوں اور بازاروں میں سرموڑ اور ہرناکے پر ٹھیر ٹھیر کر سن گن لی اور پوچھ گچھ کی۔ ہر ایک کی زبانی یہی سننے میں آیا کہ مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا اور بیچارے بے گناہ اور بے قصور مارے گئے۔ مسلمانوں کی مظلومی کا یقین ہونے پر راجا شہر سے نکلا۔ دریا کے پانی سے اپنی چھاگل بھری اور نہروالہ کی طرف روانہ ہوا۔ تیسرے روز رات کے وقت اپنی راجدھانی میں آپہنچا۔

صبح کو دربار ہوا .... خطیب نے اپنا استغاثہ پیش کیا تو کافروں نے خطیب کو جھٹلاتے اور معاملہ کو دبانے کی کوششیں کیں۔ یہ رنگ دیکھ کر راجا نے اپنے آبدار کو حکم دیا کہ "رات کو پانی کی جو چھاگل تمہیں دی تھی وہ لاؤ اور درباریوں کو اس کا پانی چکھاؤ !"

درباریوں نے چھاگل کا پانی چکھا تو کھاری ہونے کی وجہ سے پہچان گئے کہ سمندر کا پانی ہے۔

اب راجا نے ان کو بتایا کہ "مذہبی اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے تم میں سے کسی پر اعتماد نہ تھا اس لئے میں خود کھمبایت جاکر مسلمانوں کی مظلومی اور دوسرے فریق کی ستمگاری کا حال معلوم کرکے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس جماعت پر جو میری پناہ میں ہو، ظلم کیا جائے"

یہ کہہ کر اُس نے .... سزا دی .... ساتھ ہی ایک لاکھ بالوترے عنایت کئے کہ مسجد اور مینار نئے سرے سے تعمیر کئے جائیں"[1]

---

[1] جوامع الحکایات۔ مترجمہ اختر شیرانی۔ (دہلی) جلد اول ص ۴ - ۶

اس تمام گفتگو سے مطلب یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرمانروا یہ سمجھتے تھے کہ ناانصافی اور ظلم سے خواہ وہ غیر مذہب والے کے ساتھ کی جائے سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی زندگی کے سرچشمہ زہرآلود ہو جاتے ہیں اور کوئی سیاسی نظام بغیر عدل و انصاف کے قائم نہیں رہ سکتا۔

سلطان علاء الدین خلجی کے متعلق بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت ظلم و ستم سے کام لیا اور ان کو انتہائی ذلت میں رکھا اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ برنی کے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں افسوس ہے کہ ان مصنفوں نے برنی کو سمجھنے سے پہلے اس کے بیانات کا غلط مفہوم پیش کرنا شروع کر دیا۔ مورلینڈ (moreland) نے اپنی مشہور فاضلانہ تصنیف Agrarian System during the Muslim Rule in India میں نہایت عالمانہ طریقہ پر اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں جہاں بھی ہندو کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس سے اس کی مراد کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہے بلکہ ہندو سے اس کا مطلب خوط، چودھری، مقدم اور وہ دیگر طبقے ہیں جو ملک کے اقتصادی نظام میں بڑے طاقتور ہو گئے تھے اور جن پر سختی کا برتاؤ ایک سیاسی تقاضہ تھا۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے بھی اپنے ایک فاضلانہ مقالہ An Introduction to the Study of Medieval Indi میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ عام خیال کہ ہندوؤں کو گھوڑے پر چڑھنے اور عمدہ کپڑے پہننے کی علاء الدین نے ممانعت کر دی تھی، برنی کے مفہوم کو غلط سمجھنے سے پیدا ہوا ہے [1]

علاء الدین نے سیاسی مصالح کی بنا پر عوام سے دولت کی فراوانی کو ختم کرنا چاہا۔ اس

---

[1] Introduction: p. 4 Aligarh Magazine,

کا خیال تھا کہ ملک میں متواتر بغاوتوں کا سبب یہی دولت ہے۔ خود اس کا تجربہ تھا کہ اس نے اسی کی مدد سے دہلی کا تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اس نے لوگوں میں دولت کی زیادتی کو روکا۔ مسلمانوں کے تمام ان طبقوں سے جو دولت مند تھے دولت حاصل کر لی گئی اس کے بعد ہندوؤں کے اُن تمام طبقوں سے جو دولت مند تھے دولت لے لی گئی۔ ڈاکٹر تریپاٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ جب اس نے مسلمانوں کو ہی اُن کی دولت سے محروم کرنے سے نہ بخشا تو پھر وہ ہندوؤں کو کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔[1] اس کا یہ اقدام بلا امتیاز مذہب و ملت صرف سیاسی مصالح کی بنا پر تھا ڈاکٹر ایشور ٹوپ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیاسی مصالح، نہ کہ Inquisition کا جذبہ، سلطان کے ان اقدامات کا محرک تھا جن کو غلط طور سے مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔[2]

علاء الدین خلجی نہایت منصف مزاج اور عدل گستر بادشاہ تھا۔ خسرو نے لکھا ہے ؎

کہ معدلت سوئے درویش و شاہ بیک چشم بیند چو خورشید و ماہ

(آئینہ سکندری ص ۱۷)

ہندوؤں کے ساتھ اس نے نہایت عمدہ سلوک کیا تھا۔ ملک نایک، ایک ہندو جنرل اس کی فوج کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔[3] مصنف تاریخ مبارک شاہی علاء الدین خلجی کے محل میں ایک جشن منانے کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔

"و اہل طرب از مسلم و ہنود بقیہا نغمہ ساز گشتند و فلک را در چرخ آوردند"[4]

---

[1] Some aspects of Muslim Administration Dr Tripathi

[2] Politics in Pre Mughal Times Dr. I. Topa.

[3] Prof: Habib: Introduction to medieval India

[4] تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۷۹

ہندو جوتشیوں کی جو قدر ہوتی تھی اس کے متعلق برنی کا بیان ہے ــــــــــــ

"و منجمان کہ از ہمہ دریں علم بیشتر بودند چنداں صدقات از سلطان علاؤالدین داز حرم او می یافتند کہ ایشاں را ازاں اسباب ہا می شد و در شہر از مسلمانان و ہندواں منجم بسیار بودند"[1]

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ سنسکرت علاؤالدین خلجی کے عہد کے آخر تک سکوں پر برابر درج ہوتی رہی - حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون "آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت" میں بتایا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے نہ صرف سکوں میں بلکہ امورِ مالیات اور طرزِ زندگی میں ہندوستانی ماحول کا لحاظ کیا ہے"[2]

خاتمہ | حقیقت یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے مذہبی معتقدات کو بہت حد تک غلط سمجھا گیا ہے یہ غلط فہمی برنی کے بیانات سے پیدا ہوئی اور پھر اس طرح سے عام ہو گئی کہ اس کی تردید کرنا بھی مشکل معلوم ہونے لگا - برنی کے بعد جن مورخین نے برنی سے استفادہ کیا ہے انھوں نے علاؤالدین کی مذہب سے بے تعلقی کی داستان نہایت بلند آہنگی سے بیان کی ہے اس کے برخلاف تمام وہ مورخین جو برنی کے بیانات سے متاثر نہیں ہوتے وہ سلطان کے مذہبی جذبات کی بے حد تعریف کرتے ہیں - یہ حقیقت ہے کہ وہ ہندوستان کے باہر "مجاہد دین دار" مشہور تھا[3] - عصامی اس کی مذہبی دلچسپیوں کی تعریف کرتا ہے - حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے "مذہبی تقدس" کے باعث عوام میں بے حد مقبول تھا اور لوگ اس کے مزار پر جا کر ریسمان باندھتے تھے عالمگیر کے عہد کا ایک ہندو مورخ سبحن رائے اس کے متعلق لکھتا ہے ــــــــــــ

---

[1] تاریخ فیروز شاہی - ص ۳۶۴ - [2] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء - ص ۳۱ [3] وصاف

"سلطان در ریاضت وطاعت واداے مفروضات ونوافل وصیام وتقدیم مراسم اسلام آنقدر تقید داشت کہ اورا از جنس ملائک گفتندے"[1]

سمجھ میں نہیں آتا کہ برنی نے کیوں اس قدر بلند آہنگی سے اس کی مذمت کی ہے۔ یحییٰ۔ تاریخ مبارک شاہی کا مصنف، محمد بن تغلق کے سلسلہ میں، علاء الدین کی مذہب دوستی کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

"دریں ایام تمام سعی وکوشش وجد وجہد سلاطین ماضیہ انار اللہ برہانہم کہ براے ظہور اسلام وشفقت دین وخصب نعمات وامن طریق وآسائش خلق وآرامش ملک وآبادانی ولایت وضبط اقالیم کردہ بودند خصوصاً سلطان علاء الدین خلجی نور اللہ مرقدہٗ آں ہمہ بہ ضعف اسلام وفتور دین وقصور اسباب وفساد متمرداں وخوف راہہا ومحنت خلق وشورش ملک واقالیم بدل گشتہ بود وظلم بجاے عدل وکفر بجاے اسلام استحکام یافتہ"[2]

اس تمام گفتگو سے ہمارا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ وہ "اسلام کا نمایندہ" تھا بلکہ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس کی مذہب سے بے تعلقی کی جو داستان زبان زد خاص عام ہے وہ تاریخی شواہد کے خلاف ہے۔

---

[1] خلاصۃ التواریخ [2] تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۱۰۳ (کلکتہ)

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

جو ۱۹۴۶ء کی مطبوعات میں سے ہے طبع ہو کر پریس سے آگئی ہے قیمت غیر مجلد چار روپے ۱۹۴۶ء کی دوسری اہم کتاب "ترجمان السنۃ" ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ بھی عنقریب طبیع ہو کر پریس سے آرہی ہے۔ قیمت غیر مجلد عـہ، مجلد عـہ

قرآن اور اس کا تصوّرِ غیب

از مولانا سیّد ابوالنظر رضوی امروہوی

اس مضمون سے متعلق چند باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔

(۱) فاضل مقالہ نگار نے یہ مقالہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے مضمون "فلسفہ اور قرآن" سے متاثر ہو کر بظاہر اُس کی تردید میں لکھا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عام مفسّرین کی پیروی میں "غیب" سے مراد وہ اسباب و مسببات ہیں جن سے معاشی انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "غیب" کا لفظ دونوں پر حاوی اور مشتمل ہے اس لیے کسی ایک کا مراد لینا دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک انسانی زندگی کا روحانی اور دینی پہلو زیادہ اہم ہے اور اس کے برخلاف سید صاحب اس فکر میں ہیں کہ وہ ہیگل اور مارکس کے معاشی تصورات کو قرآن مجید کی روشنی میں جانچیں اور یہ دیکھیں کہ دنیا میں معاشی انقلاب پیدا کرنے کے لئے قرآن کس قسم کا نظریۂ حیات پیش کرتا ہے چنانچہ موصوف عرصہ سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا انھوں نے اس مقالہ میں بھی ذکر کیا ہے اس میں ان کی کوشش یہ ہی ہے بہرحال ہم یہ مضمون اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ اس سے "غیب" کے لفظ کی معنوی وسعت پر روشنی پڑتی ہے نہ اس لئے کہ اس سے ڈاکٹر صاحب کے مضمون کی تردید ہوتی ہے۔

(۲) سید صاحب نے جس طرح فلسفہ کی تضحیک کی ہے وہ سنجیدہ نگاری کے اصول کے خلاف ہے دنیا میں ہر ہر انقلاب کسی نہ کسی فلسفہ سے ہی پیدا ہوا ہے اور خود مذہب بھی ایک فلسفۂ حیات ہی ہے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے جو مذہب، فلسفہ، تصوف اور جدید ترین علوم سے بہرۂ وافر رکھتے ہیں "فلسفہ اور قرآن" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس سے اُن کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ فلسفہ کی غایت تک پہنچ سکنا انسانی شعور کے لئے ناممکن اور قرآنی دعوے کے مطابق خدا کے لئے سہل ترین ممکنات میں ثابت کیا جائے۔

(۳) سید صاحب نے کئی جگہ "انتہائی مہیب" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون اس وقت سامنے نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ٭

٭ چیز مراد لیں جو عالم آخرت سے تعلق رکھتی ہیں اور سید صاحب کے نزدیک "غیب" سے مراد وہ

ڈاکٹر موصوف نے بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ ترکیب ہے عجیب و غریب۔ کیونکہ فلسفہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ "لا تشکیک فی الماہیات" مدیر برہان

انسانی شعور آج تک کسی ایک چیز کی بھی انتہائی ماہیت دریافت نہ کرسکا اور اس میں بھی شک نہیں کہ خدا ضرور جانتا ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا بنیادی تصور قابل بحث و گفتگو نہیں ہوسکتا۔ شاید اس ہی توقع پر ڈاکٹر صاحب نے پورے اطمینان سے سیر حاصل بحث فرمائی ہے لیکن اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بیشک خدا ایک ایک ذرہ کی انتہائی حقیقت سے باخبر ہے۔ لیکن قرآن میں جس "علم غیب" کو خدا کی طرف سے منسوب کیا گیا ہے۔ وہ فلسفہ کی غایت سے کوئی بھی نسبت نہیں رکھتا۔ فلسفہ کی اُدھیڑ ایک دماغی مالیخولیا ہے جس کا نہ کوئی علاج ہے نہ کوئی نتیجہ۔ آپ خود ہی سوچئے کہ اگر ہمارے اس ذوقِ طلب کی تسکین کا سامان ہو جائے کہ اشیاء کی حقائق کیا ہیں ؟ تو کیا ہم زندگی کے کسی گوشہ کو نشوونما دے سکنے کی صلاحیت پیدا کرسکیں گے ؟ کیا اخلاقی اور معاشی نظامِ زندگی بہتر ہو جائے گا ؟ کیا دوزخ کے عذاب سے نجات اور جنت کے عیشِ دوام سے معانقہ کیا جا سکے گا؟ آخر شخصی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جو ہماری اس جدوجہد سے جگمگا سکے دراصل انتہائی حقیقت کی دریافت ایک مراق ہے۔ ایک حد تک اس ذوق سے انسانی علوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اُس کے دماغ کی صیقل ہوسکتی ہے۔ لیکن جب یہ ذوقِ جستجو انتہائی ماہیت دریافت کرنے سے ادھر ٹھہرنے کے لئے تیار ہی نہ ہو تو لاعلاج مرض کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا خالق ہونے کی حیثیت سے کسی چیز کی انتہائی ماہیت کا علم خدا کے لئے ضروری ہے مگر ہمارے لئے نہیں۔ اس ہی لئے خدا نے کبھی انسان کو الہامی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعہ انتہائی ماہیت کا علم دینا پسند نہ کیا نہ اپنے علم کے بارے میں کوئی ایسا دعویٰ کیا ہے جس کا ثبوت نہ دے دیا گیا ہو چنانچہ جس علمِ غیب کا دعویٰ کیا گیا تھا وہ عالمِ شہادت کے ہر در و دیوار سے نمایاں ہو کر رہا۔ انتہائی ماہیت کو خدا جانتا ہے قرآن اور احادیثِ نبوی میں کہیں اس سے تعرض نہیں کیا گیا

پھر یہ کس طرح فرض کر لیا گیا کہ فلسفہ کی انتہائی ماہیت اور قرآن کا علم غیب ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ غالباً ہمارے ڈاکٹر صاحب کو حسب ذیل آیتہ سے غلط فہمی ہوئی

قُل لَّا یَعْلَمُ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ
کہہ دیجیے کہ غیب کو خدا کے سوا کوئی ہستی جو اس زمین و آسمان میں موجود ہو نہیں جانتی

ڈاکٹر صاحب نے غالباً خیال کیا ہوگا کہ ایسی چیز جسے کائنات کی کوئی ہستی نہ جانتی ہو۔ انتہائی ماہیت ہی ہو سکتی ہے ورنہ انسانی شعور و تجربہ کس چیز کا علم نہیں رکھتا۔ حالانکہ اس روشن زندگی کا ہر گوشہ تاریک ہے یہاں ہر عالمِ شہادت میں ایک عالمِ غیب مضمر ہے انسان ہر چیز کو جانتا ہے اور کسی چیز کو بھی نہیں جانتا۔ علم و تجربہ کی روشنی میں ہم جو قدم بھی اٹھاتے ہیں اُس کے متعلق بھی نہیں جانتے کہ گہرے غار میں پڑے گا یا پتھر کی چٹان سے ٹکرائے گا پھر بھی اگر شبہات کی گنجائش محسوس کی جا رہی ہو تو حسب ذیل آیات پر غور فرمائیے۔

(۱) قرآن کی ایک آیتہ ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے پیش فرمایا تھا

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِن رَّسُولٍ (پ ۲۹ ع ۱۲)
ان دیکھی باتوں کو جاننے والا ہے کسی کو ان دیکھی باتیں نہیں بتاتا مگر جس پیغمبر کو منتخب کر لیا ہو۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ آیت پوری نقل کر دی گئی ہوتی تو کم از کم غیب کا انتہائی ماہیت سے متعلق نہ ہونا تو یقینی ثابت ہو جاتا پوری آیتہ ملاحظہ فرمائیے

حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ
یہاں تک کہ جب اُس پہلو کو دیکھیں گے جس کا وعدہ کیا گیا تھا تو بہت جلد انھیں علم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں

يَجۡعَلُ لَهٗ رَبِّيٓ أَمَدًا عَالِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا
يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖٓ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى
مِنۡ رَّسُولٍ فَإِنَّهٗ يَسۡلُكُ مِنۡ بَيۡنِ
يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا لِيَعۡلَمَ أَنۡ
قَدۡ أَبۡلَغُوا رِسَالٰتِ رَبِّهِمۡ وَأَحَاطَ بِمَا
لَدَيۡهِمۡ وَأَحۡصٰى كُلَّ شَيۡءٍ عَدَدًا

اور گنتی میں تھوڑے ۔ کہہ دیجئے کہ جس بات کا
وعدہ کیا گیا ہے وہ نزدیک ہے یا کچھ مدت
صرف کرنا پڑے گی ۔ میں نہیں جانتا ۔ خدا ان
دیکھے نتائج کو جانتا ہے کسی کو اس کی خبر
نہیں دیتا مگر جس پیغمبر کو پسند کرتا ہو ۔ جب
وہ ان دیکھی باتیں بتانے کے لئے کسی پیغمبر
کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کے ذہن و کردار
کی نگرانی کرنے والے آگے پیچھے مقرر کر دئے
جاتے ہیں تاکہ اس چیز کا ٹھیک ٹھیک علم
ہوتا رہے کہ نشو و نما دینے والے کے احکامات
اور پیغامات قوم تک پہنچا دئے گئے یا نہیں
اور جو کچھ ان پیغمبروں کے پاس تھا اس پر
پورا پورا عمل کیا گیا یا نہیں ۔ اور ہر چیز کی گنتی
گن لی گئی یا نہیں ۔

اس آیۃ کا ٹھیک ٹھیک مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس چیز کو بھی یاد رکھیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنی پارٹی والوں کے لئے نجات و فلاح کا وعدہ فرمایا تھا اور منکرین کے لئے تاریخی تباہی کا ۔ تاکہ بعد از مرگ زندگی میں پیدا ہونے والے نتائج کا بھی اس طرح یقین دلایا جا سکے ۔ ظاہر ہے کہ تاریخی نتائج بر آمد ہونے تک چند منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے ۔ عجلت پسند منکرین عوام کو بہکانے کے لئے کہا کرتے تھے کہ تم اپنے خدا کو بہت طاقتور بتایا کرتے تھے ۔ مگر

آج تک تو تمہارا خدا ہمارا بال بیکا نہ کر سکا آخر وہ تباہ کن انقلاب کب آئے گا۔ جو آپ کے خدا کی قوت کا یقین دلادے۔ پیغمبرِ اسلام نے خدا کی طرف سے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ جس فیصلہ کن انقلاب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ جلد ہی آنے والا ہے یا ہنوز کچھ مدت صرف ہوگی۔ غیب کی باتیں خدا ہی جانتا ہے، برگزیدہ پیغمبروں کے سوا کسی کو اس طرح کی معلومات فراہم نہیں کی جاتیں اور جب کسی پیغمبر کو نوازا جاتا ہے تو اس پیغمبر کے آگے پیچھے چوکیدار مقرر کر دئے جاتے ہیں تاکہ اس چیز کا ٹھیک اندازہ ہوتا رہے کہ نشو و نما دینے والے نے جو پیغامات کسی قوم تک پہنچانا چاہے تھے وہ پہنچا دئے گئے یا نہیں اور جو کچھ اسے پروگرام دیا گیا تھا اُس کے ہر جزر پر عمل کیا گیا یا نہیں۔

یہ پہلو سمجھ لینے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس غیب کا تعلق اشیاء کی انتہائی ماہیت سے ہے دراصل اس کا تعلق فیصلہ کن تاریخی انقلاب سے ہے۔ جس کے تمام تقاضوں کو پیغمبر خدا کی نگرانی میں انجام دیتا تھا۔

دوسری آیۃ ہے

قُلْ لَوْاَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ	اگر میرے قبضہ میں وہ چیز ہوتی جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا خدا اپنے قانونی حدود سے گزرنے والوں کو جانتا ہے اور اس ہی کے پاس ان دیکھی چیزوں کی کنجیاں ہیں جنہیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا خشکی اور تری کی ہر چیز کو جانتا ہے اور کوئی پتّہ

ایسا نہیں گرتا جس کی اسے خبر نہ ہو اور نہ زمین
کی تاریک گہرائیوں میں کوئی دانہ ایسا ہے۔ نہ
کوئی تر و خشک جو اس کے کھلے ہوئے رجسٹر
میں درج نہ ہو۔

تیسری آیۃ ہے

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ

کہہ دیجئے کہ ان دیکھی باتوں کو زمین و آسمان
میں کوئی نہیں جانتا خدا کے سوا۔ انسانی
گروہ موت سے زندگی میں تبدیل ہو جانے
کے وقت کا شعور نہیں رکھتا ان کا علم نئی
زندگی کا نقشہ متعین کر سکنے کے بارے میں
تھک چکا بلکہ نئی زندگی کے پیدا ہونے ہی
میں انھیں شک ہے اور سچی بات تو یہ ہے
کہ انھیں نئی زندگی نظر ہی نہیں آتی۔

ان آیات سے بھی آپ کو اندازہ کرنے کا موقع ملا ہوگا کہ جس چیز کا دیکھ سکنے کے لئے منکرین مطالبہ کر رہے ہیں وہ کوئی ایسی چیز ہے جس پر پیغمبرِ اسلام کے قابو یافتہ ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جسے نمایاں کر سکنے کی طاقت قانونِ قدرت کے علاوہ کسی کو نہ تھی پھر یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان دیکھے مستقبل کا ہی خدا علم نہیں رکھتا بلکہ تمام کائناتی[له] تغیرات اور گوناگوں حالات کا بھی علم رکھتا ہے اس وسیع ترین کائنات میں کوئی جنبش، رجحان اور تبدیلی ایسی نہیں ہوتی جس سے وہ آشنا نہ ہو یعنی اُس کا علم حال و مستقبل دونوں پر حاوی ہے اس لئے کوئی اخلاقی قانون شکست کرنے

له فطرتِ آدم اور علمِ آدم کا عملی ربط اور اس کے تخریبی رجحان کا تعمیری صلاحیتوں کو آگے بڑھا سکنا قرآن کے نزدیک

کائناتی غیب (غیب السموات والارض) کا ایک جزو تھا جسے فرشتے بھی نہ جانتے تھے اور اس لئے ہی سرِ نیاز خم کرنے سے پہلے انھیں خدا سے نتائج دریافت کرنا پڑے۔ ابو النظر رضوی

والا راہ فرار نہ پا سکے گا۔ لیکن تخریبی پارٹی کب تباہ ہوگی اور تعمیری پارٹی کب زندہ اور طاقتور ہوگی اس چیز کی فیصلہ کن تاریخ کا پتہ چلا لینا یا یہ چیز متعین کر لینا کہ اس کا ہر خدوخال کس قسم کا ہوگا آج تک انسانی علم کے لئے ممکن نہ ہوسکا وہ برابر کوشش کر رہا اور آگے بڑھ رہا ہے مگر ہر مرتبہ اس کی ریسرچ تھک کر گر جاتی ہے اس کے دل ودماغ کی چبھن اور بے چینی دور نہیں ہوتی۔ وہ کبھی کہتا ہے ایسا ہوگا کبھی کہتا ہے فلاں نتائج نکلیں گے نتیجہ میں مستقبل تاریک ہی رہتا ہے اور انسانی دل ودماغ اندھے کی طرح ٹٹول کرنے والوں کی طرح۔

یہی وہ مقام تھا جہاں انسانیت کے ڈانڈے خداوندی سے الگ ہو جاتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کو رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر کوئی بالاتر دماغ اور بالاتر طاقت اس کائنات میں اپنے علم وشعور سے کام کر رہی ہوگی تو اسے اپنے علم کے ذریعہ انسانیت کو نوازنا، ٹھوکروں سے بچانا اور ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرنا چاہئے تاکہ انسانیت اپنی ذہنی تاریکیوں کے باوجود آگے بڑھتی چلی جائے۔ پیغمبر اور خصوصاً تاریخی انقلاب پر پیدا ہونے والے پیغمبر۔ خدا کی طرف سے اس کی نگرانی میں اس کے علم وشعور کے ذریعہ رہنمائی کرتے رہے ہیں۔

اگرچہ انھیں کوئی علم نہیں ہوتا، ہر دوسرے انسان کی طرح کہ تاریخی مستقبل کو کس سانچہ میں ڈھالا جائے گا مگر چونکہ بالاتر دماغ سب کچھ جانتا ہے اس لئے ہر ہر قدم پر رہنمائی دیتا۔ اور قریب ترین راستہ سے انسانیت کو اس جگہ کھڑا کر دیتا ہے جو نہ صرف اس کی نفع اندوزیوں کے لئے موزوں تھی بلکہ خدا کی طاقت اور اس کے تاریخی قانون کے ناقابل تبدیل ہونے کا کبھی ثبوت جسے بارہا الہامی کتابوں میں دوہرایا جا چکا اور جس کے مختلف گوشوں تک انسان کا نظریۂ تاریخ پہونچتا جا رہا ہے۔

اگر خدا اس علم غیب کو نہ جانتا ہو اور اس غیب کے لئے کوئی رہنمائی نہ دے سکے تو کیا

آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ علم غیب جو نہ ہمیں براہ راست رہنمائی دے سکے، نہ نقشے متعین کر سکے، نہ مستقبل کے نتائج اور عبوری دور کے مشکلات کو سنبھال سکنے میں امداد کر سکتا ہو، ہماری معاشی زندگی میں کوئی ایسی رہنمائی دے سکتا ہے جس کی تشنگی ہر قدم پر محسوس ہو رہی تھی۔ اگر خدا ہر چیز کی انتہائی ماہیت جانتا ہے اور اگر اُسے اُس تاریخ اور اس وقت کا بھی علم ہے جبکہ یہ مادی کائنات تباہ ہو جائے گی اور یہ بھی جانتا ہے کہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ نئی کائنات کب پیدا ہوگی؟ تو کیا یہ سب کچھ ہماری معاشرتی، اقتصادی، سیاسی مشکلات اور تاریکیوں میں کچھ بھی مفید ہو سکتا ہے۔ بعد از مرگ زندگی کی یاد کیوں تازہ کرائی جاتی ہے تاکہ عمل و نتیجہ کا وہ ذہن جو انفرادی زندگی کے حدود میں مضمحل ہو جاتا تھا تازہ تر ہو کر انسانی صلاحیتوں کو نمایاں کر سکے لیکن جس عمل و نتیجہ کو قیامت اور دوزخ و جنّت کے ذریعہ ناقابل انکار سچائی بتایا جاتا ہے۔ اس ہی سچائی کو مادی کائنات اور بین الاقوامی زندگی میں ٹھوس واقعہ بن سکنے کے قابل کہنے میں کیوں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ اگر علم غیب سے مدعا عمل و نتیجہ کی کائناتوں کا علم ہے تو کروڑوں سال تک رہنے والی مادی کائنات کے تاریخی نتائج کو خدا کے علم غیب سے کیوں خارج کر دیا جائے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایک مسلمان کو یہ کہنے میں بڑی مسرت ہوتی ہے کہ خدا ہر ہر ذرّہ کا علم رکھتا ہے مگر یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ انسانی تاریخ کا ہر مستقبل اُس کے علم میں ہے۔ وہ عرب قوم کے مستقبل کو بھی جانتا تھا اور بین الاقوامی تاریخ کے نشیب و فراز کو بھی جانتا ہے اور اس ہی لئے جس طرح وحی کا ذریعہ علم عربوں کا مستقبل سنوار سکا ایسے ہی اُس کا گہرا مطالعہ آج بھی قوموں کا مستقبل سنوارنے، تاریخی نتائج بتانے اور رہنمائی کر سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے ذرا کی گرفت کائناتی انقلاب پر ہی نہیں تاریخی قوتوں پر بھی ہے۔ کائنات اور تاریخی قوت صرف حق در آغوش "ہیں پیدا کئے گئے ہیں۔ اُن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ قوموں کی رگ رگ سے باطل کو اجتماعی طور پر غلبہ دے سکیں۔ ہم مایوساً

ذہن کے شکار ہو چکے - ہمارے نزدیک حق پر باطل برابر غالب آتا چلا جا رہا ہے حالانکہ قرآن نے
بتایا تھا کہ مایوس ہونے والے دراصل انکار کرنے والوں کی پارٹی میں شامل ہیں - ہم کیوں مایوس
ہوتے جا رہے ہیں - اس لئے کہ ہمارے نزدیک تاریخی قوتیں خدا کی مرضی کے خلاف کام کر رہی ہیں -
خدا نے اپنی طاقتوں کی نمائش کے لئے آخرت کو منتخب کر لیا اور شیطان نے معاشی زندگی کو - خدا
کا دعویٰ تھا کہ کائنات میں ایک ہی طاقت ایک ہی قانون سے کام کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ حق کو
پاسیدہ تر کرتے چلے جانے کے سوا کچھ نہیں - حالانکہ ہمارے نزدیک مشاہدات اس کے خلاف ہیں
اس کا مطلب کیا ہوا ؟ غیب جاننے والا خدا تاریخی قوتوں کے نتائج، حق و باطل کے فیصلہ کُن انقلابات
اور نئی نئی ساختوں سے باخبر نہ تھا اس ہی لئے ہمیں کوئی ایسا نقشہ اور پروگرام نہ بتا سکا جو آ غازِ کار
کی چند سالہ زندگی سے ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا - کیا یہ خدا اور اس کے ذریعہ علم کی توہین نہیں
کیا زندگی کو نشو ونما دینے والی طاقتوں پر گرفت رکھنے والے خدا کے لئے صرف یہ ہی چیز باعث فخر
ہو سکتی ہے کہ وہ انتہائی اہمیت جانتا ہے - یا نشو ونما دے سکنے کا ایک ایسا پروگرام بتا سکنا ہی
زندہ فخر کہا جا سکتا ہے جو ازلی اور ابدی ہو اور جسے انسانی دماغ کی کوئی تقدیری اور کوئی جدید
جدید تاریخی زندگی میں شکست نہ دے سکتی ہو - میں تسلیم کرتا ہوں کہ غیب کی تعریف میں کائناتی انقلاب
اور اس سے پیدا ہونے والی زندگی بھی آتی ہے - لیکن تاریخی انقلابات سے پیدا ہوتے والی زندگیوں کو
بھی اس سے باہر نہیں کیا جا سکتا - جس طرح کائناتی انقلاب کا مستقبل انسانی دماغ کی گرفت
میں نہیں آسکا - ایسے ہی تاریخی انقلابات کا متعین نقشہ بھی انسانی علم آج تک دریافت نہ کر سکا ہمیں
زندگی کا مکمل تصور سمجھ سکنے اور بہترین معاشی ارتقا کر سکنے کے لئے جہاں کائناتی انقلاب کے
نتائج معلوم ہونا چاہئیں وہیں تاریخی انقلاب کے نتائج بھی ٹھیک ٹھیک ہمارے علم میں ہونا چاہئیں
تاکہ ہم دوسری پارٹیوں کا مقام بھی معلوم کر سکیں اور اپنے لئے راہِ عمل بھی - لیکن اگر ایسا نہیں ہے

اور غیب سے صرف انتہائی ماہیت یا بقول دیگر مفسرین کے دوزخ و جنت وغیرہ کی تفصیلات ہی
مراد ہیں تو پھر سوچنا ہی پڑے گا کہ ہمیں کیا رہنمائی مل سکی - شاید آپ کا خیال ہو کہ ہم دلائل سے مطمئن
کر سکیں یا نہ کر سکیں - لیکن شعوری اضمحلال سے متاثر ہو کر قرآنی دعوے کو کیونکر بدل سکتے ہیں -

خدا کے لئے ایسی غلط فہمی میں نہ رہیئے - قرآن کے تیس پاروں میں سے کہیں بھی آپ غیب
کے تصوّر کی وہ تفسیر نہ پا سکیں گے جس کے لئے ہم "مجبوروں" پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے - بد قسمتی سے
غیب اور عملی زندگی کے باہمی ربط، اس کی ضرورت، اس کی نفع بخشی اور اس کے بنیادی تصوّر
پر آج تک غور ہی نہیں کیا گیا - فکری رجحانات، تقاضائے دورہ سے نہ کبھی نکل سکے نہ نکل سکیں گے
اور شاید اس ہی لئے علماً اپنے آپ کو اس ذہنی تضاد سے نہ نکال سکے جس نے انھیں دو مستقل پارٹیوں
میں تقسیم کر دیا - ایک پیغمبرِ اسلام کے علمِ غیب کی قائل تھی اور ایک تھوڑے سے اور کبھی کبھی ہو سکنے والے
علمِ غیب کی مؤید - اگر علمِ غیب کا بنیادی تصوّر صاف کر لیا جاتا تو صدیوں تک مناظرہ بازی میں ذہنی
اور عملی قوتیں ضائع نہ ہو سکتیں - قرآن نے غیب[1] کو کبھی ذہنی یا روحانی حقائق کے لئے استعمال نہیں کیا
بلکہ ہر جگہ اُن حالات اور واقعات کو غیب سے تعبیر کیا گیا جن کا تعین زبردست خواہش کے باوجود
انسانی دماغ نہ کر سکتا ہو - مثلاً موت کہاں واقع ہو گی ؟ بارش کب ہو گی ؟ انقلاب کب آئے گا
نطفہ کی تشکیل کس صنعت کو پیدا کریگی وغیرہ وغیرہ - کیونکہ انسانیت اپنے مفاد اور اپنے ارتقار کے
لئے علمِ غیب کی محتاج تھی - اگر نگاہوں سے اوجھل رہنے والے حالات و خیالات اور پیدا ہونے

---

[1] وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (آلِ عمران) والی آیۃ میں بھی مستقبل کے دو پہلوؤں ہی کو غیب کہا گیا ہے -
ایک تاخیری مواقع کا نفع بخش ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ تباہ کن ہوتے جانا اور دوسرے پارٹی کو مستقبل میں
موقع پرستوں اور منافقوں سے پاک کر دینے کا اعلان - جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی - مگر صاف پارٹی
بنانے کے امکانات نظر نہ آتے تھے - ابوالنظر رضوی

والے مستقبل کے بارے میں اُسے کچھ نہ معلوم ہو تو وہ کوئی روشن راہ اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ اُسے کیا خبر کہ پہلے ہی قدم پر ٹھوکر لگے گی یا نہیں۔ لیکن اگر اسے غیب کا علم ہو تو اس کی منفعت اندوزیوں کی کوئی حد نہیں رہ سکتی جسے ہر پہلو کا نفع نقصان پہلے سے معلوم ہو اُس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے پیغمبر اسلام نے اس ہی لئے فرمایا تھا کہ

لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء ۔	اگر میں غیب کا علم جانتا تو بہت کچھ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے بگاڑنے والے پہلو چھو بھی نہ سکتے ۔

"غیب" کوئی ذہنی تصور، بے دلیل دعویٰ، اور جذباتی عقیدہ نہیں۔ بلکہ مادی زندگی کا ایک تقاضا ہے۔ انسانی دل کی ایک آواز ہے اور معاشی ارتقار کی سب سے پہلی ضرورت ۔ اس ہی لئے جب تک کسی پارٹی کو اپنی لیڈر رشپ پر یہ اعتقاد نہ ہو کہ وہ اس کی مانگوں کو پورا کر سکنے کا راستہ جانتی ہے اور اس مطالبہ کے لئے جتنے علم غیب کی ضرورت ہے اُس سے محروم نہیں اُس وقت تک کوئی پارٹی کسی شخص کو اپنا قائدِ اعظم نہیں تسلیم کر سکتی ۔ ہو سکتا ہے کہ سمجھنے والوں اور یقین کرنے والوں نے غلطی کی ہو مگر اس چیز کا یقین پہلے ہی مرحلہ پر کئے بغیر چارہ نہیں ۔

علم غیب کی کسوٹی تاریخی نتائج ہیں۔ اگر رہنمائی نے ٹھیک وہی نتائج پیدا کئے جن کا قیادتِ عظمیٰ کی طرف سے دعویٰ کیا گیا تھا تو یقیناً قوم کا اعتماد درست تھا ورنہ اُس لیڈر رشپ کو بہت جلد اپنی موت مرنا پڑے گا۔

پیغمبرانہ نظامِ اصلاح و ترقی کا جہاں تک تعلق ہے ۔ ان کمزوریوں میں سے ایک بھی نہ ہوتی تھی۔ نہ عوام اپنی دماغی کمزوریوں کے سہارے کسی کو لیڈر منتخب کرتے تھے نہ انسانی شعور و تجربہ کی کمزوریاں، لیڈر رشپ کو نئے سے نئے "بھول بھلیوں" میں پھانس کر تماشہ دیکھ سکتی تھیں۔ لیڈر

شپ کا انتخاب بھی شخصی استعدادات کے لحاظ سے خدا کرتا تھا اور جتنے علم غیب کی ضرورت ہوتی تھی خواہ اس کا تعلق شعور سے ہو یا ٹھوس واقعات و نتائج سے اُسے بھی خدا وحی و الہام یا معراج سے پیغمبروں کو دیتا رہتا تھا۔ غیب کے جتنے پہلو وقتی اور مقامی ہوتے تھے، وہ احادیث قدسی، قلبی الہامات وغیرہ سے بتا دئے جاتے تھے اور جو پہلو اپنی جامعیت کے نقطۂ نظر سے وقتی اور مقامی مسائل کو بھی حل کر سکتے تھے اور ابدی قوانین کی ترجمانی بھی اُنھیں "وحی متلو" کا جزو بنا دیا جاتا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی اپنے اپنے زمانہ میں تاریخی حالات اور معاشی نظریات کے درمیان یہ اندازہ کر سکیں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور کدھر جانا چاہیے۔ ہمارے معاشی اور اخلاقی نظام میں کون سی کمزوریاں ہیں اور اُن میں سے کونسی کمزوری کو آئینی طور پر اور کونسی کمزوری کو انقلابی جدوجہد سے مٹا دینا چاہیے۔ کائناتی قوانین اور تاریخی قوتیں زندگی کی ایک ہی مشنری کے دو ٹکڑے ہیں۔ تاریخی قوت کائناتی رجحان کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتی۔ اگر کائنات کی پیدائش "حق" ہی کے لئے ہوئی ہو تو تاریخ کو بھی "تخلیق بالحق" ہی کرنا پڑے گی۔ جو پارٹی کائناتی غایت کی طرف نہیں لے جا رہی۔ اُسے نشوونما کی محدود اور مقررہ ڈگریوں تک نشوونما پا کر ختم ہی ہونا پڑے گا اور یہ نشوونما بھی اس ہی وقت ممکن ہے۔ جبکہ کائناتی غایت کے چند پہلوؤں کی نمائش اس ناقص پروگرام کے ذریعہ ہو سکتی ہو۔ ورنہ تاریخی فتح کا ایک قدم اٹھا سکنا بھی تمام بین الاقوامی انسانیت کے لئے ناممکن رہے گا۔ اس لئے وحی کے ذریعہ علم نے کائناتی اور تاریخی قوانین کی جو سمت متعین کر دی ہو نہ اُس کے موافق جدوجہد کرنے والی پارٹی کو کوئی طاقت کامیاب ہونے سے روک سکتی ہے۔ نہ خلاف کرنے والوں کی تباہی کو دور کر سکتی ہے۔ اگر انسانیت کو مذکورہ بالا پہلوؤں کے تمام گوشے کسی کتاب سے معلوم ہو سکتے ہیں تو اس کتاب کے سوا کوئی کتاب "کتاب مبین" نہیں ہو سکتی۔ جو کتاب غیب کے پردے اُٹھا دے، جو کائنات اور تاریخ کے رازہائے درون پردہ

کو بے نقاب کردے اور جو مستقبل پر سرچ لائٹ ڈال سکتی ہو وہ ہی کتاب اس قابل ہے کہ ہم اُسے ہمیشہ کے لئے ایک مستقل ہدایت نامہ تسلیم کرلیں۔ لیکن پھر بھی ظاہر ہے کہ نہ تاریخ کے نقشے معمولی معمولی جزئیات میں بھی ایک ہی سانچہ پر ڈھلا کرتے ہیں، نہ انسانی شعور و تجربہ ہی ہنوز تمام نئی نئی ختوں سے پوری طرح باخبر ہو سکا۔ اس لئے جو پارٹی اپنے دل و دماغ کو قرآن کی لیڈرشپ میں دینے کے لئے تیار ہوگئی ہو اسے اَن دیکھے نتائج کا انتظار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی "ابتغاء تاویل" مفاد پرستوں کی راہ ہے۔ جب بنیادی تصور اور پروگرام کے سچے ہونے پر یقین ہو تو عمل میں مفاد پرستیوں کو رکاوٹ کا حق نہ دینا چاہئے بلکہ

یؤمنون بالغیب — یقین کرتے ہیں ان دیکھے نتائج پر

کی پارٹی میں شامل ہونا پڑے گا۔ تاکہ ذوقِ یقین ہر وہ ممکن سہارا دے سکے جس کی ہمیں ضرورت تھی کوئی شک نہیں کہ یقین کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا پہلے ہی لمحہ میں آخری منازل تک پہنچ جانا ضروری ہے۔ یقین بھی ایک پودے کی طرح نشو ونما پاتا، پھول کی طرح کھلتا، صبح کی طرح پھیلتا اور بادل کی طرح امنڈتا چلا جاتا ہے۔ مگر یقین کا نشو ونما، زندگی کی اُن ہی بنیادوں پر کھڑا رہنے سے ہو سکتا ہے جو ہر طلوع و غروب پر نئی زندگی دے سکیں، ہر قدم پر آگے بڑھا سکیں اور ہر جد و جہد کو کامیاب سے کامیاب تر کرتے رہنے کے قابل ہوں۔ پیغمبروں کی رہنمائی اور ان کے ذریعہ علم کی تاریخی موزونیت اتنی بہترین ہوتی تھی کہ نتائج کا کوئی نقشہ بے رنگ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن آج ہماری جد و جہد قرآنی دعوت کو کامیاب بنانے میں پیغمبرانہ فتح و کامرانی کو نہیں دہرا سکتی۔ اس کے یہ معنے نہ سمجھ لینا چاہئیں کہ شکست خوردہ ذہن کی نمائش کا نیا راستہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ اگر بلند انسانی دماغ سے ہم آج بھی قرآن کو سمجھنے اور اپنی راہِ عمل متعین کرنے کی کوشش کریں تو کم از کم دوسری پارٹیوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو کون کہہ سکے گا کہ

فتح و نصرت، غلبہ و اقتدار اور امن و عیش کی زندگی خرید سکنے کے لئے اسلام اُس "اخلاقی وعظ" سے بلند تر مقام رکھتا ہے جسے انسان پیدائشی طور پر جانتا تھا اور جسے قرآن نے

هدیناه النجدین — ہم نے دونوں اُبھرے ہوئے راستے دکھائے

سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو خدا کے عالم الغیب ہونے کی شہادت میں پیش کی جا سکتی، جس کی غیب دانیوں کے سہارے قوموں کے مسائل سلجھائے جا سکتے اور ان کا مستقبل خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ مگر کسی نظامِ زندگی کو مخصوص نقشہ اور مخصوص حالات پر ٹھیک ٹھیک چسپاں کر سکنے کے لئے تمدنی علوم سے جتنا باخبر ہونے کی ضرورت ہے وہ ابھی تک انسانیت کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ پیغمبر حالات کے مطابق ٹھیک ٹھیک راہ متعین کر سکنے میں بھی بالاتر دماغ کے تابع ہوتے تھے اس لئے ان کے دماغ پر وہ دباؤ نہیں پڑ سکتا تھا۔ جو انسانی دل و دماغ کے لئے طے کر دیا گیا۔ ہمیں تاریخی حالات، رجحانات کی سمت، متضاد پہلوؤں کا علم، قوموں کے ذہن اور کردار وغیرہ سب کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک ایک قدم اُٹھانا پڑے گا تاکہ تعمیر میں کوئی "صورت خرابی" کی نہ پیدا ہو جائے۔

شاید آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو کہ خود قرآن ہی خدا کے عالمِ غیب ہونے کی مکمل شہادت دے سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ نئے طرزِ فکر کے سایہ میں قرآن کے ان احکامات پر غور کریں گے۔ جو طرح طرح کے حالات میں نتائج کا چیلنج کرتے ہوئے تیئیس سال تک دئے جاتے رہے تو آپ کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ میرا نظریہ مالیخولیائی نظریہ نہ تھا۔ بلکہ اگر آپ ان تاریخی ساختوں اور ان احکامات کو جو عرب قوم ہی کے لئے مخصوص تھے۔ بین الاقوامی تاریخ اور اس کے حالات پر چسپاں کر کے جدید ترین معاشی سوالات کا حل دریافت کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ وہی آیات نہ صرف کائناتی قوانین، تاریخی نتائج، انقلاب کے تقاضے

پارٹیوں کے نفسیاتی رجحانات، موقعہ پرستوں کے ذہن و کردار اور عبوری دور کو حسن کاریوں سے گذارنے، قومی و بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے اور جاگیر داری نظام سے لے کر سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے لیکر اشتراکیت کی گتھیوں کو سلجھانے کا فرض انجام دے رہی ہیں۔ بلکہ وہ ہی آیات اس قابل بھی ہیں کہ اشتراکی تصور اور اس کے نظام زندگی پر علمی تنقید کر سکیں چونکہ میں اس موضوع پر اپنی آخری تصنیف " اسلام اور اس کا نظام ارتقار " کے صفحات میں سیر حاصل بحث کر رہا ہوں اس لئے یہاں طویل ترین بحثوں میں نہیں الجھنا چاہتا۔

مقصد صرف اس چیز پر روشنی ڈالنا ہے کہ غیب کا یہ تصور کہ فرشتے جنات، قیامت اور دوزخ وجنت ہی کی تفصیلات غیب میں داخل ہیں۔ یا بقول ڈاکٹر صاحب کے " عالم شہادت کی انتہائی حقیقت کو اس غیب کے دائرہ میں لانا جسے قرآن کی زبان میں غیب قرار دیا جاتا ہے " درست نہیں۔ خدا کے لئے یہ فخر کہ وہ انتہائی ماہیت کو جانتا ہے، چاہے قرآن نے اس پر معمولی سی روشنی بھی نہ ڈالی ہو کوئی ایسا فخر نہیں ہے کہ انسانی دماغ کو سجدہ کرا سکے۔ اگر قرآن، فلسفہ کی غایت تک پہونچنے کا مدعی ہے تو اسے اشیار کے وہ انتہائی حقائق وانکشاف کرنا چاہئیں۔ جنہیں کوئی فلسفی نہ دریافت کر سکا تھا۔ تاکہ فلسفیانہ دماغ کے غرور کو شکست کیا جا سکے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی غایت ہی جدا جدا ہے پورا قرآن شہادت دے سکتا ہے کہ وحی والہام کا موضوع، کبھی بھی کسی چیز کی ابتدائی یا انتہائی ماہیت دریافت کرنا نہیں رہا۔ مذاہب کا کام ایجاد، تخلیق اور انقلاب ہے اور فلسفہ کا کام انسانی دماغ کو سب سے بڑی علامت استفہام بنا دینا اور اسی حقیقت معلوم کر سکنے کے لئے ذوقِ جستجو کو ابھارنا جس کی تکمیل سے بھی کوئی عملی نتیجہ نہ مرتب ہو سکتا ہو۔

ہاں علمار کا یہ تصور بنیادی طور پر ضرور درست ہے کہ وہ کائناتیں اور وہ قوتیں جو ہمارے

علم واطلاع سے باہر ہیں۔ خدا کے علم سے باہر نہیں ہو سکتیں۔ مجھے اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ علماء اپنے تصور کو ذرا اور وسیع کرتے ہوئے تاریخی مستقبل کو بھی شامل کرلیں تاکہ ہم قرآن ہی کی آیات سے کائنات بنانے والے کو کائناتی قوانین، تاریخی ساختوں اور عمل و نتیجہ کے پورے نظام سے باخبر ثابت کرنے کے قابل ہوسکیں۔ کسی ایسے غیب کا دعویٰ جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا ممکن ہے کسی طرزِ فکر میں قبول کیا جاسکا ہو لیکن ہمارے تاریخی زمانہ میں کوئی جگہ نہ بنا سکے گا۔

من ارتضیٰ من الرسول — جس پیغمبر کو منتخب کرلیا گیا ہو۔

کی تصریح کے مطابق مخصوص پیغمبروں ہی کو جو علم دیا جاتا ہو۔ وہ فرشتوں، جنات اور دوزخ و جنت کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس کا علم تو ہر صوفی کو بھی ہوتا ہے۔ کوئی پیغمبر اس علم سے کیوں کر خالی ہوسکتا تھا۔ دراصل جو عظیم ترین پیغمبر قوموں کی قسمت پلٹنے، انھیں نئے انقلاب سے روشناس کرانے آیا کرتے تھے اُن ہی کو قومی حدود تک ضرورت کے مطابق رفتہ رفتہ علم غیب دیا جاتا رہتا تھا۔ پیغمبر اسلام چونکہ قومی اور بین الاقوامی الانسانیت دونوں طرح کی پیغمبری کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ اس لئے انھیں عربی قوم اور بین الاقوامی انسانیت دونوں کے تاریخی مستقبل کا علم دیا گیا اور اُس علمِ غیب کو قرآن کے اوراق میں سربمہر کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا گیا۔ اگر کوئی شخص وحی کے ذریعۂ علم سے یہ اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ رہنمائی دینے والا خدا کائناتی قوانین، ربوبیت و پروردگاری کے ضابطوں، تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم اور اُن کے کائناتی یا تاریخی نتائج کا کہاں تک علم رکھتا ہے اور کیا اس علم و اطلاع کی وسعت اور ہمہ گیری انسانی جد و جہد کی رہنمائی کرسکتی ہے اور اس حد تک کہ بغیر اُس رہنمائی کے زندگی کی تاریکیوں کو مٹایا ہی نہ جاسکتا ہو تو تنہا قرآن کے مطالعہ سے اندازہ کرسکتا ہے۔ قرآن کے ذریعۂ علم میں کوئی تشنگی ایسی باقی نہیں رہ گئی تھی جسے دور کرنے کے لئے ہمیں دوسرے سہارے تلاش کرنا پڑیں۔ قرآن کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جس تاریخی

زمانہ میں جس قسم کی پیچیدگیاں، سوالات اور مانگیں پیدا ہوں گی۔ قرآن اُن کا جواب دے سکے گا اگر قرآن کسی ایک ہی زمانہ کے تقاضہ کو پورا یا ایک ہی انسانی طرزِ فکر کو مطمئن کر سکتا تو اُس کے ایک ایک نقطہ کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہ سکتی تھی۔ نئی نئی تاریخی ساختوں کو جاننے، نئے سے نئے تاریخی تقاضوں کو سنبھالنے اور نئے سے نئے طرزِ فکر کو روشنی دے سکنے والا قرآن ہی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ایک ایسے خدا، ایسے بالاتر دماغ اور ایسے غیب داں کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جو سب کچھ جانتا اور مکمل ترین رہنمائی دے سکتا ہے۔

اگر اس علمِ غیب اور اس طرح کی رہنمائی کو نظر انداز کر کے ہم صرف "بعد از مرگ زندگی" ہی کے غیبی علوم کا یقین کرنے لگیں تو کیا مادی زندگی کے طویل ترین تاریخی فاصلے اور قومی مرگ و زیست کی صدہا داستانوں کی خلیج سے خدا کے علمِ غیب میں خلا نہ پیدا ہو جائیگا؟ کیا اس کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ اگرچہ خدا آخرت کی تفصیلات سے پوری طرح باخبر ہے۔ لیکن انسانی تاریخ، معاشی ارتقاء کے منازل اور اُن پیچیدگیوں سے بالکل ناآشنا ہیں۔ جنہیں سُلجھا سکنے ہی پر ہمارے تاریخی مستقبل کا دارومدار ہے؟ کیا اس تصور پر ایمان، حالات کے سہارے بڑھتا رہ سکتا ہے شاید ایمان میں کمی و بیشی ہو سکنے نہ ہو سکنے کی جو بحث علماء کرام کی صحبتوں میں چلتی رہی۔ وہ اس ہی بنیاد پر ہو گی۔ آخر پر تھوڑا یا بہت جتنا یقین بھی کسی وجہ سے پہلے دن ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ موت تک اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر خدا کی طاقت اور اُس کے قانون (یہ یقین) کی دعوت قبول کر لی گئی ہو تو تاریخ کا ہر ورق پلٹنا، ہر وہ ٹھوکر اور ہر وہ امن و عیش جو ہمارے بنیادی تصور کو پائندہ تر اور تابندہ تر کرتا جا رہا ہو۔ ہمارے ایمان و یقین میں اضافہ کا باعث ہوتا رہے گا۔ آخرت یا دوزخ و جنت پر ایمان یہود و نصاریٰ کو بھی نصیب تھا۔ فرشتوں وغیرہ کو بھی تمام مذہبی پارٹیاں ہمیشہ تسلیم کرتی رہی ہیں۔ پھر آخر وہ کونسا غیب تھا؟ جس پر ایمان لائے بغیر عبادات بھی رہنمائی نہ دے سکتی تھیں۔ اور جسے پیغمبر

اسلام ہی پر کیا موقوف ہے قرآن کے نزدیک من فی السموات والارض (جو بھی زمین و آسمان میں ہے) اس غیب کو نہیں جانتا۔ جس پر ایمان لانے کا ہم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ کیا خدا کو کائنات نہیں پہچانتی تھی۔ کیا دوزخ و جنت کا علم تمام اہل مذاہب نہیں رکھتے تھے؟ آخر وہ کیا چیز تھی؟ جو پیغمبروں کو بھی لگا ہے گا ہے، ضرورت کے مطابق بتایا جایا کرتی تھی۔ وہ ایک ہی چیز تھی پیغمبرانہ قیادت میں الہامی پیغام کے تاریخی اور حیاتیاتی نتائج، وہ نتائج کچھ اس طرح قرآن میں نہیں بیان کئے گئے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے بعد معاشی انقلاب کا ذوق رکھنے والی انسانیت اپنی پیچیدہ اور طویل راہ میں فائدہ نہ اٹھا سکے قرآن کے معجزانہ انداز بیان نے جن آیات میں عرب قوم کے عبوری دور اور تاریخی مستقبل پر روشنی ڈالی ہے وہ ہی آیات ہر تاریخی نظریہ کو پوری پوری روشنی دے سکنے کے قابل ہیں۔ اور صرف سادہ ترجمہ کے ساتھ قصص الانبیاء دراصل ایمان بالغیب کو تقویت دینے ہی کے لئے بیان کئے گئے تھے۔ انبیاء کے تاریخی واقعات زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اُس ہی سے نئی نئی تاریخی ساختوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اُس ہی سے تعمیری اور تخریبی پارٹیوں کے فیصلہ کن نتائج کا اور اُنھیں سے اس چیز کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نصب العین کو نہ بدلتے ہوئے مختلف تاریخی زمانوں میں حالات کو سنبھالنے کے لئے نقشہ میں کتنی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

یقین کیجئے کہ قرآن کی حکمت و موعظت سے جس طرح اخلاقی انقلاب لانے والا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے ہی معاشی انقلاب سے آغاز کرنے والا بھی اٹھا سکے گا۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم حقیقت ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں جو سچائی ہے۔ زندگی کے دوسرے پہلو میں بھی وہ سچائی ہی رہے گی۔ قرآن نے اخلاقی انقلاب کی دعوت دیتے ہوئے جو علم غیب دیا تھا۔ وہ معاشی انقلاب لانے والوں کے لئے بھی اتنا ہی مفید رہے گا قرآن کا معجزہ ہی یہ ہے کہ تاریخ و سائنس کی ریسرچ سے جن فیصلہ کن سچائیوں تک انسانی دماغ پہنچ سکتا اور ماضی و حال کے آئینہ میں اپنا چہرہ

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۲ پر)

صحیح بخاری کی فنّی خصوصیات

(۴)

(از جناب مولوی محمد سلیم صاحب صدیقی ایم۔ اے)

عینی نے اپنے شرح کے دیباچہ میں ایک بلیغ ادیبانہ خطبہ لکھا ہے اور شاید اس پر ان کو ناز بھی تھا۔ حافظ نے "الاستبصاد علی الطاعن" کے نام سے اس دیباچہ کی ادبی تنقید لکھی ہے عینی کی شرح کے ابتدائی حصہ میں ایک خاص بحث حدیثوں کے متعلق پائی جاتی ہے جو فتح الباری میں نہیں ہے یعنی حدیثوں کی بلاغت اور لفظی محاسن جن کا فن بدیع سے تعلق ہے بیان کیا ہے حافظ ابن حجر سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کی شرح میں یہ کمی رہ گئی ہے تو ہنس کر اس کا جواب دیا کہ یہ خود عینی کی اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ

نقله من شرح رکن الدین وقد وقفت — یہ سرمایہ رکن الدین کی شرح سے عینی نے اپنی

دیکھ کر جہاں تک مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ اُس سے بھی زیادہ گہری، زیادہ صاف اور زیادہ نفع بخش سچائیوں کو نمایاں کر دیا گیا۔ کاش مسلم پارٹی قرآن کے مطالعہ کا ذوق پیدا کر سکتی۔ جس سے ہر غلط فہمی دور ہو سکتی تھی۔ اب رخصت ہوتا ہوں اور یہ عرض کرتے ہوئے کہ اگر میرے طرز فکر میں کچھ لغزشیں ہوں تو انھیں سنبھال سکنے کا آپ کو حق ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۱)

علیہ قبلہ ولکن ترکت النقل منہ لکونہ لم یتم وانہ کتب منہ قطعۃ وخشیت بعد فراغتہما فی الارسال ولذا الم یتکلم العینی بعد تلک القطعۃ بشئی من ذلک ۔	کتاب میں منتقل کیا ہے، میں رکن الدین کی کتاب سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ لیکن اس کتاب کی چیزیں میں نے اس لئے نقل نہ کیں کہ رکن الدین کی شرح مکمل نہ تھی بلکہ صرف ایک قطعہ لکھا تھا، مجھے اندیشہ ہوا کہ رکن الدین کی شرح کے ختم ہو جانے کے بعد ان مباحث کو ترک کر دینا پڑے گا اس لیے سرے سے میں نے اس کو لیا ہی نہیں، عینی کی شرح میں بھی دیکھو! جہاں سے رکن الدین کی کتاب ختم ہوئی ہے اس کے آگے اس سلسلہ میں گفتگو ترک کر دی ہے ۔

بہر حال دونوں بزرگوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ہی رہی ہو لیکن اب تو بخاری کی ان دونوں شرحوں کی حالت دو توام بھائیوں کی سی ہوگئی ہے ایک کے ذکر کے بعد دوسرے کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے اگر چہ انصاف کی بات یہی ہے جیسا کہ حاجی خلیفہ نے عینی کی شرح کے متعلق یہ لکھتے ہوئے

ھو شرح کافل فی معنی	اپنے مقصد کے لحاظ سے خود شرح کافی اور خود مکتفی ہے،

لکھا ہے کہ

لم ینتشر کانتشار فتح الباری فی حیات مولفہ وھلم جرا العینی بعد وفاتہ	مگر فتح الباری کی شہرت عینی کی شرح کو نہ مصنف کی زندگی میں حاصل ہوئی نہ اس کے بعد

آخر وقت تک۔

شروح بخاری میں آخری اہم شرح علامہ شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی المصری الشافعی صاحب المواہب کی ہے جس کا نام انھوں نے ارشاد الساری رکھا ہے علامہ قسطلانی کی وفات سنہ ۹۲۲ھ میں ہوئی ہے۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے۔

وھو شرح ممزوج فی نحو عشرۃ اسفاد کبار — ان کی شرح دمختلف شروح کے مضامین سے) دس بڑی بڑی جلدوں میں

دیباچہ کے اور چیزوں کے تذکرے کے ساتھ خود قسطلانی نے لکھا ہے کہ

قد فاض علیہ النور من فتح الباری — کہ قسطلانی پر فتح الباری سے نور نازل ہوا

جو اس بات کا اعتراف ہے کہ اپنی شرح میں زیادہ تر انھوں نے فتح الباری ہی سے استفادہ کیا ہے بلکہ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قسطلانی کی یہ شرح گویا فتح الباری کا ایک تلخیصی نسخہ ہے البتہ اس شرح کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے بخاری کے جس متن کا انتخاب اپنی شرح میں کیا ہے یہ بخاری کے نسخوں میں بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ نے اپنی املائی شرح میں فرمایا ہے۔

لانہ اعتمد علی نسخۃ الحافظ شرف الدین الیونینی جھبذ زمانھا و حافظ اوانہ۔ — جس کی وجہ یہ ہے کہ قسطلانی نے بخاری کے اس نسخہ پر اعتماد اپنی شرح میں کیا ہے جو حافظ شرف الدین یونینی کا مرتب کیا ہوا تھا وہی شرف الدین یونینی جو اپنے زمانہ کے ماہر بصیر اور وقت کے حافظ تھے۔

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ وقت نے فرمایا تھا کہ بخاری کی عبارت پر اعراب لگا دیا جائے

اس کام پر حکومت نے ان ہی علامہ یونینی کے سپرد کیا تھا۔ لکھا ہے کہ

وجعل معہ افاضل العصر فصحح متون الاحادیث ھو وابن مالک صاحب الفیہ	یونینی کے ساتھ اس کام میں وقت کے دوسرے فضلاء بھی شریک کئے گئے تھے پس یونینی اور الفیہ (مشہور نحوی متن منظوم) کے مصنف ابن مالک نے بخاری کی حدیثوں کے متون کی تصحیح کی،

بہر حال قسطلانی کو اسی یونینی مصححہ نسخہ کا پہلا قطعہ مل گیا تھا جو نصف بخاری پر مشتمل تھا قسطلانی نے اپنی شرح کے دیباچہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے کہ شرف الدین یونینی اور ابن مالک کا مصحح نسخہ ان کو کیسے ملا، تصریح کی ہے کہ اس پر دونوں بزرگوں کی تصحیح کے توثیقات درج تھے، یونینی اور ابن مالک صاحب الفیہ کا جو مقام عربیت میں ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے حقیقت میں اس نسخہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، قسطلانی نے لکھا ہے کہ ایک مدت تک صرف بخاری کی پہلی جلد یونینی کے نسخہ کی مجھے ملی اور اس کا افسوس تھا کہ آدھی کتاب میں ان کی تصحیح سے مستفید نہ ہو سکا مگر جو ینده یا بنده کا مثل پچاس سال کے بعد مجھے یہ خبر ملی کہ بازار میں کچھ کتابیں نیلام کے لئے آئی ہوئی ہیں اور اسی میں یونینی کی مصححہ نسخہ کی دوسری جلد بھی ہے مجھے بڑی خوشی ہوئی اس نسخہ کو میں نے حاصل کیا اور آخری حصہ کے متن کی تصحیح اسی کو پیش نظر رکھ کر کی آخر میں لکھا ہے کہ۔

وقد قابلت متن شرحی اسناداً وحدیثاً من اولہ الی اخرہ حرفاً حرفاً وکتبتہ کما رأیتہ حسب	میں نے اپنی شرح کے متن کی سندوں اور حدیث کی خود عبارت کا اول سے آخر تک ایک ایک حرف کر کے مقابلہ کیا ہے اور

طابقتی وانتھت، مقابلتی فی عشر الاخیر من المحرم سنہ ۹۱۷ ثم قابلتہ مرۃً اخری ۔	جیسا لکھا ہوا تھا ۔ اپنی استطاعت کی حد تک میں نے ٹھیک اسی کے مطابق لکھنے کی کوشش کی ہے (یونینی کے نسخہ) سے مقابلہ کا کام محرم ۹۱۷ھ کے آخری عشرہ میں پورا ہوا ۔ میں نے دوبارہ پھر اسی نسخہ سے اپنی شرح کے متن کا مقابلہ کیا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ قسطلانی کی شرح اپنے متن کے مقابلہ کی اسی خصوصیت کی وجہ سے، بہت اہمیت رکھتی ہے ہندوستان میں پہلی دفعہ صحیح البخاری کی طبع کا انتظام حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نے جب فرمایا تو کہا جاتا ہے کہ ان کے پیش نظر بھی منجملہ دوسرے نسخوں کے قسطلانی کا بھی یہ مصححہ نسخہ تھا کہتے ہیں کہ قسطلانی کی اتباع میں مولانا احمد علی نے بھی نہ صرف عبارت اور الفاظ کا مقابلہ اصل نسخہ سے کیا تھا بلکہ ایک ایک حرف مثلاً حدثنا کا مقابلہ یوں کیا جاتا تھا ح د ث ن ا ایک ایک حرف کا مقابلہ کیا گیا ہے ۔

مضمون کو ختم کرتے ہوئے اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بخاری کی مشہور (۵۳) شرحیں ہیں اور (۴۲) مستخرجات ہیں جن میں سب سے زیادہ الاسماعیلی کا مستخرج مشہور ہے ۔ اسی طرح بخاری کے (۱۹) نسخے مشہور ہیں جن میں ایک محدثہ خاتون کریمہ بنت احمد کا بھی ہے اسی طرح تین حنفی علماء کے بھی مستقل نسخے بخاری کے ہیں ۔ جن میں ابراہیم ابن معقل النفسی الحنفی بخاری کے براہ راست شاگرد ہیں اور دوسرا نسخہ حماد بن شاکر کا نسخہ ہے اور تیسرا یہ عجیب بات ہے کہ علاوہ حنفی ہونے کے وہ ہندوستانی بھی ہیں یعنی علامہ صغانی کا نسخہ حضرت مولانا انورشاہ کاشمیری اپنی املائی شرح میں اسی ہندوستانی عالم کے نسخہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

وھو اولاھا باعتبار عندی لانہ یقول انہ نقلھا من النسخۃ التی قرأت علی البخاری	بخاری کے تمام نسخوں میں میرے نزدیک سب سے بہتر یہی ہندوستانی نسخہ ہے کیونکہ اس میں (صغانی) نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے جس نسخہ سے اپنی کتاب نقل کی تھی وہ خود بخاری پر پڑھا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ خود مصنف کے سامنے جو کتاب پڑھی گئی اور اس سے جو نسخہ نقل کیا گیا اعتماد میں اسی کو سب پر ترجیح ہونی چاہئے اور ہمارے ہندوستان کی یہ کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ اہم جو کتاب سمجھی جاتی ہے اس کا اصح ترین نسخہ ہندی نسخہ ہے،

آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ امام بخاری سے (۹۰) ہزار آدمیوں نے یہ کتاب سنی تھی۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت بالخیر

تبصرے

باغی ہندوستان (الثورۃ الہندیہ) تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت تقریباً پانچ سو صفحات۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت مجلد پانچ روپیہ۔ پتہ:۔ مدینہ بک ایجنسی بجنور (یو۔ پی)

مولانا فضل حق خیر آبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ اُنیسویں صدی کے مشہور عالم و فاضل تھے۔ خانوادۂ خیر آباد کی روایتی خصوصیات کے مطابق اگرچہ آپ کا خاص فن منطق و فلسفہ تھا چنانچہ قاضی مبارک پر آپ کا حاشیہ اس کا بین ثبوت ہے تاہم معقولات کے ساتھ منقولات میں بھی بڑا درک رکھتے تھے حدیث میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے عام طور پر منطق اور ادب میں تضاد پایا جاتا ہے لیکن مولانا جتنے بڑے منطقی تھے اتنے ہی بلند پایہ عربی زبان کے ادیب بھی تھے مولانا ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کو دولت علم اور نعمت امارت وثروت دونوں میں سے حصہ وافر ملتا ہے۔ امارت وثروت کی وجہ سے زندگی بڑے عیش وآرام اور تمکنت ووقار سے بسر کرتے تھے لیکن علم وفضل اور حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ سے علمی نسبت رکھنے کے باعث قومی حمیت وخودداری اور اسلامی غیرت وجوش کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزی فوج کی طاقت سے مرعوب ہو کر دہلی کے بعض عمائد جنگ کے معاملہ میں نہ صرف پست ہمت بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھی خواہ اور معاون بن گئے تو روہیلوں کے سردار جنرل بخت خاں نے مولانا فضل حق سے مشورہ کیا اور اس کے بعد

مولانا نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علماً کے سامنے ایک تقریر کی اور اُس میں جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اکثر علماً نے آپ کی تائید کی فتوی کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی مولوی ذکاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ صرف دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی انگریزوں کی فتح کے بعد جب یہاں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو اس فتویٰ کی پاداش میں مولانا فضل حق پکڑے گئے اور مقدمہ چلا، عدالت میں ایک ایسا موقع آگیا تھا کہ اگر مولانا چاہتے تو صاف لفظوں میں فتوی سے انکار کر کے یا کم از کم توریہ کی راہ اختیار کر کے اپنی گلو خلاصی کرا سکتے تھے لیکن آپ کی عزت و خودداری نے شیوۂ ارباب عزیمت کا ترک گوارا نہیں کیا اور برملا عدالت میں اقرار کیا کہ "ہاں" وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے" حد یہ ہے کہ جج قدیم تعلق اور خیر خواہی کی بنا پر بار بار روکتا اور کہتا تھا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ گواہ سرکاری نے بھی آپ کو شناخت کرنے سے انکار کر دیا تھا بایں ہمہ آپ مذکورۂ بالا فقرہ ہی دہراتے رہے انجام کار آپ کو عبور دریائے شور کا حکم سنا دیا گیا اور یہاں کی تمام املاک و جائداد ضبط کر لی گئی ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو آپ نے جزیرۂ انڈمان میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے مولانا نے زمانۂ اسارت میں ایک مختصر رسالہ عربی زبان میں "الثورۃ الہندیہ" کے نام سے لکھا تھا اور اس کے علاوہ چند قصائد بھی فتنۃ الہند کے نام سے تصنیف کئے تھے جن میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے واقعات بڑے جوش و خروش سے منشیانہ عربی میں قلمبند کئے تھے یہ رسالہ ایک صاحب کی معرفت انڈمان سے مولانا کے صاحبزادہ مولانا عبد الحق صاحب خیرآبادی کے پاس پہنچا اور پھر متعدد ارادتمندوں نے نقل حاصل کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ خوشی کی بات ہے کہ شروانی خاندان کے ایک نوجوان عالم مولانا عبد الشاہد خاں جو خیرآباد کے اس خاندان سے بوسائط تلمذ کا تعلق

بھی رکھتے ہیں ان کی محنت وکوشش کی بدولت یہ عربی رسالہ اور دو عربی قصیدے اب زیور طباعت سے آراستہ ہوکر باصرہ نوازِ ارباب نظر ہو رہے ہیں موصوف نے اصل متن کی اشاعت کے ساتھ ان کا بامحاورہ وسلیس اردو ترجمہ کیا اور شروع میں ایک مبسوط ومفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں خیرآباد اور اس کے علمی سلسلوں کی اجمالی تاریخ مولانا فضل حق کے خاندانی حالات - پھر ان کے سوانح اور علمی وادبی کمالات - ذاتی اخلاق وفضائل ان سب پر ایک انتہائی عقیدتمند کی حیثیت سے کلام کیا ہے اثنار کلام میں بعض اور چیزیں بھی آگئی ہیں جن کا اصل موضوع سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے - تاہم اپنی جگہ ان کی افادیت مسلم ہے - اصل مقدمہ کے بعد ایک ضمیمہ لکھا ہے جس میں مولانا عبدالحق خیرآبادی - مولانا سید برکات احمد ٹونکی مولانا معین الدین اجمیری اور پھر خود اپنے حالات وسوانح مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے تلمذ بالواسطہ دبو سائط رکھنے کی مناسبت سے لکھے ہیں - کتاب میں خالص تاریخی اور تصنیفی اصول کے لحاظ سے چند خامیاں ضرور ہیں مثلاً سوانح نگاری اور منقبت سرائی میں فرق نہ کرنا بعض قابل بیان خامیوں کو چھپانا یا ان کی تاویل کرنا بعض غیر متعلق اشخاص کا محض ادنیٰ ملابست سے مفصل تذکرہ کرنا - جگہ جگہ مولانا فضل حق اور مولانا ابوالکلام آزاد کا خواہ مخواہ موازنہ کرنا - اہم اور قابل ذکر باتوں مثلاً ارباب سوانح کے علمی امتیازات وخصوصیات پر سرسری کلام کرنا اور گھریلو زندگی کے غیر اہم واقعات کا مفصل تذکرہ کرنا - پھر موقع بے موقع اپنے سیاسی افکار وخیالات کا جذباتی رنگ میں اس طرح بیان کرنا جس سے دوسروں کی تنقیص اور اپنی مدح کا پہلو نکلتا ہو - تاہم مجموعی اعتبار سے کتاب پُراز معلومات - دلچسپ اور مفید ہے اور اس کے مطالعہ سے گذشتہ ایک سو برس کے مسلمانان ہند کے جو تہذیبی - علمی ادبی کارنامے اور ملک ووطن کے لئے اُن کی عظیم کوششوں اور قربانیوں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے موجودہ حالات

میں مسلمانوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ ان میں شکست خوردگی اور کمتری کا جو احساس پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو! مذکورہ بالا چند خامیوں سے قطع نظر نوجوان مصنف اس قابل قدر کوشش اور محنت وقابلیت پر ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں -

نمونۃ المعرب | از پروفیسر سیف بن حسینی القطیعی و پروفیسر احمد بن ناصر العسیری استاذ عربی عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن -

عربی زبان کے طلبا اور اساتذہ کے لئے مدت سے دو قسم کے لغات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی ایک عربی سے اردو میں اور دوسری اردو سے عربی میں پہلی نوع کی لغت کا کام ندوۃ المصنفین میں ہو رہا ہے اور ایک بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے - اگر ادارہ گذشتہ مصائب وحوادث سے دوچار نہ ہوتا تو غالباً اس کی کتابت شروع ہو گئی تھی خوشی کی بات ہے کہ "اردو عربی" لغت کا کام بھی حیدرآباد میں شروع ہو گیا ہے جو "المعرب" کے نام سے انجام دیا جا رہا ہے - ہمارے پاس اس کا ایک نمونہ جس میں - الف - ب - ج اور گ کے تقریباً دو سو الفاظ ہیں - اظہار رائے کے لئے آیا ہے - یہ کام چونکہ نہایت اہم اور ضروری - اور ہمارے ذوق کے مطابق ہے اس لئے ہم نے اس کو شوق اور توجہ سے از اول تا آخر دیکھا اگر پورے لغت کی ترتیب وتدوین اسی نہج پر ہوئی تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ لغت اردو زبان میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ ہوگا لغت کے دونوں مرتب عربی زبان کے بلند پایہ ادیب اور قدیم وجدید دونوں قسم کی زبانوں سے اچھی طرح با خبر اور محاورات وضرب الامثال - اور الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف نسلاً عرب ہیں - مگر غالباً حیدرآباد میں متوطن ہو گئے ہیں اور ایک ماہر زبان کی طرح اردو کے بھی فاضل ہیں اس بنا پر انھوں نے یہاں اردو زبان کے قدیم وجدید الفاظ ومحاورات کا استقصا کیا ہے ساتھ ہی ان کے

مقابلہ میں عربی زبان کے قدیم و جدید الفاظ و محاورات کے انتخاب میں بڑی وسعتِ نظر اور دیدۂ وری کا ثبوت دیا ہے علاوہ بریں الفاظ کی قسم یعنی اسم ہے یا صفت مذکر ہے یا مؤنث اردو کا لفظ ہندی ہے یا فارسی، مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد۔ ایک لفظ کے لئے عربی کے متعدد الفاظ تشریحی جملے۔ اگر کسی لفظ میں دو لغت ہیں مثلاً نہانے کے لئے اشنان بھی بولتے ہیں اور الف ممدودہ کے ساتھ آشنان بھی تو مصنفین نے دونوں لغت اپنے اپنے محل پر لکھے ہیں پھر تصویروں کے ذریعہ لغات کی تسہیل و تمثیل۔ غرض کہ اس لغت کی یہ سب خصوصیات بہت زیادہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لغت کے دونوں مرتبوں کو ہمت و استقلال کے ساتھ اس کی تکمیل باحسن وجوہ کی توفیق ارزاں فرمانے اور یہ جلد مکمل ہو کر اربابِ ذوق کی تسکین وتشفی کا سامان بنے جو حضرات اس کو خریدنا چاہتے ہیں، اگر وہ ابھی سے اپنے آرڈر بک کرادیں تو ناشرین کی حوصلہ افزائی ہوگی اور ان کو کتاب کے حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس سلسلہ میں خط وکتابت اس پتہ پر کرنی چاہئے :۔

دفتر المعرب۔ معرفت پروفیسر احمد بن ناصر العسیری۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن"۔

محی الملۃ والدین | از مولوی عون احمد صاحب قادری تقطیع کلاں ضخامت ۴۲۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ مولوی محبوب عالم صاحب خانقاہِ مجیبی پھلواری شریف ضلع پٹنہ

مولانا الحاج شاہ محمد محی الدین صاحب قادری پھلواڑی رحمۃ اللہ علیہ مشہور خانقاہ پیر مجیب کے سجادہ نشین اور صوبہ بہار کے دوسرے امیر شریعت تھے اس منصب رفیع پر سرفراز ہونے کے لئے جن کمالاتِ ظاہری و باطنی کی ضرورت ہے وہ حضرت مرحوم میں بدرجۂ اتم

پائے جاتے تھے۔ وہ ایک طرف علومِ دینیہ کے فاضلِ اجل تھے تو دوسری جانب طریقت و معرفت کے اوصافِ روحانی کے جامع اخلاق و شمائل اور عادات و خصائل میں سلفِ کرام کا نمونہ اور سیرت و کردار میں ورع و تقوے کا پیکر تھے ۲۲ را پریل ۱۹۴۲ء کی صبح کو آپ نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کے فیض یافتہ اور داماد مولوی عون احمد صاحب قادری نے یہ کتاب شائع کی ہے جس میں آپ کی زندگی کے حالات اور علمی و عملی کارنامے تفصیل سے بیان کئے ہیں افسوس ہے خاطر خواہ مواد کے میسر نہ آنے کے باعث بعض ابواب جو تفصیل طلب تھے تشنہ رہ گئے ہیں۔ تاہم جو کچھ لکھا گیا ہے بصیرت اور عبرت کا سبق دینے کے لئے کافی ہے اور یوں بھی ایسے بزرگانِ کرام کے حالات و سوانح کا مطالعہ روح میں گرمی اور دل میں ایمان و ایقان کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ پھر جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھ کر کتاب کو چار چاند لگا دئے ہیں مولانا نے بہار کی اجمالی تاریخ کے سلسلہ میں بعض بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں اور بعض تاریخی حقایق کے سلسلہ میں عجیب نکتہ آفرینی کی ہے جن سے مولانا کی وسعتِ مطالعہ اور غیر معمولی ذہانت و جدت آفرینی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ مقدمہ ایک مستقل مفید و دلچسپ اور پُر از معلومات مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے مسلمانوں کو موجودہ دورِ انتشار و پراگندہ خاطری میں ایسی کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ ان میں انابت الی اللہ، استقلال و پامردی۔ اور ہمت و دلجمعی پیدا ہو اور انھیں معلوم ہو کہ ان کے بزرگ حوادث و مصائب کے سیلاب میں کس طرح اخلاقِ فاضلہ کی چٹان بنے کھڑے رہتے تھے۔

ندوۃ المصنفین کی جدید کتاب

"مسلمانوں کا نظم مملکت"

مسلمانوں کا نظم حکومت و مملکت تاریخ کا صدر درجہ اہم اور معرکہ خیز موضوع ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس مہتم بالشان عنوان پر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی تھی جس کا قالب وقت کے تقاضوں کے مطابق ہو، مصر کے مشہور فاضل اور علوم قدیمہ وجدیدہ کے ماہر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔ اے، پی، ایچ ڈی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کر دیا موصوف کی تالیف "النظم الاسلامیہ" ترتیب کی خوبی، انداز بیان کی دلپذیری اور اختصار و جامعیت کے لحاظ سے بے مثل ہے مسلمانوں کا نظم مملکت اس کتاب کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے جس میں اصل کی تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کو اسی شان سے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مقدمہ کے علاوہ کتاب کو پانچ بابوں پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب کا عنوان "سیاسی نظام" ہے اس باب میں خلافت، وزارت، کتابت (محکمۂ امور خارجہ) حجابت دفتر حضوری کی حقیقت اور ان کے مختلف دوروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، دوسرے باب کا عنوان "نظام حکومت" ہے۔

اس عنوان کے تحت، شہری نظام، دفاتر، فوج، بحری نظام، ڈاک، پولیس ان تمام شعبوں پر تفصیلی اور بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے، تیسرا باب "نظام مالیات" پر مشتمل ہے اس میں بیت المال اور اس کے تمام شعبوں کا مکمل ذکر ہے، چوتھا باب "نظام عدالت" کے بیان میں ہے جس میں نظام عدالت کے تمام دوروں اور اس نظام کے تمام شعبوں کو زیر بحث لایا گیا ہے آخری باب نظام حکومت [illegible] اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظم مملکت کی صاف صاف تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس مضمون کے بعض نہایت ہی اہم پہلو تحقیق کی روشنی میں آجاتے ہیں۔ قیمت غیر مجلد چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

سنہ ۴۳ء:- مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول لغت قرآن پر بے مثل کتاب [illegible] مجلد [illegible]

سرمایہ:- کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ و رفتہ ترجمہ جدید اڈیشن۔ قیمت [illegible]

اسلام کا نظام حکومت۔ اسلام کے ضابطہ حکومت کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت بنی امیہ:- تاریخ ملت کا تیسرا حصہ قیمت [illegible] مجلد [illegible] مضبوط اور عمدہ جلد [illegible]

سنہ ۱۹۴۴ء:- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت [illegible] مجلد [illegible]

نظام تعلیم و تربیت جلد ثانی جسمیں تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قطب الدین ایبک کے وقت سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت [illegible] مجلد [illegible]

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد ثانی قیمت [illegible] مجلد [illegible]

سنہ ۱۹۴۵ء:- قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان قیمت [illegible] مجلد [illegible]

انقلاب روس۔ انقلاب روس پر بلند پایہ تاریخی کتاب قیمت [illegible]

سنہ ۴۶ء:- ترجمان السنۃ:- ارشادات نبویؐ کا جامع اور مستند ذخیرہ صفحات ۴۰۰ تقطیع ۲۲×۲۹ جلد اول [illegible] مجلد [illegible]

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی محققانہ کتاب "النظم الاسلامیۃ" کا ترجمہ۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تحفۃ النظار:- یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تحقیق و تنقید از مترجم قیمت [illegible] قسم اعلیٰ [illegible]

مارشل ٹیٹو۔ یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر نتیجہ خیز اور دلچسپ تاریخی کتاب قیمت [illegible]

مفصل فہرست دفتر سے طلب فرمائیے۔ جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱- محسن خاص ۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲- محسنین :- جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳- معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴- احبا :- نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا انکو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دیجائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبا کیلئے ہے

قواعد

۱- برہان ہر انگریزی مہینے کی یکم تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔

۲- مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں

۳- باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں انکی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

۴- جواب طلب امور کے لئے ۲ر ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵- قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے۔ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

۶- منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا